WWW.PAKSOCIETY.COM

شازیہ چودھری

رنگوں کا دستہ

ناولٹ

سائرہ خالہ، جگ جگ جئیں، اللہ آپ کا حج قبول کرے، مگر آپ کو بھی میرے ماسٹرز کے امتحانات ختم ہونے کے بعد ہی جانا تھا، سوچا تھا کیا اور یہ کیا ہو گیا، لمبی نیندیں، میوزک، ویڈیو کیسٹس، کزنز کے ساتھ موج میلے، اپنے دن اور اپنی راتیں، ہائے حسرتا کہ سب خواب چکنا چور ہو گئے۔"

لباس تبدیل کرنے کے بعد بال سنوارنے کا مرحلہ طے کرتی ہوئی زویا نے بڑی رقت آمیز کوفت کے ساتھ سوچا۔

"زویا، بھئی آجاؤ نیچے اب، ورنہ دیر ہو جائے گی، اسکول ساڑھے آٹھ بجے لگتا ہے۔"

امی کی پکار پر وہ افراتفری کے عالم میں برش رکھ کر دوپٹہ کاندھوں پر اچھی طرح پھیلا کر "کھٹ کھٹ" سیڑھیاں طے کرتی ڈائننگ ٹیبل کی طرف لپکی۔

"امی میں جاؤں گی کیسے، گاڑی تو ہے نہیں۔" سلائس کترتے ہوئے اس نے خاصے بیزار کن انداز میں دریافت کیا، گاڑی پرسوں شہزاد لے گیا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کا پروگرام تھا۔

"ارے دو قدم پر تو ہے اسکول، پیدل چلی جاؤ، واک بھی ہو جائے گی۔" بیلا نے اپنی طرف سے جیسے چٹکی بجاتے ہوئے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

مگر اس کے گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"میں پندرہ منٹ کا پیدل مارچ کروں، وہ بھی اتنی صبح صبح اور تنہا، بھلا مجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"خفا کیوں ہوتی ہو، چلو بیلا تم چلی جاؤ اس کے ساتھ۔" امی نے مصالحت آمیز انداز اختیار کیا، آخر کیوں نہ کرتیں، وہ انہی کی فرمائش اور خواہش پر تو تیار ہوئی تھی۔

سائرہ خاتون سے ان کی دور پرے کی رشتہ داری تھی، وہ اپنے خاوند کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی ہائی اسکول چلا رہی تھیں، خوش قسمتی یہ ہوئی کہ حج پالیسی کے تحت اس دفعہ قرعہ ان کے نام نکل آیا، دونوں میاں بیوی نے جھٹ پٹ سامان باندھ لیا، اتفاق سے اس دن زویا کا ایم اے کا آخری پیپر تھا جب سائرہ خالہ ان کے گھر آئیں۔

"ماشاء اللہ ہماری بچی امتحانات سے فارغ ہو گئی ہے، مجھے اسی بات کا انتظار تھا، ویسے تو اسکول کی ایڈمنسٹریشن کو میں نے اچھی طرح گائیڈ کر دیا ہے، سب اپنی اپنی ذمہ داری انجام دیتے رہیں گے مگر پھر بھی میرا اور شفاعت کا خیال ہے کہ کسی اپنے کو ضرور نگراں ہونا چاہیے، اگر زویا ہماری غیر موجودگی کے دوران اسکول میں پڑھانا اور معمول کے انتظامات کی نگرانی کا کام سنبھال لے تو مجھے ازحد خوشی ہو گی۔"

"بھئی کیوں نہیں، بلکہ اچھا ہے اس کو بھی مصروفیت مل جائے گی اور ساتھ میں پڑھانے کا تجربہ بھی ہو جائے گا۔" امی نے سائرہ خالہ کی امید بھری نظروں کے جواب میں فٹ سے ہامی بھر لی تھی۔

اور یوں اسے مانتے ہی بن پڑی۔

"واہ، میں کیسے جا سکتی ہوں، میرا تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" بیلا نے صاف انکار کر دیا، وہ آج کل بی اے فائنل کے پیپرز کی تیاریوں میں جتی ہوئی تھی۔

"اسامہ بھائی کو فون کر دو، وہ چھوڑ دیں گے۔" بیلا

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے ایک شرارتی سی نگاہ اپنی پیاری سی معصوم سی بہن کے چہرے پر ڈال کر کہا۔

"ہاں ویسے اس کا راستہ بھی یہی ہے' ادھر سے گزر کر ہاسپٹل جاتا ہے۔" امی بھی بیلا کی تجویز سے متفق ہو گئیں مگر اس کو عجیب سی جھجک مانع تھی۔

"ارے نہیں' رہنے دیں' اتنی سی بات کے لیے زحمت دینا۔"

"زحمت کی کیا بات ہے ان کا روٹ بھی یہی

تھی۔" بیلا بہن کی حجاب آگیں گھبراہٹ سے لطف لے رہی تھی۔

"نہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی' واک کر کے۔" وہ کچھ زیادہ ہی بوکھلا گئی تھی۔

"تو' با' شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

ادھر شرم مائل' ادھر خوف مانع
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں'

امی کے کچن روانہ ہوتے ہی گویا بیلا کی زبان بھی



Aneela PakistaniPoint

WWW.PAKSOCIETY.COM

رواں ہو گئی۔

"سوچتی ہوں کیسے گزرے گی تم دونوں کی" ان کی پلکیں بھی رخساروں پر سجدہ ریز رہتی ہیں اور ادھر گھبراہٹ کے مارے تمہارا تو یہ حال ہوتا ہے کہ پورا سراپا ہی جیسے سجدہ ریز ہو جاتا ہے' کیسے میاں بیوی ہو یار تم لوگ۔"

بیلا کو جیسے ازحد افسوس ہوا تھا۔

"ابھی ہم میاں بیوی کہاں ہیں۔" زویا نے جھینپ کر خفگی سے اسے گھورا۔

"ناکح اور منکوحہ تو ہو ناں' بھئی جب نکاح ہو گیا تو میاں بیوی بھی بن گئے' بس رخصتی ہی تو باقی ہے' ہاں یہ کہہ سکتی ہو کہ ابھی "عملاً" میاں بیوی نہیں بنے۔" بیلا کے ذومعنی انداز میں بلا کی شرارت تھی۔

وہ بے ساختہ سرخ ہو گئی۔

"بدتمیز' شرم تو نہیں آتی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ اسے مارنے کے ارادے سے اونچا کیا۔

"ویسے یار آپس کی بات ہے' تم دونوں کا رویہ مجھے خاصا مشکوک لگتا ہے' عجیب کترائے کترائے رہتے ہو ایک دوسرے سے' وہ تو خیر شروع سے ہی سنجیدہ اور خشک مزاج بڑھا کو ٹائپ بندے ہیں پھر رہی سہی کسر سائیکاٹرسٹ بن کر پوری کر دی' عمر کے اعتبار سے میچور ہو چکے ہیں اب رومانٹیزم کہاں سے آئے گا ان کی حرکات و سکنات میں' مگر تم بھی کمال ہی کر دیتی ہو' اس طرح ان سے کٹی کٹی گھبرائی بوکھلائی رہتی ہو جیسے قرض دار قرض خواہ سے کنی کتراتا ہے' کہیں وہ والا معاملہ تو نہیں ہے بقول شاعر کہ۔

ادھر یہ زعم محبت کی بھیک ہم مانگیں
ادھر یہ ضد کہ تقاضا میرا اصول نہیں"

"کیا ہے بھئی' اب لپیٹو اپنے یہ "اردو دانی" کے مظاہرے۔"

وہ موضوع سے بچنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے مجھے "لٹریچر فوبیا" ہو گیا ہے زویا جانی۔" بیلا نے سرد آہ بھری۔

"میری عقل آخر کہاں چلی گئی تھی' اس وقت جب میں نے بی اے میں اردو لٹریچر رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔" "گمان اغلب ہے کہ گھاس چرنے۔" اس کے سوچ وبچار سے پُر سوال کے جواب میں زویا نے اپنا دوپٹہ اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

"اچھا میں جا رہی ہوں۔" اس کا رخ بھلائی دروازے کی سمت تھا۔

"کیا اسامہ بھائی کے ساتھ۔" بیلا باز نہ رہ سکی۔ زویا نے مڑ کر اسے گھورا تو فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جی جان سے کتاب پر جھک گئی۔

زویا خفیف سی بے ساختہ ابھر آنے والی مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتی واپس پلٹ گئی۔

"پیدل جا رہی ہو اسکول بیٹے۔" لان چیئر پر بیٹھے تسبیح کے دانے گھماتے دادا جی نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"جی دادا جی۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے بیٹا۔" دادا جی نے خوش ہو کر سر ہلایا۔

"پیدل چلنا صحت کی علامت ہے' میں تو کہتا ہوں سب سے بہتر ورزش چہل قدمی ہے' نظام ہضم اور نظام تنفس بھی درست رہتا ہے اور جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں میں بھی نکھار پیدا ہو جاتا ہے' نماز پڑھی تھی ناں بیٹا۔"

آخر میں دادا جی نے اپنا مخصوص سوال دہرایا جو کم و بیش ہر ایک سے اور کسی بھی وقت کرنے کے عادی تھے۔

"جی دادا جی۔" اس نے ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"البتہ بیلا نے کل عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی' آپ اسے ڈانٹیے گا۔"

اس کو یکدم شرارت سوجھ گئی۔

"ضرور ڈانٹوں گا۔" دادا جی نے اسے مایوس نہیں کیا" "نماز ضرور پڑھنی چاہیے بیٹے' یہ انسان کو ذہنی اور روحانی سکون عطا کرتی ہے' دل کا قرار اور ذات کے نکھار کا باعث ہے' دیکھو چند ا کوئی اعلیٰ شخصیت جب بلائے تو ہم کیسے دوڑے دوڑے فخر و غرور میں ڈوبے

www.paksociety.com

اس کے ایک بلاوے پر ہزار جان سے جانے کو تیار رہتے ہیں۔

ملک کا صدر ہمیں ملاقات کی دعوت دے تو شاید خوشی سے ہم پاگل ہی ہو جائیں ایک ایک کو پکڑ کر بتاتے پھریں کے کہ ہمیں معزز صدر نے اپنے پاس بلایا ہے' جبکہ خداوند تعالیٰ کی بزرگ و برتر ہستی ہمیں دن میں پانچ مرتبہ ملاقات کی دعوت دیتی ہے کہ آؤ میری طرف' میں تمہیں بھلائی اور فلاح کا راستہ بتاؤں' مجھ سے اگر طلب کرو' میں تمہیں عافیت دوں گا' تمہارے من کی مراد پوری کروں گا۔

جب ہم نماز نہیں پڑھتے تو اس کا مطلب تو یہ ہوا ناں کہ خدانخواستہ ہم اپنے پیارے اللہ عزوجل سے ملاقات کرنا' میرے منہ میں خاک پسند نہیں کرتے۔"

دادا جی بڑے نرم دھیمے سحر انگیز انداز میں بول رہے تھے' زوبیا متاثر ہو کر چپ چاپ ان کی بصیرت افروز باتیں سنتی رہی۔

"اب جاؤ تم اپنے مقصد کے لیے روانہ ہو جاؤ' اللہ تمہیں کامیاب کرے' علم کی شمع سے اپنا دل و دماغ منور کرنے کے بعد یہ روشنی دوسروں میں پھیلانا بڑے ثواب کا کام ہوتا ہے' علم پیغمبروں کی میراث ہے' جیسا کہ اسلام کہتا ہے' تم میں سے بہتر وہ ہے جو علم سیکھے اور سکھائے۔"

دادا جی نے بہت ساری پر شفیق دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا' دادا جی کی باتیں اس کے قلب و نظر کی سیاہیاں دھو رہی تھیں' دل ہی دل میں وہ اپنے "سابقہ" خیالات پر شرمندہ ہو گئی۔

سائرہ خالہ نے جانے سے پہلے اس کو اسکول کی انتظامیہ سے ملوا دیا تھا' کام وغیرہ بھی بتا دیا تھا' سو کوئی خاص مشکل نہ ہوئی' اس نے کلاس سکس (6th) کے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری لی۔

"بیگم چھوٹی کلاس نہیں لوں گی' سارا دن ان کے فیڈر' ٹی باکس اور بیگ سنبھالتے رہو۔" اس نے پہلے ہی سائرہ خالہ سے کہہ دیا تھا۔

"مس میرے پچاس روپے کسی نے میرے بیگ سے نکل لیے ہیں' اسنو وائٹس فنڈ کے لیے لائی تھی میں۔" چوتھے پیریڈ میں فائزہ نے روہانسی ہو کر اطلاع بہم پہنچائی تھی۔

"کہاں گئے بھئی' اسد تم چیک کرو سب بچوں کے بیگ۔" اس نے کلاس مانیٹر کی ڈیوٹی لگا دی' پوری کلاس میں پچاس روپے کی ڈھونڈ مچ گئی' بالآخر وہ شیراز کے بیگ کی جیب سے برآمد ہوئے۔

"آپ نے فائزہ کے پیسے کیوں چرائے؟" اسد کی رپورٹ پر زوبیا نے شیراز کو اپنے پاس بلا کر سختی سے سوال کیا۔ "آپ اتنے بڑے ہو گئے ہیں آپ کو کسی نے نہیں بتایا کہ چوری کرنا بری بات ہے۔"

"نہیں۔"

"ہائیں۔" اس کے بڑے آرام سے جواب دینے پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا' شیراز کے چہرے پر دور دور تک شرمندگی اور ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا' وہ بڑے مزے سے چیونگم چباتا لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا' زوبیا کو غصہ آ گیا۔

"کیا مطلب' بڑوں سے اس طرح بات کرتے ہیں۔" وہ غصے میں آ گئی۔

"مس مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ بڑوں سے کیسے بات کرتے ہیں' ریئلی۔" شیراز کا انداز اب بھی وہی تھا' لاپروا' بے نیاز' زچ کرنے والا طیش دلانے والا۔

"آپ نہایت بدتمیز ہیں۔" وہ اس پر گرم ہونے لگی۔

"آپ مجھے دونوں باتوں پر سزا دے دیں' یہ لیجیے اسٹک' میں ہوں جو بدتمیز۔"

"ہائیں۔" وہ ششدر سی رہ گئی' شیراز نے جیسے معمول کے سے انداز میں چھڑی اس کی سمت بڑھا کر سر جھکا لیا تھا۔

"جائیں اپنی سیٹ پر۔" اسے اپنا غصہ ضبط کرنا پڑا۔ "مگر آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا' فائزہ سے سوری بھی کریں۔"

"سوری۔" اس کے کہنے پر شیراز نے طوہاً و کرہاً فائزہ کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے بمشکل "سوری" کہہ کر جان چھڑائی اور سر جھٹک کر

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

زویا نے محسوس کیا کلاس اس سے خائف سی تھی، وہ الگ تھلگ بیٹھا تھا، تیوریاں چڑھائے آنکھوں میں بیزاری لیے ایک ایک کو حقیر سے دیکھتا ہوا ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بد دلی سے بیٹھا تھا، کلاس مانیٹر اسد بھی شیراز کے تحکم آمیز انداز اور اکھڑ رویے کی بدولت دوسروں کی نسبت اس سے بات منوانے میں خاصی نرمی سے کام لیتا تھا، غالباً "اپنی عزت اپنے ہاتھ" کے اصول کے پیش نظر کوئی بھی اس سے ٹکر لے کر اپنی شامت بلانے کا شوقین نہیں تھا۔

"ایک صاحب اپنے بچے کے ایڈمیشن کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

ساتویں پیریڈ میں انتظامیہ کی انچارج مس کوثر نے اسے اطلاع دی، اسکول کی پرنسپل کی "قائم مقام" ہونے کے ناتے یہ معاملات اسے ہی دیکھنے تھے، سو وہ بچوں کو کلاس ورک دے کر اسد کو ڈائس کے پاس آکر سب بچوں کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری سونپ کر مس کوثر کے ہمراہ چلی آئی۔

جب واپس آئی تو فائزہ کو دھواں دھار روتے ہوئے پایا۔

"کیا ہو گیا بھئی۔" اسے پریشانی کے ساتھ ساتھ کوفت اور بیزاری بھی ہوئی۔

"کس نے مارا ہے اسے؟۔" اس کے دوبارہ بولنے پر بھی کلاس خاموش رہی، البتہ آپس میں دبی دبی سرگوشیاں ضرور ابھرنے لگیں۔

"بتاتے کیوں نہیں۔" اس کی جھنجلاہٹ خفگی میں بدل گئی۔

"آپ بتائیں اسد، فائزہ کو کس نے مارا ہے۔" فائزہ کے لال لال ٹماٹر ہوتے گالوں پر رواں آنسو پونچھتے ہوئے وہ تحکم آمیز لہجے میں اسد سے استفسار کرنے لگی۔

"مس۔۔۔ وہ۔۔۔" اسد نے خاصی ہچکچاہٹ اور دشواری کے بعد خود کو بولنے پر آمادہ کیا "وہ۔۔۔ شیراز نے۔" چور نگاہ شیراز کے بھبھوکا چہرے پر ڈالتے ہوئے بالآخر وہ کہہ گیا۔

"شیراز یہ کیا حرکت ہے؟۔" وہ غصے سے چیخ پڑی۔ "ادھر آئیں ذرا آپ، آپ نے فائزہ کو کیوں مارا؟"

"شاید بدلہ لینے کے لیے۔" اسد دبے لفظوں میں کہہ گیا، جواب میں شیراز خونخوار نظروں سے اسے گھورتا ہوا ہونٹ چبانے لگا، زویا سے اس بار اپنا غصہ ضبط نہیں ہوا، کھینچ کر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

"آپ کو شرم نہیں آتی، ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری، آئندہ اگر آپ نے میری کلاس میں بدتمیزی کی تو بہت بری طرح پیش آؤں گی۔"

سرخ تمتماتا چہرہ لے کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے شیراز نے ایک تپتی ہوئی نظر اسد پر ڈالی جو اس بات کی صاف غمازی کر رہی تھی کہ۔

"دیکھ لوں گا بچو تمہیں، میری شکایت کر کے تم نے میری انسلٹ کروائی اب اپنی خیر مناؤ۔"

اور اگلے دن اس کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا زویا نے کلاس کو میتھس کی ایکسرسائز ہوم ورک کے طور پر دی تھی، اگلے دن تیسرے پیریڈ میں کاپیاں چیک کرنی شروع کیں تو ان میں اسد کی کاپی موجود نہیں تھی۔

"آپ نے کاپی نہیں دی اسد۔" اس نے استفہامی نظروں سے اسد کو دیکھا وہ بہت ذمہ دار اور ذہین بچہ تھا اس سے لاپرواہی اور غفلت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

"مس وہ۔۔۔!" اسد کا چہرہ پریشانی اور تاسف کا اشتہار بنا ہوا تھا "میں نے ہوم ورک کیا تھا کسی نے میری کاپی بیگ سے نکال کر وہ صفحات پھاڑ دیے جن پر ایکسرسائز کی تھی۔"

"مس یہ جھوٹ بول رہا ہے، سزا سے بچنے کے لیے بہانہ بنا لیا ہے۔" ایک ہاتھ اپنے اسٹائلش بالوں میں پھیرتے ہوئے ڈیسک پر کہنی ٹکاتے ہوئے شیراز نے جیسے بڑے محظوظ ہونے والے انداز میں کمنٹ پاس کیا۔

"مس آپ میری کاپی چیک کر سکتی ہیں۔" غم و غصے سے اسد کا برا حال ہو گیا، زویا نے اس کی کاپی چیک کی کسی نے بڑی صفائی سے صفحے اڑائے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بہت بری بات ہے' کس نے یہ کام کیا ہے۔"

یہ کام یقیناً کوئی منتقم اور کینہ پرور شخص ہی کر سکتا تھا' مگر اسد کو تو سب پسند کرتے تھے' اس کی ذہانت' شائستگی اور ہمدردانہ فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے کلاس نے اسے اپنا مانیٹر منتخب کیا تھا۔

"اسد آپ کو کس پر شک ہے کھل کر بتائیں مجھے۔"

زویا کے سوال پر پوری کلاس سمیت اسد کی نگاہیں لاپرواہی سے چیونگم چباتے شیراز کی سمت اٹھ گئیں' تاہم اسد نے کسی پر الزام عائد نہیں کیا۔

"مس میں کچھ کہہ نہیں سکتا' میں دوبارہ ایکسرسائز کرلوں گا۔"

"بزدل اتنی ہمت ہے تو بتادو ناں۔" شیراز نے طنزاً جیسے للکار کر کہا۔

"اس طرح اپنے ساتھیوں کو مخاطب نہیں کرتے۔" زویا نے تنبیہی نظروں سے شیراز کو دیکھا' جواب میں وہ یوں بے نیاز بن گیا جیسے اسے نہیں اس کے فرشتوں کو مخاطب کیا گیا ہو' زویا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"چچ... بے چارا... بونگا... بزدل' بے وقوف..." شیراز ایک سیریز میں کہتا ہوا پینٹ کی جیب سے تڑے مڑے کاپی کے صفحات نکال رہا تھا۔

"مجھے پہلے ہی تم پر شبہ تھا' اتنی بے ہودہ حرکت تمہارے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔"

اسد ایک تلملاتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر استہزائیہ انداز میں بولا' غم و غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں مگر وہ فطرتاً اصلح جو اور امن پسند لڑکا تھا اس لیے غضبناک نہیں ہوا۔

"بکواس بند کرو تم ہوگے بے ہودہ۔" اس نے دانت پیستے ہوئے اسد کو گریبان سے پکڑ لیا اور طیش میں آکر جھنجھوڑنے لگا۔

"دیکھو شیراز شرافت سے میرا گریبان چھوڑ دو' ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

اسد ہنوز ضبط سے کام لے رہا تھا۔

"اچھا" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔ "کیا کرلوگے تم میرا ہاں' بولو کیا کرلوگے۔"

"میں تمہاری شکایت مس سے کروں گا' وہ تمہارے پیرنٹس کو بتائیں گی اور اس طرح تمہیں اسکول سے ایکسپل بھی کیا جاسکتا ہے۔"

جواب میں وہ قہقہہ مار کر ہنستا چلا گیا۔

"بہت خوب" وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہا تھا۔

"ارے یہ تو میرے لیے معمول کی بات ہوگی جب میں کینڈر گارٹن میں تھا تب بھی دو دفعہ نکالا گیا تھا' ففتھ (5th) تک جس اسکول میں پڑھا ہے اس کے پرنسپل نے بھی بارہا مجھے اسکول سے خارج کرنے کی دھمکی دی تھی' اور ایک دفعہ تو لیٹر بھی بنوالیا' تب ماما نے مجھ پچھلے سال یہاں ایڈمٹ کرایا' اچھا چلو تم بھی کیا یاد کروگے اب آؤ تمہیں ایک تماشا دکھاتا ہوں۔"

شیراز نے ایک جھٹکا دے کر اسد کا گریبان چھوڑ دیا' پھر پینٹ کی جیب سے لائٹر نکالا' کاپی سے پھاڑے گئے صفحات کو زمین پر رکھا اور انہیں آگ دکھادی۔

کاغذ دھڑا دھڑ جلنے لگے' شیراز پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا اسد حسرت و ملال کے عالم میں اپنی رات بھر کی محنت کو شعلوں کی نذر ہوتے دیکھ رہا تھا' پوری کلاس دم سادھے دونوں کے درمیان ہونے والی لڑائی دیکھ رہی تھی۔

زویا کسی کام سے باہر گئی تھی اور کچھ فاصلے پر اسد اور شیراز کے درمیان ہونے والی کھینچا تانی کی وجہ جاننے کو چند ساعت رک گئی تھی آگ لگتے دیکھتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے ادھر لپکی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ ایک ثانیے کو تو دہل ہی گئی تھی' چھوٹے سے بمشکل گیارہ بارہ برس کے بچے کی ذات کا یہ انتقامی رخ صحیح معنوں میں اسے سراسیمہ کر گیا۔

اس نے تیزی سے ایک بچے سے پانی کا فلاسک لے کر آگ پر ڈالا' خدانخواستہ یہ آگ بھڑک کر بچوں کے بستوں' چیئرز اور دیگر فرنیچر کو بھی لگ سکتی تھی۔

"ادھر آؤ شیراز کس قدر خود سر' سرکش اور گستاخ بچے ہو۔"

اس کی نافرمانی اور جارحانہ رویے نے زویا کو چراغ پا

کردیا' چھڑی لے کر اچھی خاصی پٹائی کردی' مگر وہ اللہ کا بندہ بے حس و حرکت کھڑا مار کھاتا رہا' اس کے چہرے پر سکون ہی سکون بکھرا تھا۔

زویا بری طرح عاجز آگئی' یہ واحد بچہ تھا جس نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا' اس کا ہر عمل اشتعال دلانے اور جلانے ستانے والا ہوتا تھا۔

"مس کوثر آپ اس بچے کے گھر کا ایڈریس نوٹ کریں اور اس کے والد صاحب کے نام لیٹر لکھیں' انہیں بتائیں کہ اپنے بچے کی "کارکردگی" کی جواب دہی کے لیے فوری طور پر رابطہ کریں' بصورت دیگر اسکول کی انتظامیہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے اور معاملہ نمٹانے میں آزاد ہوگی' ایسے بچے ادارے کے امن و عامہ کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں' ایک طالب علم کے غیر معیاری اور ناپسندیدہ تخریبی رویے کی بدولت پورے اسکول کا ماحول متاثر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔"

زویا اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہوگئی تھی' اس کے آگ لگانے جیسے خطرناک تخریبی اور متشددانہ جارحانہ اقدام نے اسے اندر ہی اندر خوفزدہ کر ڈالا تھا۔ اس طرح تو وہ اسکول کے کسی بھی بچے کو ٹارچر کر سکتا تھا' وہ اس بارے میں بہت متردد تھی۔

شیراز کے اتنے گستاخ' ضدی اور جارحانہ رویے کی کوئی وجہ ضرور تھی اور اس کی بابت اس کے والدین ہی بہتر روشنی ڈال سکتے تھے۔

--*

"تم نے تو اسکول کو اپنے سر پر ہی سوار کر لیا ہے' کہاں تو ایک دن جانا محال لگ رہا تھا اور کہاں یہ کہ گھر میں بھی بقول شاعر۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے بغیر

والی صورتحال ہوتی جارہی ہے۔"

وہ بیلا کے ساتھ اسکول کے دیگر معاملات کے ساتھ ساتھ بڑی تفصیل سے شیراز کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بھی سیر حاصل تبادلہ خیال کر رہی تھی جب کہ اس کا پیمانہ ضبط چھلک اٹھا۔

"اس سے تو بہتر ہے تم اسامہ بھائی کے ساتھ اس بچے کی رہنمائی کس طرح کریں۔"

بیلا نے بڑا صائب مشورہ دیا۔ "ان کا تو سبجیکٹ بھی ہے' ہم سے کیا پوچھتی ہو' ہم لٹریچر والے کیا علاج درد جگر و سوز قلب تشخیص یا تجویز کر سکتے ہیں سوائے یہ کہنے کہ۔

تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم
دنیا کو چھوڑ جائیں نہ کہیں بے بسی سے ہم

یا پھر با آواز بلند یہ پکارنے لگیں کہ۔

اے چارہ ساز کوشش مرہم فضول ہے"

"خدا کا واسطہ ہے بیلا چپ ہو جاؤ اب' لگتا ہے ہم سے کوئی عظیم گناہ ہی ہوا ہوگا جس کی پاداش میں تمہارا دل اردو لٹریچر رکھنے کی طرف مائل کر دیا گیا۔" زویا نے سر تھام لیا۔

"اسامہ بھائی آئے ہیں' امی کہہ رہی ہیں ان کی خاطر تواضع کے لیے کچھ بنا دیں۔"

اتنے میں شہزاد آدھی سیڑھیاں طے کر کے زور سے اطلاعی انداز میں بتاتا اسی رفتار سے واپس پلٹ گیا' گویا ٹرین چھوٹی جارہی ہو' اس کے دوست باہر اس کے انتظار میں تھے۔

"اوہ بھئی اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتا' ادھر انہیں یاد کیا ادھر وہ حاضر ہوگئے۔" بیلا نے ذو معنی انداز میں آنکھیں نچائیں۔

"یاد رہے' یاد میں نے نہیں تم نے کیا تھا۔؟" وہ خفیف سا مسکرا کر لباس کی شکنیں دور کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں جی۔" بیلا نے مصنوعی سرد آہ بھری "آپ کا دل تو چوبیس گھنٹے ان کے نام کی تسبیح کرتا رہتا ہے۔"

"اس وقت تو کھانے کا ٹائم ہے' جاؤ بیلا جا کر پوچھ آؤ ان سے' پتا نہیں ہاسپٹل سے آرہے ہیں یا گھر سے۔" اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ ڈالی' دوپہر کے تین بجے تھے۔

"جاؤ پوچھ لو ناں خود جا کر' وہ ادھر لان میں بیٹھے ہیں دادا جی اور امی کے پاس۔" پردے برابر کرتی بیلا نے نیچے جھانک کر جیسے اسے اطلاع پہنچائی۔

"مم' میں' جاؤں۔" وہ نجانے کیوں گھبرا سی گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں یار جاؤ تم پوچھ آؤ۔"

ہماری زندگی "واسطوں" کے ذریعے ہی رابطے رکھنا۔ "بیلا چچ مچ چپ ہو گئی۔

"تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے یہ کیا مین ایجرز کی طرح چوچلے کرتی رہتی ہو۔"

"بکواس نہیں کرو میں جان بوجھ کر تھوڑا کرتی ہوں۔" زویا بگڑی "بس یار مجھے عجیب سی جھجھک محسوس ہوتی ہے؟" اس کے چہرے پر الجھن لہرانے لگی۔

"یہ نہیں ہے کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔ ہمارے پھوپھو زاد ہیں بچپن سے دیکھے بھالے ہیں کوئی غیر تھوڑا ہیں یہ بھی نہیں کہ ان سے حد درجے خوف محسوس ہوتا ہے اچھے خاصے سوفٹ اسپوکن ہیں متحمل مزاج اور سادگی پسند ہیں۔"

"جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو پھر مسئلہ کیا ہے۔" بیلا نے حد درجہ استعجاب سے اسے دیکھا "کیوں اتنے زیادہ فاصلے ہیں تم دونوں کے بیچ؟ اور یار ایک بات بتاؤ یہ بے نام سے پر تکلف کتراتے ہوئے تعلقات خدانخواستہ آگے چل کر بہت سی پیچیدگیاں اور پریشانیاں بھی پیدا کر سکتے ہیں۔"

بیلا کا انداز متفکرانہ تھا "تمہیں سوچنا چاہیے اس بارے میں مصنوعی قسم کے حجابات و تکلفات اکثر بدگمانیاں دھڑکے اور اندیشے پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔"

بیلا کے پر تشویش انداز پر زویا نے چونک کر اسے دیکھا پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

"بیلا زویا بچو کدھر رہ گئیں۔" نیچے سے امی آوازیں دے رہی تھیں۔

*_*_*

"اسٹوپڈ" نان سینس تم سے دیکھ کر کام نہیں ہوتا۔" ربیعہ آپا کے دودھ کا گلاس گرا دینے پر وہ بری طرح بگولہ ہو رہا تھا۔

"شیری بابا آپ جو اچانک راستے میں آ گئے تھے۔" ربیعہ آپا نے ہچکچاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام سعی کی مگر ادھر جلال کا اپنا ہی ایک عالم تھا۔

"کتنی دفعہ تمہیں کہا ہے خوامخواہ بحث مت کیا کرو میرے ساتھ۔" اس کے چلانے پر آپا سچ مچ سہم گئی۔

"ٹھیک ہے شیری بابا میں دوسرا گلاس لے آتی ہوں۔"

"اب نہیں پینا ہم نے۔" وہ ایک شان سے تحکمانہ انداز میں کہتے ہوئے شاہانہ انداز میں صوفے میں دھنس کر ٹی وی کا چینل بدلنے لگا۔

"بیگم صاحب خفا ہوں گی آپ دودھ پی لیجیے۔" آپا بے چاری حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق مجبور تھیں۔

"یہ میرا ہیڈک نہیں ہے۔" شیراز کا انداز قطعی تھا اور لہجہ حد درجہ خشک اور بے رحم آپا نرچ سی گومگو کے عالم میں کھڑی بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا حساب تھا اس کے ساتھ۔

اسی لمحے سندیلہ ادھر چلی آئی۔

"شیری تم ابھی تک جاگ رہے ہو سوئے کیوں نہیں آپا بیلی کب سے رو رہی ہے۔"

"وہ جی میں شیری بابا کو دودھ دینے آئی تھی اسی دوران اٹھ گئی ہو گی بے بی میں ابھی دیکھتی ہوں۔"

"تم نے دودھ نہیں لیا کیا۔" سندیلہ نے بیزاری سے شیراز پر نگاہ ڈالی۔

"نہیں ماما دل نہیں چاہ رہا۔" شیراز نک سک سے درست سجی بنی حسن و دلکشی کے رنگوں میں ڈھلی نکھری سنوری ماں کو دیکھ کر جیسے ٹھنک کر بولا۔

"دل کیوں نہیں چاہ رہا۔" اب نگاہ کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی بیزاری جھلکنے لگی تھی۔

"دل تو یہ چاہتا ہے ماما کہ آپ مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ پلائیں پیار سے میرے ماتھے پر سے بال ہٹا کر ماتھا چوم کر سو جانے کی تلقین کریں میری شرارتوں پر پاپا سے پر لطف انداز میں شکایتیں کریں پھر جب پاپا مجھے ڈانٹیں تو ایک دم مجھے گلے سے لگا کر پاپا کو خفگی سے گھور کر کہیں "خبردار بھی میرے بچے کو کچھ مت کہیں یہ تو بہت اچھا بچہ ہے۔" اور پھر آپ اور پاپا دونوں مجھے محبتوں کی دولت سے مالا مال کرتے ہوئے اپنے مشفق

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

حصار میں محفوظ کرلیں جہاں سکون ہو، محبت بھری گرمی ہو، پیار ہو خوشیاں ہوں مگر میرے ایسے نصیب کہاں۔"

شیراز کی سوچیں جانے اسے کون کون سے خوش نظر خواب دکھا رہی تھیں کہ پیچھے سے پاپا کی مخصوص سرد و بیگانہ پر تکلف آواز نے جیسے اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹخا۔

"شیری کے اسکول سے لیٹر آیا ہے، آپ کل جانے کی زحمت کرلیں گی۔" وہ سندیلہ سے بے تاثر انداز میں دریافت کررہے تھے۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے، کل مما کے ہاں وقار بھائی کی ویڈنگ انیورسری سیلیبریٹ کی جارہی ہے، میں ادھر بزی ہوں گی۔" سندیلہ نے قدرے تنک کر جوابی کارروائی کے طور پر اپنے اونچے پورے بھرپور مردانہ دلکشی کے حامل شوہر پر اک چبھتی سلگتی ہوئی نگاہ ڈال کر جواب دیا۔ وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر مڑ گئے۔

"اوکے، پھر مجھے ہی زحمت کرنا ہوگی۔"

"تم یہاں کیا کررہے ہو، اب جاؤ جاکر سوؤ۔" سندیلہ نے جانے کس بات کا غصہ اس پر اتارا، وہ چپ چاپ ماں باپ کے درمیان ہونے والی معمول کی کارروائی سن رہا تھا، اماں کی پھٹکار سن کر بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا مصیبت ہے، کیوں چلا رہی ہو۔" آپا کے بازوؤں میں مچلتی، گلا پھاڑتی ڈھائی سالہ نیلی کو گود میں لیتے ہوئے سندیلہ اس معصوم پر جیسے برس ہی تو پڑی تھی۔

"لائیں ماما میں چپ کرادوں اسے۔" جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے پرشوق انداز میں بہن کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے۔

"جاؤ تم۔" سندیلہ نے بری طرح جھڑک دیا، "میرے بھگتان ہو تم، مجھے ہی بھگتانے ہیں اب جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے، جی تو چاہتا ہے کچھ کھا کے سو رہوں ایک ہی بار مرنا بہتر ہے روز روز کی خود سوزی سے۔" سندیلہ کا تلخیوں سے چور لہجہ شیراز کے معصوم دل کو عجب رنجیدگی اور پژمردگی کے دھوئیں میں دھکیلتا چلا گیا۔

"میرا کیا قصور ہے مجھے سب کیوں نظر انداز کرتے ہیں، مجھ سے کیوں اتنے اکھڑے اکھڑے کترائے اور گریزاں رہتے ہیں، میں نے تو کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑا، مجھے تو ماما پاپا دونوں سے محبت ہے، مگر دونوں ہی مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں مجھے ناپسند کرتے ہیں آخر کیوں۔۔۔؟"

شرمندگی اور دکھ سے بے حال وہ اذیت بھری سوچوں کے جال میں الجھتا اپنے کمرے میں آگیا، دروازہ بند کرکے اس نے ایک لمحے کو رک کر سوچا پھر سائیڈ ٹیبل پر سے کرسٹل کا نازک سا اسٹائلش گلدان اٹھایا دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایک ثانیے کو اس کا توازن پرکھا اور پھر پوری قوت سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر دے مارا ایک زوردار چھناکا ہوا اور کمرے میں ادھر ادھر شیشے کے ٹکڑے بکھرتے چلے گئے، دروازہ بند ہونے کی وجہ سے آواز دب سی گئی تھی، سو باہر سے کوئی ردعمل موصول نہیں ہوا۔

کچھ ساعت وہ فاتحانہ انداز میں قالین پر ادھر ادھر بکھرے شیشے کے ٹکڑوں کو گھورتا رہا پھر اطمینان سے نیچے بیٹھ کر انہیں چننے لگا، اس کوشش میں اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہوگئے قالین پر سرخ چمکدار خون کے قطرے جمتے چلے گئے مگر اس کو جیسے بے حسی کا دورہ پڑ چکا تھا، چہرے پر دور دور تک تکلیف کے کوئی آثار نمودار نہیں ہونے دیئے۔

--*

"ڈاکٹر صاحب ایک نظر میری طرف غور سے دیکھیے اور مجھے بتایئے مجھ میں کس شے کی کمی ہے، میرا بھرپور سراپا، میرے چہرے پہ سجا ایک ایک نقش اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ یہ پیکر حسن و دلکشی میں لاثانی ہے! آپ اپنی ایمانداری سے بتایئے کیا میرا ہوش ربا وجود مقابل کو دیوانہ بنانے کے لئے کافی نہیں۔"

وہ واقعی صحیح کہہ رہی تھی کوئی آنکھ کا اندھا ہی اس کے وجود کی فتنہ پرور دلربائی سے انکار کرسکتا تھا، بلاشبہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراپا قیامت تھی۔

"آج سے گیارہ برس قبل میری شادی ہوئی تھی جب میں صرف اٹھارہ برس کی تھی' اور ڈاکٹر صاحب گیارہ برس گزر جانے کے باوجود میں آج بھی اس مقام پر کھڑی ہوں جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔" اس کی خمار آلود پلکیں بھیگنے لگیں۔

اسامہ نے گہری جانچتی نگاہوں سے اس حسین و جمیل طرحدار خاتون کا جائزہ لیا' اس کو یہ گیارہ برس جیسے چھو کر بھی نہ گزرے تھے ایک دم بھرپور ترو تازہ اور نوخیز جمال تھا اس کا۔

"آپ مجھے بتایئے ڈاکٹر صاحب میں کس سے شیئر کروں کس کو اپنے احساسات بتاؤں' یہ ایسا مسئلہ ہے جسے زبان پر لا بھی نہیں سکتی' نہ ماں کو بتا سکتی ہوں نہ بہن یا دوست سے شیئر کر سکتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں اس قسم کی تشنگی کا عورت کے منہ سے اظہار اس کی بے باکی اور بے حجابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے مجھے بتایئے کیا عورت کے جذبات نہیں ہوتے؟ کیا طلب صرف مرد کی میراث ہے؟ یہ عورت کے اندر بیدار نہیں ہو سکتی۔"

جذباتی کشمکش نے اس کا چہرہ انگارے کی مانند دہکا دیا تھا۔

"آپ اطمینان سے ریلیکس ہو کر بات کیجئے میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

اسامہ نے پیشہ ورانہ تشفی دلا کر گویا اسے اپنی طرف سے اعتبار و یقین رکھنے کی تلقین کی وہ شعلہ فشاں رخساروں پر پھسلتے آنسوؤں کو احتیاط سے ریتے رومال میں جذب کرتے ہوئے خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"سراہنا چاہا جانا اور قبول کرنا ازل سے عورت کی فطری خواہش رہی ہے مرد کی گرمجوش رفاقت اس کی نگاہ اور دست و لب کی شوخ جسارتیں عورت کے وجود میں مان بھر دیتی ہیں اس کی نسوانیت کی تسکین کی ضامن بن جاتی ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب آپ کا اس بدنصیب عورت کے بارے میں کیا خیال ہے جو کسی کے پاس رہ کر بھی پیاسی ترستی رہتی ہے؟

میں گیارہ برس سے آگ میں جھلس رہی ہوں' ڈاکٹر صاحب میرے بھی کچھ تقاضے ہیں جو جذبات کے سمندر میں ہلچل مچا کر میرے پورے وجود کو بے چین کر ڈالتے ہیں اس شخص نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے مگر میں تو پتھر نہیں ہوں ناں بہتری کوشش کی بننے کی مگر ایسا نہیں ہو سکا' گرمجوشی پیار جذبوں کی بے ساختہ یلغار مجھے ان سب چیزوں کی طلب ہے۔ مگر اس سفاک' شقی القلب شخص کے احساسات جیسے برف کی سل کے نیچے دفن ہو چکے ہیں۔

میں بھڑک بھڑک کے سلگ سلگ کے ختم ہو رہی ہوں اور وہ بے حسی سے تماشا دیکھ رہا ہے' یہ حسن و جوانی' یہ شادابی و رعنائی' یہ سب میرے کس کام کے ہوئے جب ان پر استحقاق رکھنے والا' ان سے اپنے وجود کی تکمیل کرنے والا ہی ان سے غافل ہے۔"

وہ اپنے گلابی مخروطی گداز ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں اندر سے اتنی پیاسی' نا آسودہ اور ادھوری ہوں اور اس طرح اپنی ذات کی بے بسی کے حصار میں مقید رہتی ہوں کہ اکثر اوقات اپنی جان کے ٹکڑوں اپنے بچوں کے جذبات و احساسات سے بھی بے گانہ ہو جاتی ہوں' ہزار کوشش کے باوجود میں انہیں اپنی بے ساختہ ماما بھری حدت آمیز قربت نہیں دے پاتی' بے وجہ ان سے اجنبیت برتتی رہتی ہوں۔

گھر کی چہار دیواری کی گھٹن جب حد سے سوا ہو جائے تو میکے چلی جاتی ہوں' وہاں ادھر ادھر کے ملے گلے میں شامل ہو کر اپنی روح کے زخم بھولنے کی کوشش کرتی ہوں خوامخواہ اپنے گھر سے غافل رہتی ہوں۔

یوں لگتا ہے جیسے میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہوں' مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ اس انتقام کی نذر اب میرے بچے بھی ہونے لگے ہیں' اس چیز نے مجھے بہت خوفزدہ کر دیا ہے' ڈاکٹر صاحب میں کیا کروں' نا چاہتے ہوئے بھی میں لاشعوری طور پر بچوں کو دیکھتے ہی جیسے ضد پر اتر آتی ہوں گویا فاروق کا بدلہ اس کے بچوں سے لے رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں" ڈاکٹر صاحب میں پاگل ہو جاؤں گی اس صورت حال میں' میں ایسا نہیں چاہتی مگر جانے کیوں مجھے خود پر کنٹرول نہیں رہتا' بچوں کو دیکھتے ہی میرا دل غم و غصے سے بھر جاتا ہے۔"

اس پر انتہا درجے کی لاچاری اور بے بسی کا عالم طاری تھا اسامہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے کہنی ٹیبل پر ٹکائے نہایت انہماک سے اس کا حرف حرف گویا سماعت میں انڈیل رہے تھے' بات کے اختتام پر انہوں نے انداز نشست بدلا' ایک طویل سانس لے کر سیدھے ہوتے ہوئے میز پر سے سنہری قلم اٹھا کر گول گول گھماتے ہوئے انہوں نے عمیق نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا' پھر بالآخر گویا ہوئے۔

"بعض اوقات حقیقت اس طرح کھل کر سامنے آکر مبہم ہو جاتی ہے کہ انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی الجھنوں کے ریشم میں لپٹتا چلا جاتا ہے" وہ سکون سے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔

"آپ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے بی بی کہ آپ ازدواجی ناآسودگی کا شکار ہیں' آپ کی شادی شدہ زندگی کا تجربہ نہایت ناخوشگوار اور تکلیف دہ ہے لیکن آپ اپنے جائز حق کا مطالبہ اپنے شوہر کے روبرو پیش کرنے سے لاچار ہیں یہ اندر کی جھنجلاہٹ اور بے بسی آپ کے جذبات کی دنیا میں بری طرح اکھاڑ پچھاڑ کی کیفیت طاری کر رکھی ہے چنانچہ آپ اپنے اندر کے شور کو دبانے کے لئے بے سبب گھر بار اور بچوں سے بے گانگی اور بے اعتنائی کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔"

اس نے تھک ہار کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی "خبر نہیں ڈاکٹر صاحب کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو جائے گا' ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر میں مزید اس کیفیت میں رہی تو میں ٹوٹ جاؤں گی میرے اعصاب بری طرح شکست خوردہ ہو چکے ہیں' اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا" وہ متورم سرخ آنکھوں کو مسلتے ہوئے مضمحل سے تھکے ٹوٹے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہو گا" اسامہ نے بہت رسان سے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا' دیکھیے مسئلہ صرف "کمیونی کیشن گیپ" کا ہے' میاں بیوی کے درمیان جب یہ چیز آجائے تو تعلقات کی بے ساختگی اور دلکشی غارت ہو جایا کرتی ہے آپ دونوں میاں بیوی جذباتی اور احساساتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں' یہی فاصلے دوسری دوریوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں' اور دوری اور تکلف کا یہی "تحفہ" آپ لوگ اپنی اولاد کو بخش رہے ہیں' جو خدانخواستہ کسی سنگین صورتحال پر منتج بھی ہو سکتا ہے۔"

اسامہ کے انداز میں بلا کا تفکر اور تشویش تھی سندیلہ ٹھنڈی سانس لے کر گود میں پڑے پرس کے اسٹریپ مسلنے لگی۔

--*

زویا فاروق عالم سے مل کر ششدر رہی تو رہ گئی تھی۔ بلا کا جامہ زیب' جاذب نظر اور خوش رو مرد تھا وہ مہذب شائستہ اور متحمل مزاج۔

"کمال ہے آپ کا بیٹا کس پر چلا گیا فاروق عالم صاحب۔" رسمی علیک سلیک کے بعد بے ساختہ زویا کے منہ سے نکل گیا تھا' وہ زیادہ دیر تک اپنا تجسس دبانے کا ہنر نہیں جانتی تھی۔

"یقین مانیے مجھے تو سچ مچ خفقان ہونے لگا میں بہت خوفزدہ ہو گئی تھی آپ کے بچے کی اتنی جارحانہ اشتعال انگیز حرکات و سکنات پر' اتنی کم عمری میں اس کے اندر اتنی تلخی' اتنی درشتی' اتنی بے حسی کہاں سے در آئی۔

عمر تو لاابالی پن اور معصومیت بھرے رنگوں سے مشتمل ہوا کرتی ہے' پھر اس کے مزاج میں ایسی بے محل پختگی اور انتقامی حس کیسے پیدا ہو گئی' "انا" کا پن کیسے نمودار ہو گیا" زویا استعجاب کے ملے جلے مغلوب لہجے میں استفسار کر رہی تھی۔

"یہ شروع سے ہی خاصا ضدی اور بدتمیز رہا ہے' خصوصاً "اکیڈمک انسٹی ٹیوشنز" میں اس کی ہٹ دھرمی اور حاکمانہ طبیعت کے باعث ہمیشہ مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی ہے۔"

فاروق عالم کے بھاری مہذب لہجے میں بلا کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شرمساری تھی۔

"حالانکہ ہماری جانب سے اسے کبھی بھی کسی پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مجھ سے تو صرف صبح ناشتے کے وقت دو منٹ کی ملاقات ہوتی ہے اس کی ماما کی بھی اپنی مصروفیات ہیں یہ اپنے معمولات میں پوری طرح آزاد رہتا ہے، پھر بھی جانے کیوں اتنا ناخوش اور خفا خفا رہتا ہے۔"

ان کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے آثار تھے۔

"لیکن فاروق صاحب بہرحال آپ کو سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا چاہئے، وگرنہ کل کلاں کو خدانخواستہ آپ کا بچہ ایک ذمہ دار شہری بننے کی بجائے ایک نامی گرامی ڈاکو، غنڈہ یا دہشت گرد بن سکتا ہے۔"

زوبیا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اور معاف کیجئے گا مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ شیراز میں اس قسم کی "صفات" کے جراثیم پنپنا شروع ہوگئے ہیں اگر اب بھی آپ نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو پھر روٹھے وقت کو بہلانا ناممکن ہوتا چلا جائے گا۔"

فاروق عالم کشمکش اور اضطراب کے عالم میں ساکت و صامت بیٹھے اپنے ہاتھوں کو گھور رہے تھے۔

"آپ نے اپنی مسز سے اس بارے میں ڈسکس کیا؟" جانے کیوں زوبیا کو اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

جواب میں فاروق عالم کے چہرے پر استہزائیہ تبسم جگمگا اٹھا۔

"اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کبھی۔"

"کیا مطلب۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "آپ نے یا آپ کی بیگم نے۔"

"شاید دونوں نے۔" فاروق عالم نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ہم نے کبھی ایک دوسرے سے مسئلے مسائل شیئر کرنے اور ان کو حل کرنے کے لئے رائے لینے یا دینے کی رسم نہیں نبھائی، سب اپنی اپنی ڈگر پر رواں دواں ہیں۔"

"اچھا۔۔!" وہ شدید حیرانی کا شکار تھی۔ "مگر اولاد تو بہرحال والدین کا مشترکہ اثاثہ اور مشترکہ ترجیح ہوا کرتی ہے۔"

"ہمارا کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔" انہوں نے دو ٹوک انداز اختیار کیا۔

"ہم دونوں کی اپنی اپنی دنیا ہے۔" زوبیا لمحوں میں معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔

"مگر آپ آپس کی ناچاقی کا بدلہ اپنی اولاد سے کیوں لے رہے ہیں۔" اس کے انداز سے حد درجہ استعجاب ٹپک رہا تھا کیسے سنگدل ماں باپ تھے اولاد کے لئے تو انسان بڑے سے بڑا سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" انہوں نے تردید کرنا ضروری خیال کیا "بس یہ ہے کہ جس وجود سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس کی کوکھ سے جنم لینے والے ذی نفس سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔"

خدایا! کیسا سرد سپاٹ اور برفیلا لہجہ تھا اس بظاہر شاندار سے بھرپور مرد کا۔

"بہرحال میں کوشش کروں گا کہ آئندہ شیراز کی طرف سے آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں۔" وہ بالآخر اٹھ کھڑے ہوئے۔

زوبیا کی الجھن بھری نگاہیں ان کے جاتے قدموں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

۔۔*

غضب کی سردی پڑ رہی تھی اوپر سے قیامت کی جل تھل تھی، سرد برفیلی ہواؤں کے جھکڑ اپنے دامن میں خنک گھٹاؤں کے لشکر سمیٹ کر لائے تھے اور اب بادلوں کی گھن گرج کے ہمراہ پورے زور و شور سے موسم سرما کی رگوں میں برف جما دینے والی یخ بارش کی صورت میں دھرتی پر برس رہے تھے۔

امی نے گیارہ بجے ہی اسکول فون کر کے بتا دیا تھا کہ چھٹی کے وقت اسامہ اسے ہاسپٹل سے واپسی پر پک کر لیں گے، کیونکہ موسم کے تیور صبح سے ہی اپنی قیامت خیزی کا "اعلان" کر چکے تھے ڈیڑھ بجے چھٹی کی بیل بجی تو موسم سرما کی برسات اپنے عروج پر تھی وہ پرس اور فائل سنبھالتے ہوئے کاریڈور میں آئی پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا۔
اس قدر کڑاکے کی ٹھنڈ میں اولوں کی صورت میں برستی برفیلی بارش میں شیراز بڑے مزے سے لان کی کیاری کے پاس کھڑا گلاب کے پودے کی شاخیں ہلا رہا تھا۔

"شیراز۔" بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نما پکار نکلی، وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور چیل کی سی تیزی سے اس کا یخ بستہ بازو کھینچتے ہوئے اسے کاریڈور میں لے آئی۔

"کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں، اتنی غضب کی سردی میں اتنی بارش میں بھیگ رہے تھے؟"
غم و غصے سے اس کا لہجہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔
شیراز بے حس سا کھڑا اپنے ہاتھ دیکھتا رہا۔
"دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی اتنے "جنونی" اور "ظالم" ہو۔"
برفیلی سرد ہوا کے جھونکے کے اثر سے بری طرح کانپتی وہ تاسف و ملال اور تحیر کے ملے جلے انداز میں کہہ رہی تھی شیراز نے بنا کچھ کہے سر جھکا لیا۔
"کیا تمہارے پاپا نے کچھ کہا ہے تم سے!" زویا کی ذہنی رو یک لخت پلٹ آئی۔
"نہیں کچھ خاص تو نہیں بس کمرے میں بلا کر سختی سے کہا کہ تمہاری وجہ سے مجھے ہر جگہ شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے، میری زندگی پہلے بھی آسان نہیں ہے جو تم اسے مزید عذاب بنانے پر تلے ہوئے ہو، اچھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے مجھے۔"

وہ بڑے سادہ سے سپاٹ بے تاثر انداز میں سامنے کسی غیر مرئی نکتے پر نظر جمائے کہہ رہا تھا۔
زویا کے دل پر ایک گھونسا آن لگا، اس نے بے اختیار شیراز کو اپنے ساتھ لگا لیا، بھلا اس بگاڑ میں اس معصوم کا کیا قصور، اس کو ابتدا سے ہی تو اپنے اپنے غبار نکالنے کا ذریعہ بنایا جاتا رہا ہے۔
اسی لمحے شیراز کی گاڑی کا ہارن بج اٹھا، وہ بیگ اٹھا کر اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا، اس نے ہاتھ ہلا کر گویا جانے کا سگنل دے دیا۔
دس پندرہ منٹ بعد اسامہ کی سفید سوزوکی گیٹ کے قریب نمودار ہوئی، اس نے کچھ ساعت کے توقف کے بعد پرس سر سے بلند کر کے جیسے ڈھال کے طور پر سر پر رکھا اور کاریڈور سے نکل کر لان عبور کرتی ہوئی بلا کی تیز رفتاری سے گیٹ سے کچھ فاصلے پر رکی گاڑی میں بعجلت سوار ہو گئی۔
"السلام علیکم۔" ان کے ہمراہ بیٹھ کر حواس بحال کرتے ہوئے اس نے بمشکل تمام علیک سلیک کا فریضہ سرانجام دیا، سردی کے علاوہ ان کی اتنی قربت نے بھی اس کے پورے وجود پر لرزش طاری کر دی تھی، وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی، وہ کافی سے زیادہ بھیگ چکی تھی، اسامہ نے جواب میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا۔
"چھتری ہمراہ لے لینی تھی، اس طرح بھیگ کر ٹھنڈ بھی لگ سکتی ہے۔" ان کی گمبھیر دھیمی آواز نے سکوت توڑا۔
"جی۔" اسے سمجھ نہیں آیا جواب میں کیا کہے، عجب بدحواس اور بدتمیز طریقے سے دل دھڑکنے لگا تھا، اتنی شدید خنکی میں بھی اس کا چہرہ جیسے حجاب کی گرمی سے دہکتا محسوس ہو رہا تھا، اتنی قربت کے باعث اس کا تنفس الجھنے لگا تھا، وہ عجب طرح سے سمٹی سمٹائی گھبرائی ہوئی اپنے آپ سے نظر چرائے بیٹھی بے انگلیاں آپس میں مسل رہی تھی۔
شدید دھند اور بوچھاڑ کے باعث راستہ دیکھنے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا سو گاڑی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔
"بیلا بتا رہی تھی، آپ میرے ساتھ کوئی پرابلم ڈسکس کرنا چاہ رہی ہیں۔" خاصی دیر بعد بالآخر وہ گویا ہوئے۔
"ستیاناس جائے تیرا بیلا کی بچی، سمجھ لوں گی تم سے۔" وہ دل ہی دل میں موصوفہ کو کھری کھری سنانے کا عزم باندھ رہی تھی، "کہاں پھنسا دیا، بھلا ان کے روبرو دو لمحے ٹھہر کر بات کرنے کی تاب کہاں مجھ میں۔"
"جی، وہ۔" اس کے حلق میں جیسے گولا سا پھنس گیا مگر اب بات تو بہرحال کرنا تھی۔
"میری کلاس میں ایک بچہ ہے، وہ اس کے رویے

کی وجہ سے کلاس میں کافی ڈسٹربنس رہتی ہے۔" پھر وہ شیراز کے متعلق بتاتی چلی گئی' اس دوران اس نے اپنی انتہا درجے پر پہنچی جھجک اور گھبراہٹ پر بھی کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔

"بچے کے والد صاحب اپنی شادی سے خوش نہیں ہیں' وہ کسی زمانے میں اپنی ایک غریب اور عام سی شکل وصورت والی کلاس فیلو پر مرمٹے' نگران کے صاحب حیثیت والدین کو یہ بات سخت شاق گزری' انہوں نے بعجلت ان کی شادی اپنے جیسے صاحب حیثیت خاندان کی اکلوتی حسین وجمیل لڑکی سے کردی' نگران صاحب کا دل ان پر نہیں آسکا۔

وہ آج بھی اس زبردستی اور ناپسندیدگی کی شادی کی اہمیت تسلیم کرنے سے انکاری ہیں' بیگم سے کسی قسم کی ذہنی ہم آہنگی اور بے تکلفی استوار نہیں کی اور یہی بے نیازی بچوں کے وجود سے بھی برت رہے ہیں۔"

"یہ ساری علامات بچے میں کنڈیکٹ ڈس آرڈر کی موجودگی ظاہر کرتی ہیں۔" کافی دیر غوروخوض کرنے کے بعد انہوں نے لب کشائی کی۔

"آپ نے ان کے والد صاحب کو بالکل صحیح وقت پر خبردار کر کے بہت اچھا کیا' اگر اس عمر میں بچے کا مسئلہ حل نہ کیا گیا تو کچھ عرصے بعد وہ اینٹی سوشل پرسنالٹی بن جائے گا جوانی کی سرحد پر پہنچ کر' دراصل بچے کی اتنی انتہا درجے کی بدتمیزی' جارحیت' منتقم مزاجی اور باغی رویے کی وجہ والدین کی طرف سے رد کیے جانے اور ٹھکرائے جانے کا احساس ہے' بچہ جب اپنے آپ کو اپنی فیملی کی طرف سے **"ریجیکٹڈ"** محسوس کرتا ہے اور جب یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے تو بچے میں اس ڈس آرڈر کی علامات نمایاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

والدین کی ناکام ازدواجی زندگی کے بداثرات بچے کی شخصیت مسخ کر ڈالنے کا باعث بن جاتے ہیں' ایسے بچوں کو پیار بھری فضا اور محبت کا عملی پرجوش اظہار درکار ہوتا ہے' وہ ایسے ماحول کے طالب ہوتے ہیں جہاں وہ گرمجوشی سے قبول کیے جائیں جہاں ان کی ذات کو مثبت طریقے سے پوری طرح محسوس کر کے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔"

"اس بچے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے' مجھے تو اس سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی ہے' اس کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار اس کے اپنے پیرنٹس ہیں۔" زویا کا دل آج اچانک ہی موم ہو گیا تھا شیراز کے لیے۔

"دراصل بات یہ ہے کہ جب تک "ریزن" موجود رہتا ہے تب تک مسئلہ حل کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں' کیونکہ جب تک بچے کے گھر کا ماحول ٹھیک نہیں ہوگا اس کے والدین کے درمیان پائی جانے والی ٹینشن ختم نہیں ہوگی "ریزن" ختم نہیں ہوگا اور جہاں تک ریزن ختم کرنے کا تعلق ہے وہ والدین کے مکمل اور غیر مشروط تعاون کے بغیر ناممکن ہے' کیونکہ بچے کو کسی دوسرے ماحول میں رکھنے سے عارضی طور پر افاقہ تو ضرور ہو جاتا ہے' مگر چونکہ مستقل طور پر بچے کو پھر اسی ماحول میں رہنا ہوتا ہے اس لیے وہ دوبارہ وہی علامات اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں' لہٰذا اس کا بہترین علاج یہ ہوتا ہے کہ والدین پر تھراپی وغیرہ اپلائی کی جائیں۔

جب تک ان کی آپس کی تلخی' بدگمانی اور دوری ختم نہیں ہوگی' بچے کا مسئلہ جوں کا توں موجود رہے گا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سنگین تر ہوتا چلا جائے گا' فیملی کنڈیشنز بچے کی شخصیت کی اساس بنانے کا باعث ہوتی ہیں جب اساس ہی کمزور اور کچی ہوگی تو عمارت کیسے کھڑی رہ سکے گی' لہٰذا اس سلسلے میں بچے کے والدین کو فوری طور پر اقدام کرنے کی ضرورت ہے' اگر ممکن ہو سکتا ہے تو بچے کے والدین کو میرے پاس بھیجئے گا' علاج کی ضرورت بچے سے زیادہ اس کے والدین کو ہے' کیونکہ یہی بچے کے مسئلے کا حل ہے۔"

انہوں نے بڑی تفصیل سے مسئلے کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی' زویا بہت مطمئن سی ہو گئی مگر اپنے ممنونانہ جذبات کا اظہار کرنے میں حجاب مانع تھا' جانے کیا بات تھی حالانکہ وہ اچھی خاصی باتونی واقع ہوئی تھی مگر واحد اسامہ کے سامنے اس کی بولتی ایک دم بند ہو جاتی تھی' ہمت ہی نہیں پڑتی تھی' بھی اتنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سنجیدہ' سو بہ مائنڈ ڈ بندے ہیں کیا خبر کون سی احمقانہ اور بچکانہ بات یا انداز برا لگ جائے' سو وہ محتاط ہی رہا کرتی تھی۔

مسئلہ بیان کر کے خاطر خواہ تسلی بخش جواب حاصل کر لیا تھا اب کرنے کی کوئی بات نہ تھی سو وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کو کھڑکی سے باہر کی سمت متوجہ ہو گئی' حالانکہ شیشے سے پار خاک بھی نظر نہیں آ رہا تھا' غضب کی بوچھاڑ اور دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

گاڑی جوں کی طرح رینگ رہی تھی' تڑاق' تڑاق اسی وقت زوردار انداز میں بادل کڑاکے سے گرجے اور زبردست انداز میں کہیں بجلی گری۔

وہ بے اختیار چیخ مار کر ان کے قریب ہو گئی اور انہوں نے بڑی بے ساختگی سے بازو اس کے گرد ڈال کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

انہوں نے گاڑی سڑک سے نیچے اتار کر بند کر دی تھی' اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا' اولے اور بارش کی غضبناک موٹی موٹی بوندیں اس طرح سفید چادر کی طرح ونڈ اسکرین سے ٹکرا رہی تھیں کہ لگتا تھا کسی آن سفید سخت گولوں کی یہ طوفانی یلغار فولادی گاڑی کے پرخچے اڑا ڈالے گی۔

"کیا ہوا ڈر گئیں آپ؟"

ان کی گمبھیر سرگوشی اس کے کانوں کے پاس گونجی' اس نے دہشت سے بھینچی آنکھیں ہمت کر کے کھول کے دیکھا' وہ اس کے چہرے پر جھکے ہوئے تھے' ان کی نگاہ اور چہرے پر ایک انوکھی نشیلی سی خمار آلود تحریر کی جھلک تھی' وہ ان کے اس قدر قریب ان سے لگی بیٹھی تھی کہ اس بات کو محض سوچ کر وہ مارے شرم سے گڑی جا رہی تھی۔

ہمت کر کے اس نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے سنبھل کر ان سے الگ ہونا چاہا اسی لمحے غضبناک انداز میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے بادل کڑکڑائے اور وہ ایک بار پھر سب فاصلے مٹا کر ان کے مضبوط بھرپور پر حرارت وجود میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔

"آج قدرت نے آپ کے فرار کی ہر راہ مسدود کر دی ہے۔" اسے خود میں جذب کرتے ہوئے انہوں نے شوخ سی سرگوشی کی' وہ کٹ کر رہ گئی اور انہوں نے اپنے جائز شرعی حق کو استعمال کرتے ہوئے بے ساختہ کچھ شرارتیں کر ڈالیں اور وہ مارے حیا کے جیسے زندہ دفن ہونے کی دعا کرنے لگی' حجاب کے بوجھ سے اس کا پورا وجود بری طرح شل ہو گیا تھا۔

"گاڑی چلایئے پلیز۔" بادلوں کی طوفانی گڑگڑاہٹ چند ساعت کو تھمی تو وہ جیسے روہانسی ہو کر ملتجی ہوئی' پلکیں بری طرح اوپر نیچے اٹھ اور گر رہی تھیں۔

"مگر کیسے؟" وہ اس سے نجانے کیوں اتنے شریر ہو رہے تھے۔

"اب تاب نہیں رہی؟" انہوں نے ایک بھرپور معنی خیز نگاہ اس پر ڈال کر عذر پیش کیا' وہ پانی پانی ہو گئی' ان کی نگاہوں کے وارفتہ سے شرارے اس کی روح تک کو جھلسائے دے رہے تھے۔

ایسا پاگل کر دینے والا موسم' اس کی لطافت و نزاکت سے سجے حسین سراپے والی قربت بھر شرعی استحقاق استعمال کرنے کے پورے پورے مجاز' انہوں نے بے اختیار اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔

"ارے' ارے' ایسے' بھئی کیا ہو گیا؟" گھر آتے ہی اپنے کمرے میں بیڈ پر گرتے ہوئے تکیے میں منہ دے کر وہ ہچکیوں سے روتی چلی گئی تھی جس نے بیلا کو ایک ثانیے کو متوحش کر دیا۔

"آئندہ میں ان کے سامنے بالکل نہیں جاؤں گی۔" وہ لال سرخ منہ پونچھتی سخت خفگی سے عزم باندھ رہی تھی' ایک لمحے کو بیلا نے بغور اس کا دہکتا دہکتا سا ناروپ دیکھا اور پھر بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔"

ان محترم کی بدتمیزیاں کیا کم تھیں دل جلانے کو' جو اب بیلا کی ذومعنی ہنسی مزید خفت میں مبتلا کر رہی تھی۔"

"کیا اسامہ بھائی نے بہت تنگ کیا تھا۔" وہ بڑے معنی خیز انداز میں آنکھیں نچاتے ہوئے دریافت کر رہی تھی' وہ شرم سے لال ہو گئی' گال دہک کر انگارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بن گئے تھے۔ "جھینپ مٹانے کے لیے اس نے ایلا کی بچی۔" کشن اس پر اچھال دیے تھے۔

ڈھیروں "چلو بھئی کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے' اسی طرح قدرت تم دونوں کو "لائن" پر لائے گی' لاتوں کے بھوت جو ہوئے۔"

*_*_*

"ماضی کے مزاروں پر دیے جلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا' اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ انسان تاریک اور بجھے ہوئے دلوں میں یقین کے چراغ روشن کر دے' ماضی اپنے اچھے برے اثرات سمیت دفن ہو چکا ہے' ان لوگوں کو معاف کر دیجیے' جنھوں نے نادانستگی یا دانستگی میں آپ کے ہاتھوں سے جگنو لے کر مٹھی میں مسل کر پھینک دیے' آپ یہ روایت تو نہ نبھائیے دوسروں کی مٹھی سے جگنو چھیننے کی۔

اپنے خالی ہاتھ رہ جانے کا غصہ اپنی نسل سے لینے کا کیا جواز بنتا ہے' بہترین عمل یہ ہے کہ انسان خود محروم ہوتے ہوئے بھی دوسروں کو مالا مال کر دے' اپنی خوشیوں کے جگنو گردش زمانہ کے ہاتھوں کھو چکے ہیں تو کیا ہوا دوسروں کی تو جگنوؤں کے دیس تک رہنمائی کر سکتے ہیں ناں۔"

فاروق عالم بہت غور سے اسامہ کا بھرپور اثر انگیز رسان لہجہ سماعت میں اتار رہے تھے۔

"بعض اوقات حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اپنے تجربوں کو اور اپنے آپ کو معاف کر دینے کا عمل آئندہ آنے والے بہت سے غموں سے نجات کا باعث بن جایا کرتا ہے' آپ بھی اپنے ساتھ ہو جانے والی زیادتی فراموش کر دیجیے اور اس عظیم زیادتی کے بارے میں سوچیے جو آپ کی وجہ سے آپ کی بیوی اور بچے کے ساتھ ہو رہی ہے اور اس کے کس قدر بھیانک اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ آپ کی اتنی خوب صورت حسین و جمیل بیوی عنقریب سائیکو کیس بننے کو ہے' آپ کا پھولوں جیسا شاداب و دلکش صحت مند تر و تازہ بچہ مستقبل کا نامی گرامی غنڈہ بننے کی تربیت پا رہا ہے' آپ کا جنت نظیر گھر گھر والوں کی عدم توجہی کے باعث اک قبرستان کی سی حیثیت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے ایسا قبرستان جہاں معصوم و فطری آرزوؤں کا خون کیا جاتا ہے' ذرا سوچیے ان سب باتوں کو فاروق صاحب۔"

اسامہ نے ان پر بہت اچھے طریقے سے جذباتی اٹیک کیا تھا جس کے بہت مثبت اثرات سامنے آئے' فاروق عالم کے چہرے پر جیسے سوچوں کا زلزلہ آیا ہوا تھا۔

"آپ کی بیوی اینٹی ڈیپریسنٹ اور اینٹی وولیٹکس ادویات استعمال کر کر کے اپنا وجود کھوکھلا کر رہی ہے' اس کو حسین جذباتی تقاضوں سے محروم رکھ کر آپ کیوں جبر و قہر کی عظیم مثال قائم کر رہے ہیں؟ آئیڈیل نہیں تو کیا ہوا' آئیڈیل بن تو سکتی ہے ناں' ایک بار محبت سے اس کی سمت پلٹ کر تو دیکھیے' اس سے کچھ کہہ کر فرمائش کر کے تو دیکھیے۔

وہ تو آپ کی طرف سے پیش قدمی کی منتظر ہے' ایک بار کر کے تو دیکھیے اسے اپنے وجود کا احساس تو دلائیے پھر دیکھیے گا کس طرح آپ کے مطلوبہ سانچے میں ڈھلتی ہے' جب ایک دوسرے سے شیئر کرنے کی روایت ہی نہیں ڈالیں گے مل بیٹھ کے تبادلہ خیالات نہیں کریں گے تو ایسے میں مسائل خود بخود کیسے حل ہوں گے بتا دینا آگاہ کر دینا بھی مسئلے کا آدھا حل ہوتا ہے' پھر میاں بیوی کا رشتہ تو بہت وسیع سطح پر شراکت کا متقاضی ہوا کرتا ہے۔"

اسامہ کا دلنشیں انداز ان پر سوچ کے نئے در وا کر رہا تھا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب' انہوں نے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ انہیں میری طرف سے کسی جذباتی پیش قدمی کی طلب ہے' وہ اپنے میکے میں زیادہ خوش رہتی ہیں' اپنا گھر ان کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہے۔"

فاروق عالم کے ماتھے پر شکنوں کا جال گہرا ہوتے دیکھ کر اسامہ مبہم سے انداز میں مسکرا دیے۔

"یہی تو ساری بات ہے' کسی کو سمجھ نہیں پاتے تو خود ہی سے فرض کر لیتے ہیں کہ وہ بھی اس رد عمل کو

...لے گا' یہ غلط بات ہے' آپ معمول کے مطابق ہی لیا نے انہیں کون سا حق دے رکھا تھا جس کے تحت وہ بے تکلفانہ آپ سے مطالبہ کرنے کی جسارت کرتیں دراصل یہی فاصلے' شعوری کسی قسم کی خودساختہ رکاوٹیں اور دوریاں مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال آپ ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہیں' اور مجھے پورا یقین ہے کہ اب اپنے آپ کو' اپنی بیگم کو اور اپنے بچوں کو بھرپور نارمل زندگی تک لانے میں دیر نہیں لگے گی' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔"

جواب میں فاروق عالم کے چہرے پر جگمگاتی خوب صورت سی مسکراہٹ بے ساختہ ان کی بات کی تائید کر رہی تھی۔

--*

"بیلا' تم ذرا اچھی طرح اس سے معلوم کرو' اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' آخر کیوں مسلسل انکار کر رہی ہے صفیہ۔ کتنی بار کہہ چکی ہے رخصتی کے لیے' اب تو اس کو ٹالتے ہوئے بھی شرم سی محسوس ہوتی ہے' آخر کوئی حد تو ہو ناں اس انکار کی۔ "ہم بھی نہیں' ابھی نہیں' کیا بات ہوئی بھلا۔" امی کے لہجے میں تشویش' تفتیش اور ترشی سبھی کچھ شامل تھا۔

"اس سے پوچھو اس بلاجواز نہ کا کیا مقصد ہے' پہلے تو چلو ماسٹرز کرنے کا معقول عذر موجود تھا' اب تو خیر سے رزلٹ بھی آچکا ہے بھلا میں کیا بہانہ کروں صفیہ سے' بڑی عجیب بات ہے۔ "آنے بہانوں" سے کام کہاں چلتا ہے' اس کی رخصتی کا فرض خیر خیریت سے نبٹا دیا جائے تو پھر تمہارے لیے بھی سوچیں' مگر اس لڑکی کے دماغ میں عجب خناس سمایا ہوا ہے' بھلا کیوں انکار کر رہی ہے رخصتی سے۔"

امی جان خاصی برہم ہو رہی تھیں' بلاشبہ ان کی خفگی بجا تھی' خود بیلا بھی محسوس کر رہی تھی کہ زویا کے کسی سے بلاجواز انکار نے گھر بھر میں ٹینشن پیدا کر دی ہے۔

"بھئی دیکھو' اب کے مجھے حتمی جواب چاہیے' امی اتنی پریشان ہیں' صفیہ پھوپھو ہزار پھیرے لگا چکی ہیں' ادھر اسامہ بھائی اپنی جگہ متعجب ہیں' جب بھی آتے ہیں' تم ملنے سے گریز کرتی ہو' فون بھی اٹینڈ نہیں کرتیں' اب تو انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے' ورنہ پہلے کون سا روز روز آتے تھے' مگر اب تو جیسے رستہ بھی بھول چکے ہیں' ادھر سے بھی مہیب خاموشی ہے اور ادھر سے بھی پراسرار سکوت چھایا ہوا ہے' بھید کھلے تو کیسے کھلے' بات کیا ہے' دیکھو اس طرح تو بہت پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا معاملہ' میں تو اب تک تم دونوں کے گریز اور تکلف کو فطری جھجک سے موسوم کرتی رہی تھی' مگر اب تم دونوں کی طرف سے اتنا برفیلا اور سرد مہر ردعمل صحیح معنوں میں میرے اعصاب پر نوبت بجانے لگا ہے' آخر کیا بات ہے تم دونوں کے بیچ۔"

بیلا امی کو تشفی کرا کے سیدھی اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور جاتے ہی جیسے دھاوا بول دینے والے انداز میں برس پڑی۔

"پلیز بیلا' مجھے خوامخواہ تنگ نہ کرو' میں بچوں کے پیپرز بنا رہی ہوں مجھے ذہنی یکسوئی درکار ہے۔"

زویا کے بے تاثر سپاٹ انداز نے بیلا کو آگ بگولہ کر ڈالا' طیش کے عالم میں اس نے اس کے ہاتھ سے پیپرز جھٹ سے دور کر دیے۔

"ارے یہ کیا بدتمیزی ہے بھئی۔" وہ بھنا کر مڑی' اس کے تیور غضبناک تھے۔

"ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔" بیلا نڈر لہجے میں بولی' "کب تک پہلو تہی اور تغافل برتنے کا ڈراما جاری رہے گا' صاف صاف بتاؤ چاہتی کیا ہو۔"

"کیا چاہتی ہوں؟ بھئی میرا ان کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا' وہ بہت خاموش طبع' سنجیدہ مزاج اور پڑھنے لکھنے سے رغبت رکھنے والے محتاط طبیعت کے بندے ہیں جبکہ میری شخصیت میں بہت ہلچل' ہنگامہ پروری' شرارت' جذباتیت اور لاپروائی کے عناصر یکجا ہیں' ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہیں' ان کے ساتھ ان کی طرح کی کوئی پڑھاکو ٹائپ اور ٹھنڈے مزاج کی خاتون چل سکتی ہے' کیا فائدہ زبردستی اور مارے باندھے کے بندھن کا۔"

بیلا کی جارحانہ کارروائی کا فائدہ یہ ہوا کہ اس

پہنچا ہو کر بغیر تمہید باندھے ساری حقیقت گوش گزار کرڈالی۔

وہ آنکھیں پھاڑے ہونق چہرہ لیے زوبیا کو دیکھتی رہ گئی۔

"نہیں تو یہ احساس آنجنابہ کو آج ہوا ہے؟" وہ حیران کن لہجے میں غرائی۔

"نہیں پہلے سے ہی تھا مگر اس کی سنگینی کا احساس اب ہوا ہے اور شکر ہے بروقت ہو گیا' میرے اندر مسز سندیلہ فاروق عالم جتنا بڑا دل اور حوصلہ نہیں ہے کہ ساری زندگی انگاروں پر بسر کرتی رہوں۔" اس کا انداز بہت دوٹوک تھا۔

بیلا کا طائر خیال جانے کہاں کہاں سوچوں کی کن وادیوں میں قلانچیں بھر رہا تھا پھر کچھ سوچ کر تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی سمت بڑھ گئی۔

*_*_*

"کیسے مزاج ہیں بیلا؟" ان کے سنجیدہ باوقار انداز میں بشاشت کی جھلک تھی۔

"اسامہ بھائی' ان محترمہ کے سر میں تو ابھی جاب کرنے کی دھن سمائی ہوئی ہے مگر آپ نے بھی ان کی نامعقول قسم کی تاویل پر کوئی جوابی رد عمل ظاہر نہیں کیا' بلکہ الٹا خاموشی کی زبان میں تائید کرڈالی' یہ کیا بات ہوئی۔" وہ بلاتوقف شروع ہو گئی تھی۔

"ہر شخص اپنی مرضی' اپنی سوچ اور اپنی ذات کی حد تک آزاد ہے' یوں بھی میں سمجھتا ہوں رفاقت میں جب تک ذہنی ہم آہنگی نہ پائی جائے اس کی پائیداری مشکوک ہی ٹھہرتی ہے۔"

"مگر خدانخواستہ یہاں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔" ان کی متین دلیل کی برجستگی نے بیلا کو صحیح معنوں میں ہراساں کرڈالا' وہ تو سمجھ رہی تھی نادانی کا یہ عالم صرف زوبیا کے ہاں ہی پایا جاتا ہے۔

"ہمارے مزاجوں میں بہت فرق ہے یقیناً" یہ نکتہ قابل توجہ اور اہمیت کا حامل ہے' میری اور ان کی ترجیحات و ترغیبات میں کمال درجے کا فرق پایا جاتا ہے' شاید اسی وجہ سے وہ اس نتیجے پر پہنچی ہیں اور میرے خیال میں یہ خاصا معقول جواز ہے' وہ اپنے ہم مزاج شخص کے ہمراہ یقیناً" مسرتوں کی حقیقی روح پاسکتی ہیں۔

میری زندگی میں بہت ٹھہراؤ' جمود اور خشک اور بور قسم کی مصروفیات کا عمل دخل ہے جنہیں ان کی افتادِ طبع قبول نہیں کرپاتی' شاید اسی لیے وہ ہمیشہ مجھ سے گریزاں رہی ہیں۔"

کوئی بم بھی اس کے سر پر چھوڑ دیا جاتا تب بھی وہ اتنی بری طرح بے قابو نہ ہوتی جتنی اس انکشاف کے بعد ہوئی تھی۔

"اوہ میرے خدایا' دونوں اول درجے کے احمق ہیں' بڑے آئے دوسروں کو سکھانے پڑھانے والے' ہونہہ۔" اس نے فون پٹاخ سے کریڈل پر دے مارا اور اب مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنا اشتعال دبارہی تھی۔

"تو یہ ساری بات تھی' یہ احمقوں کی ملکہ عالیہ یہ سوچ کر ان کا سامنا کرنے سے کنی کتراتی رہیں کہ انہیں اپنی جیسی سنجیدہ اور خاموش طبع لڑکیاں پسند ہیں اور وہ یقیناً" ان کی پسند پر پورا نہیں اترتی اور ادھر وہ بے وقوفوں کے سردار اس کے احتراز کو اس کی ناپسندیدگی پر محمول کرتے ہوئے اس لیے ان سے کتراتے پھرتے رہے کہ وہ موصوفہ کے خوابوں کے شوخ و شنگ بھرپور شہزادے نہیں ہیں موصوفہ کو ان کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں محض مارے باندھے کا تعلق نبھارہی ہیں۔"

بیلا ٹہل ٹہل کر اپنا چلچلاتا جھلتا موڈ درست کررہی تھی۔

"سبحان اللہ' دوسروں کو شراکت و رفاقت کا سبق پڑھانے والے خود ایک دوسرے سے احساساتی اعتبار سے اتنے فاصلے پر پہنچے ہوئے ہیں' کتنا کہتی تھی کہ یہ تکلف' غیر ضروری جھجک کسی عظیم نقصان سے دوچار بھی کرسکتی ہے' رنگ لے ہی آیا ناں یہ گریز' دوسروں کی شادی شدہ زندگی کے "کمیونی کیشن گروپ" کی تو فٹ سے نشاندہی کرڈالی' دونوں نادانوں نے اور اپنے اس ڈیڑھ دو سالہ تعلق پر چھائے جمود کی تہ کھنگالنے کی غلطی کرنے کا سوچا تک نہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ جی بھر کے دونوں کو "سنا" رہی تھی دل ہی دل میں۔

۔۔*

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا

بیلا جیسے گنگناہٹوں کے ریکارڈ توڑ رہی تھی۔

"ارے بس کرو، اب کیا گھول کر پینے کا ارادہ ہے ان مصرعوں کو۔"

بالآخر زویا کی تاب سماعت جواب دے گئی۔

"کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا۔" بیلا پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا، بدستور لہک لہک کر گاتی رہی۔

"دوسروں کی ناکام ازدواجی زندگی کی پیچیدگیاں تو تمام تر زاویوں سمیت تم دونوں عقلمندوں کی نگاہ بینا کو دکھائی دے گئیں ارے احمقو اپنے اس علم کو اس انتہا درجے کی قابلیت اور ذہنی رسائی کو تھوڑا بہت اپنے لیے بھی استعمال کرلیا ہوتا، اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا، دوسروں کے مسئلے تو بڑی خوش اسلوبی اور تندہی سے حل کرنے کی لگن میں مرتے رہے اور اپنے یہاں بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے ڈھیر لگتے چلے گئے، ان کو پلٹ کر کھنگالنے کی نوبت نہیں آنے دی۔

ارے کبھی اپنے دل کی بات بھی ایک دوسرے کو بتائی ہوتی، دونوں دل میں لیے لیے پھرتے رہے اور اب چلے تھے اپنی اپنی جگہ "قربانی" کا عظیم ترین مظاہرہ کرتے نام نہاد عظمت کے مینارے کھڑے کرنے۔"

وہ دانت پیس کر جیسے انگارے چباتے ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر وعظ فرما رہی تھی۔

"یا الٰہی، کون سا بھوت سوار ہے تم پر "لٹریچر فوبیا" کے علاوہ۔" زویا انتہائی حیرانگی سے اسے اتاولی ہو کر بکتا جھکتا دیکھ رہی تھی۔

مگر بیلا اس بات کی وضاحت کے لیے رکی نہیں یونہی تن فن کرتی پیر پٹختی سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی جھپٹ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے بیرونی دروازے کی جانب گھسیٹتی چلی گئی۔

"ارے ارے کیا ہو گیا ہے تمہیں، باؤلی ہو گئی ہو کیا۔" وہ بھونچکا ہی تو رہ گئی تھی۔ "کہاں لے جا رہی ہو مجھے۔"

"جہنم میں، خبردار جو آنا کانی کی۔" بیلا کے تیور خطرناک تھے وہ اس وقت جیمز بانڈ زیرو زیرو سیون بنی ہوئی تھی "ایک کام سے جانا ہے مجھے۔"

وہ ڈپٹ کر اسے فرنٹ سیٹ پر جیسے پٹخ کر دروازہ دھاڑ سے بند کرتی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئی اور آندھی طوفان کی مانند گاڑی نکال کر روڈ پر لے آئی۔

"ارے میرا حلیہ ملاحظہ کیا ہے، کہیں جانے کے قابل؟"

کوفت اور اچنبھے کے ساتھ ساتھ اس پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہو گئی، ملگجے سے مسلے ہوئے سفید اور سیاہ پرنٹ کے شلوار قمیص میں الجھے بکھرے بالوں سمیت بڑا دلچسپ حلیہ بنا ہوا تھا اس کا، مگر بیلا کو جیسے بھیڑیں کاٹ رہی تھیں، اس کے واویلے پر کان دھرے بغیر گاڑی اڑاتی چلی گئی اور بالآخر صفیہ پھوپھو کے گھر کے کھلے گیٹ سے اندر داخل کر دی۔

"یہ، یہ کہاں لے آئی ہو مجھے۔" زویا کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔

"دماغ تو درست ہے ناں تمہارا، بھلا پھوپھو کیا کہیں گی۔"

نکاح کے بعد وہ شاذ و نادر ہی کبھی پھوپھو کے ہاں آئی تھی اور اب موجودہ صورتحال میں تو ویسے بھی یہ قطعی نامناسب لگ رہا تھا۔

"پھوپھا اور پھوپھو آج صبح کی گاڑی سے پشاور گئے ہیں کسی کام سے، گھر میں کاشف کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔"

وہ اسے "پکڑ دھکڑ" بلکہ "جکڑ" کر بالآخر اندر لانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

"بھئی داد دیتے ہیں آپ کے حوصلے، اور عزم و ہمت کی بیلا آپی۔" کاشف لان کے پودوں کو پانی دیتا ہوا خاصی دلچسپ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"اوپر ہیں وہ اپنے کمرے میں۔" ساتھ ہی بیلا کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈائریکٹ بھی کر دیا گویا دونوں کی ملی بھگت تھی' اب بیلا کو جانے مل گیا تھا سو دونوں اس کے احتجاج اور چیخ پکار پر کان دھرے بغیر کھینچ کھانچ کر اور اسامہ کے کمرے میں لے آئے' دروازہ ناک کیا اور اندر سے "یس" کی آواز سن کر بعجلت کھول کر اسے اندر "پاس" کیا اور پھر باہر سے بند کر کے گویا اپنا فرض پورا کر کے دھڑ دھڑ کرتے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے آ گئے۔

اب جو معرکہ ہو دونوں میں ہوگا' انہوں نے تو اپنا کام خوش اسلوبی سے نبٹا دیا تھا۔

وہ کتابوں کے شیلف سے مطلوبہ کتاب تلاش کرتے دروازے پر شور کی آواز سن کر "یس" کہتے ہوئے مڑے اور پھر ششدر رہ گئے۔

"آپ' یہاں' خیریت تو ہے ناں۔" ان کے انداز سے ٹپکتا فطری استعجاب اس بات کا شاہد تھا کہ وہ بیلا اور کاشف کی ملی بھگت میں شامل نہیں تھے۔

"وہ مجھے۔" اس نے نروس ہو کر پیچھے پلٹ کر بند دروازے کو دیکھا' اسے بہت سارا رونا آ رہا تھا اپنی موجودہ پوزیشن پر۔

انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ٹیبل پر رکھ کر طویل سانس لیتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا۔

نوچ کھسوٹ اور افراتفری کے عالم میں اس کے سیاہ دوپٹے کا پلو آدھے سے زیادہ زمین پر آ رہا تھا جبکہ ہلکا سا بایاں کندھے پر ٹکا رہ گیا تھا' ڈھیلی ڈھالی بوٹی کھینچا تانی میں مزید "قابل رحم" پوزیشن میں آ گئی تھی یعنی نصف سے زائد بال اس کی گرفت سے نکل کر گالوں' گردن اور شانوں کے اطراف بکھر چکے تھے جنہیں ہاتھ سے پرے کرنے کی کوشش میں بوکھلائی گھبرائی سی سیاہ و سفید پرنٹ کے شکن زدہ شلوار قمیص میں ایک دم گھریلو سی' سادہ اور بہت دلکش نظر آ رہی تھی' پیروں میں بیڈ روم سلیپر تھے۔

اسے اپنے اس رنگ برنگے حلیے پر بہت شدت سے خفت محسوس ہو رہی تھی' اوپر سے ان کی گہری کھوجتی بولتی تفصیلی نظریں ___ وہ گڑبڑا کر رہ گئی تھی' اس پر جیسے گھبراہٹ اور سراسیمگی حملہ آور ہو گئی۔

"آیئے تشریف رکھیے' بہت دنوں بعد آپ اس غریب خانے پر تشریف لائی ہیں۔" انداز تو سنجیدہ ہی تھا مگر لہجے میں بلا کی شرارت تھی وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"مم میں چلتی ہوں۔" وہ تھوک نگلتی بمشکل بروقت تمام دھیرے سے منمنا کر جانے کے لیے پلٹی مگر وہ آن کی آن میں اس کے راستے میں حائل ہو گئے۔

وہ کیا کہتے ہیں اپنے ناصر کاظمی صاحب کہ

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں
آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

ان کی بھرپور نگاہ بڑی تندہی سے اس کا گھریلو بے تکلف سادہ دلربا سراپا جانچ رہی تھی' وہ بے اختیار اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

"ہم اکثر آپ کو خواب میں اس بیڈ روم میں چلتے پھرتے' ہنستے بولتے' سوتے جاگتے دیکھا کرتے تھے' تعبیر آج ملتی دکھائی دیتی ہے تو کیوں ہماری خوشیوں کی عمر مختصر کر دینے کے درپے ہیں آپ مسز اسامہ۔" کس

جنہوں نے استعمال کیا وہ جانتے ہیں
سوہنی ہیئر آئل
سوہنی ہیئر آئل کی خوبیاں
گرتے بالوں کو روکتا ہے
بال لمبے اور گھنے کرتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
سوہنی ہیئر آئل
قیمت/50 روپے
کیا آپ نے اسے استعمال کیا؟ نہیں تو ایک دفعہ استعمال کر کے دیکھیں
ملنے کا پتہ
۳۷، اردو بازار کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

قدر حدت آمیز معنی خیزی تھی ان کی نگاہ اور لہجے میں وہ کٹ کر رہ گئی۔

"آج کیسے ہو رہے ہیں' اتنے چلبلے' شوخ اور بے تکلف سے' جیسے اچانک کوئی خول چٹخ جائے۔" جس کو اس کا سارا کریڈٹ بیلا اور کاشف کو جاتا تھا جنہوں نے اسامہ پر حقیقت حال روشن کی تھی۔

"بیٹھیے جناب ادھر۔" انہوں نے بشاشت اور گرمجوشی سے کہتے ہوئے اس کو کندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"یہاں کی ہر شے کے جملہ حقوق آپ کے نام محفوظ ہیں سمیت ہمارے۔"

ان کے ایک ایک انداز میں جیسے زندگی کی کھلکھلاہٹیں گھل گئی تھیں۔

"پلیز زویا' ریلیکس ہو کر بیٹھو یہاں۔" انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کے بائیں کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا' "اور مجھ سے خوب لڑو۔"

وہ ان کی اس قدر انوکھی اور بے تکلفانہ فرمائش پر گنگ سی بیٹھی رہ گئی' ان کا التفات اسے عجیب طرح کی مشکل میں ڈالے ہوئے تھا۔

اس نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا' وہاں سکون کے ساتھ ساتھ جیسے زندگی کی والہانہ جگمگاہٹیں بھی روشن روشن نمایاں ہو رہی تھیں۔

"ہاں بھئی' لڑنے کے لیے کون سی کسی پلاننگ کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔" وہ کس قدر شرارتی لہجے میں مخاطب تھے اس سے' یوں جیسے دونوں کے درمیان ازل سے بے تکلفی چلی آ رہی ہو اور پھر "آپ" سے "تم" تک کی نوبت کیسے آ گئی!

"میں کوئی بے وقوف ہوں اور پھر میں کیوں لڑوں آپ سے۔" پھر نجانے اسے کیا ہوا' دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر زار و قطار روتی چلی گئی۔

انہوں نے اسے دل کا غبار ہلکا کرنے کا کھل کر موقع دیا پھر اس کے قریب آن بیٹھے اور زبردستی اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر انگلیوں کی پوروں سے اس کے رخساروں پر لرزتی اشکوں کی لڑیاں پونچھنے لگے۔

"بات یہ ہے عزیزِ من کہ ہم لوگ دوسروں کی اصلاح کرنے' انہیں راستہ دکھانے کا عمل تو بڑی سرعت سے کر گزرتے ہیں' مگر اپنی ذات کی خامی اور کجی کو دور کرنا تو کجا اس سے آگاہ ہونا بھی باعث عار سمجھتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں تندہی سے فکر کرنے اور فیصلہ کرنے میں مدد دینے کے لیے تو ہم آن واحد میں تیار ہو جاتے ہیں مگر اپنی ذات کے فیصلے کے لیے ہمیشہ دوسروں کے محتاج رہنا چاہتے ہیں۔

خود سے اپنے خلاف سزا کا فیصلہ سنانا بہت تکلیف دہ امر محسوس ہوتا ہے اور یہیں سے مسائل کا نکتہ آغاز ہوا کرتا ہے' ہمیں لازمی طور پر ایمانداری سے کچھ بے ضرر سے اعترافات کر لینے چاہئیں۔"

ان کی پر حرارت انگلیاں دھیرے دھیرے اس کے الجھے بکھرے بال سلجھا رہی تھیں' ان کے لہجے میں بہت محبت اور روانی تھی۔

"میرا خیال تھا تم میرے مزاج اور عادات و شخصیت کے ٹھہراؤ سے الرجک ہو' اسی لیے مجھ سے دور دور رہتی ہو' تمہیں اپنے مزاج کے مطابق ایک ہنس مکھ اور باتونی قسم کا جیون ساتھی ملنا چاہیے تھا مجھ جیسے خشک اور "کتابی" بندے سے تمہارا مزاج کیسے میل کھا سکتا ہے' اسی وجہ سے میں نے دل کی خواہش اور پکار کے برعکس تم سے گریزاں رہنے کی پالیسی اپنائی تھی' مجھے کیا خبر تھی کہ فریق ثانی بھی انہی خدشات اور بدگمانیوں کا شکار ہے۔"

زویا ہکا بکا ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی' "اف خدایا اتنی سی بات تھی اور میرا دل اندیشوں' واہموں کے اندر ہچکولے ہی کھاتا رہا۔"

"بیلا نے بالکل صحیح کہا ہے' واقعی چراغ تلے اندھیرے والی بات ہے' ہم دوسروں کے مزاج و مسائل کو سمجھنے کے چکر میں اپنی ذات سے بری طرح غافل اور بے نیاز ہو جاتے ہیں' اتنے زیادہ کہ دوسروں کے احساسات تو الف تا یے تک پڑھ سکتے ہیں مگر خود اپنی ذات کے اندر جھانکنے کی زحمت گوارا نہیں

لوگ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے بھی دوسروں کے محتاج رہتے ہیں۔

دیکھ لو انہی چکروں میں ہم دل کی بات ایک دوسرے سے کہنے کی مہلت حاصل کر سکے اور اس کمیونی کیشن گیپ نے دلوں کے شفاف آئینے دھندلا ڈالے۔" وہ تاسف اور ندامت سے کہہ رہے تھے۔

"خیر انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہوگا' میں سمجھتا ہوں میاں بیوی کو سر سے پاؤں تک حتیٰ کہ ہر ہر سوچ کا شراکت دار ہونا چاہیے' دکھ سکھ مل کر شیئر کرنے سے ان سے پیدا ہونے والے بد اثرات شخصیت کو تباہ نہیں کرتے' دل کے دریچے کو تمام تر واہموں اور بدگمانیوں سے پاک صاف ستھرا اور تروتازہ ہونا چاہیے' دل سکھی ہوگا تو سارا بدن سکھ پا جائے گا' دل کی دل میں نہیں رکھنی چاہیے' ایک دوسرے سے کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہیے' اب تو ہم رخصتی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں۔"

بات کے اختتام پر وہ اس کی جانب جھکے تھے اور وہ جیسے شرم سے گلنار ہوتی چلی گئی' یکایک اسے احساس ہوا وہ کس قدر قریب بیٹھی ہوئی ہے ان کے اور اس پر حدت احساس کے پیدا ہوتے ہی اس کے جسم کا سارا خون چہرے پر چھلک آیا' اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا' اس نے ہاتھ سے ہٹا کر اٹھنا چاہا مگر ان کی گرفت سے نجات کا کوئی ذریعہ نہیں مل پا رہا تھا۔

"بیٹھو یہاں' مجھے یقین تو کر لینے دو کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔" ان کی گمبھیر سرگوشی بہت قریب سے سماعتوں میں شہد گھولنے لگی۔

"بہت دیر ہو گئی ہے' امی پریشان ہوں گی۔" وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔

"بھئی اب ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔" ان کی بھرپور نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں' جو ان سے بہت قریب تھا اس وقت۔

"آخر تمہارا اپنا گھر ہے' بیڈ روم بھی تمہارا اور شوہر بھی تمہارا پھر کاہے کو گھبرائی ہو۔" ان کی سرگوشی میں بہت شوخ سی چھیڑ تھی' وہ جیسے حجاب کی انتہا میں ڈوبنے لگی۔

"دل میں چھپائے ہوئے رکھتے ہوئے وہموں کو زبان پر لا کر ان کی کڑواہٹ اور دل کی سیاہی کو دھو لینا چاہیے' ورنہ دل میں بدگمانیوں کا جوہر جمع ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ان سے تعفن اٹھنے لگتا ہے' بس آئندہ سے طے ہے اچھا برا جو بھی محسوس کیا کہہ دیا کریں گے' ٹھیک ہے ناں۔"

انہوں نے اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اونچا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا' وہ بے اختیار نگاہ کترا گئی۔

غیروں سے کہا تم نے' غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا' کچھ ہم سے سنا ہوتا

باہر بیلا پرجوش انداز میں شعر کے مصرعے کی تباہیاں لا رہی تھی۔

"اب تو دل میں کوئی گرہ نہیں ہے ناں؟" ان کی تپش نگاہیں وفور شوق سے اس کے چہرے پر گڑ کر رہ گئی تھیں۔ "مزاج مختلف ہونے سے دل کے فیصلے نہیں بدلا کرتے' کچھ میں کوشش کروں گا خود میں تبدیلی لانے کی' کچھ تم کو محنت کرنا پڑے گی' مگر ہم مل کر رہ کے دکھائیں گے۔"

اور وہ ان کی دیوانہ وار نگاہوں کی گرمی سے پگھلتی ہوئی رخ پھیر کر شرمائے چلی جا رہی تھی' ہر دھند چھٹ کر ہر شے پر نکھار لے آئی تھی۔

--*

عمران ڈائجسٹ کے مقبول ترین
سلسلوں میں سے ایک اور زبردست سلسلہ
نی تیکا
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
۳۷، اردو بازار — کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شازیہ چوہدری

زندگی سونے میں بسر کی سو

تانیہ تو جب سے "خاور ولا" آئی تھی مسلسل تجربے اور تجزیے کی زد میں تھی۔ بقول سلیم کوثر کے یہاں منظر سے پس منظر تک حیرانی ہی حیرانی دیکھنے کو مل رہی تھی اسے۔ نہ یہاں کا ماحول سمجھ میں آتا تھا اور نہ یہاں کے مکینوں کا مزاج پلے پڑتا تھا۔ عجیب پراسرار سی فضا تھی اور عجب کترائے، اکھڑے اجنبی رسمی رویوں والے مکیں۔

"یا خدا! کہاں پھنس گئی ہوں میں۔" ایف ایس سی پری میڈیکل کر کے آگے میڈیکل میں اپلائی کر دیا اور خوش قسمتی سے اس کا لاہور میں فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا۔ مسئلہ رہائش کا تھا لاہور میں اس کے ڈیڈی کے دور کی جان پہچان کی ایک عزیزہ ساجدہ بیگم رہتی تھیں۔ پھر حسن اتفاق کہ ساجدہ بیگم کی بہو شیریں کے میکے والوں کی تانیہ کی امی سے بڑی اچھی سلام دعا تھی لہٰذا انھوں نے خوش دلی سے اپنے ہاں ٹھہرانے پر اصرار کیا۔ کالج کے ہاسٹل میں فی الحال دو ماہ سے قبل رہائش کے لیے کوئی کمرہ خالی نہ تھا سو اس وقت تک کے لیے اس کی رہائش گاہ "خاور ولا" قرار پائی تھی۔ یہاں آکر شروع شروع میں تو خوب گھبرائی نئی جگہ، نئی درس گاہ، نیا ماحول مگر پھر وہ بتدریج ایڈجسٹ

مکمل ناول



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو گئی۔ کالج میں ہم مزاج دوستیں بھی مل گئیں اور اساتذہ سے بھی جھجک اور اجنبیت دور ہو گئی۔ البتہ "خاور ولا" میں وہ جتنا وقت گزارتی وہ قدرے بے سکونی اور بے چینی ہی میں کٹتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ انفرادی طور پر ان کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا' ہر شخص نے اپنی جگہ خوب آؤ بھگت کی تھی اسے ذاتی طور پر کوئی تکلیف' یا پرابلم نہیں تھی۔

جو چیز اس کے اعصاب پر کوڑے کی طرح برستی تھی وہ اہل خانہ کے سرد مہر انداز' خشک اور پرتکلف رسمی رویے اور ایک دوسرے سے بدگمانی اور کدورت کے جذبات تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ ایک دوسرے سے بدگمان اور شاکی نظر آتا تھا اور اس بدگمانی اور تنفر کا اصل منبع یا دوسرے لفظوں میں وجہ تنازعہ اس گھر کے سربراہ خاور مغل کا سرد' سنگین اور سپاٹ رویہ تھا۔

ایک نظر دیکھنے میں بڑے گریس فل اور بردبار لگتے تھے مگر ان کے چہرے سے برستا رعب' دبدبہ' سختی اور تندی ان کی شخصیت کو مقابل کے لیے بڑی ہیبت ناک' پرجلال اور درشت مزاج بنا دیتی تھی۔ ان کی آنکھوں کا سرد مہر' روکھا پھیکا تاثر جیسے رگوں میں دوڑتا خون منجمد کر دینے کا باعث بن جاتا تھا۔

ان کے اس سخت گیر اور چٹان صفت مزاج کی بدولت اماں جی (ساجدہ بیگم) تک اپنا اصل مدعا و منتہا پیش کرتے وقت گھبرا جایا کرتی تھیں۔ حالانکہ بظاہر وہ کہتے کسی کو بھی کچھ نہیں تھے۔ نہ چیخ چلا کر برہم مزاجی کا اظہار کرنے کی عادت تھی وہ ٹھیک ٹھاک کم گو تھے مقابل کو بے اوسان کرنے کے لیے ان کا دھیما مگر دوٹوک حتمی سرد و سپاٹ لہجہ ہی کافی ہوتا تھا۔ جس کے آگے اماں جی کی بھی کم ہی چلتی تھی۔

"گورکس کدھر ہے؟ بے بی نیند سے جاگ گئی ہے۔" چھ ماہ کی زینی کاٹ میں پڑی ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی رونے کی تیاریوں میں تھی۔ خاور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے سوٹڈ بوٹڈ ہو کر تیار کھڑے اپنا جائزہ لیتے ہوئے برش کر رہے تھے۔ اماں کو کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے پا کر استفسار اور اطلاع کا کام انجام دیا۔

"ادھر کاشی کا یونیفارم بدلوا رہی تھی۔ ابھی ہی ہو گی۔" اماں جی کاٹ کی طرف بڑھیں۔

"اس کی ماں کہاں چلی گئی؟ ایسی عورت پر چھوڑے ہوئے ہیں بچے اتنی ننھی سی جان کو یوں بلکتا چھوڑ کر جانے والی ماؤں کے کلیجے جانے پتھر کے ہوتے ہوں گے۔ ہم سے تو ایسی سنگدلی کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔" وہ زینی کو گود میں لے کر تھپک رہی تھیں ساتھ ساتھ با آواز بلند بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"جیسے اولاد نہ ہوئی کھلونا ہو گیا۔ فرصت ملی تو گلے سے لگا کر چوم چاٹ کر دو منٹ کو اپنا دل بہلا لیا ورنہ پنگھوڑے میں پھینک سج سنور کر بازاروں ہوٹلوں کی سیر کو نکل لیے۔" اماں جی صاف انہیں سنا رہی تھیں۔

جواب میں خاور نے ٹھٹک کر مڑتے ہوئے بے حد سلگتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا۔

"بحیثیت انسان ہر فرد کو اپنی مرضی سے آزادی سے جینے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ آپ کی بہو کوئی دنیا سے انوکھا کام تو نہیں کر رہی۔"

ان کے اکل کھرے انداز پر ماں جی نے بے حد برا مان کر ان کی شکل دیکھی۔

"آزادی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بندہ گھر بار کو چولہے میں جھونک دے۔ بھلا بتاؤ سارا سارا دن گھر سے باہر گزار دینا' اولاد کو کسی غیر کے بھروسے پر چھوڑ جانا گھر میں آئے گئے سے ملنے ملانے کے اوقات میں گھر سے غائب رہنا کسی عورت کو زیب دیتا ہے۔ کیا اس طرح گھر چلا کرتے ہیں؟" وہ بگڑ رہی تھیں۔

"وہ جس ماحول اور جس گھر سے آئی ہیں وہاں ایسے ہی چلتا ہے اس میں ان کا کیا دوش۔" ان پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

اماں جی بل کھا کر رہ گئیں۔ "چڑیل نے کیسے میاں کو اپنے حسن کے جال میں پھانسا ہوا ہے کہ دو لفظ نہیں سن سکتا اس کے خلاف۔"

"مگر شادی کے بعد عورت کو نئے ماحول کے مطابق اپنے شوہر کے لیے خود کو بدلنا پڑتا ہے۔"

جواب میں ایک استہزائیہ مسکراہٹ خاور مغل کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

"ہر پیکر میں لچک نہیں ہوا کرتی اماں جی' یوں بھی شادی سے پہلے اسی روپ میں آپ لوگوں نے انہیں پسند کیا تھا یا انہیں پہلے بتا دیتیں کہ شادی کے بعد تمہیں اس پیکر میں ڈھلنا ہو گا اب تو کچھ نہیں ہو سکتا اماں۔"

اماں جی زچ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"خیر سے گئیں کہاں ہیں؟" انہوں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

"ظاہر ہے حسب سابق ویمن کلب کی کسی تقریب میں۔"

"ایک تو ان بیگم صاحبہ کے سوشل ورک' اور پارٹیاں ڈنر ہی کبھی ختم ہونے کو نہیں آتے۔" وہ پھر پٹری بدلنے لگیں "آئیں گی کب ملکہ عالیہ۔"

وہ خود پر کنٹرول کے باوجود طنزیہ لب و لہجہ ترک نہیں کر سکتی تھیں۔

"ڈنر کے بعد۔" انہوں نے اطمینان سے تیار ہو کر ایک الوداعی جائزہ لیا اور پرفیوم اسپرے کرنے لگے۔ ادھر اماں جی کلس کر رہ گئیں۔

"ان کی واپسی تو آدھی رات کو ہو گی اور ادھر جو فریال کو دیکھنے کے لیے شام میں کچھ لوگ آ رہے ہیں ان سے بات وات کون کرے گا؟ دیکھو لو اب ذرا بہو صاحبہ کی نافرمانیاں۔"

حالانکہ کل سے بتا رکھا ہے بلقیس نے کہ کل فریال کے سلسلے میں کچھ لوگ آ رہے ہیں آپ اور خاور گھر پہ ہی رہیے گا۔ بڑے ٹھسے والے ہیں' ان کے ہاں کی خواتین بھی بہو اور اس کے میکے والوں کی طرح گٹ پٹ گٹ پٹ انگریزیاں بولتی ہیں۔ بلقیس نے کہا بھائی اور خاور ہوں گے تو ان کو آرام سے سنبھال لیں گی۔ ان پر بھی رعب رہے گا کہ ہم بھی کچھ کم نہیں اب بتاؤ اپنے للو پچو کاموں کے لیے تو ان کے پاس فرصت ضرور ہے اور گھر کی اہم ذمہ داری میں ہاتھ بٹانے کا کوئی خیال نہیں۔"

"مجھے ایک بہت ضروری بزنس ڈیلنگ کرنی ہے۔ میں تو ادھر جا رہا ہوں بشیر میرا بریف کیس گاڑی میں رکھ دو' دیکھو صمد نے گاڑی اچھی طرح صاف کی ہے یا نہیں۔" اماں جی جل کر کوئلہ ہی تو ہو گئیں۔

"دونوں میاں بیوی کو اپنے اپنے کاموں کی پڑی ہے اور ادھر بیوہ معذور بہن کی بیٹی کے مستقبل کی کچھ پروا نہیں' ماں کی تکلیف کا کچھ احساس نہیں' شاباش ہے بچے۔"

مگر ادھر کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا ان کے واویلے کا' مدت ہوئی ایسی باتوں پر انہوں نے سیریس ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"رشتے جوڑنے بنانے کے کام میں آپ سے زیادہ مہارت کس کو ہو گی۔ یہ محاذ آپ لوگ خود ہی بخوبی سنبھال لیجیے گا مجھے تو ویسے بھی ایسے کاموں کا سنس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول
دل پھولوں کی بستی — 400/
جو بچھڑے تو بہاروں کو ڈھونڈ — 150/
وہ جنگل سی دیوانی سی — 400/
[illegible] — 300/
ایمان امید اور محبت — 180/
خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا — 600/
خوبصورت سرورق' آفسٹ پیپر' خوبصورت چھپائی
شائع ہو گئے ہیں
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی
لاہور اکیڈمی' سلطان نیوز ایجنسی' عظیمیہ اینڈ سنز' اسلامیہ کتب خانہ
اشرف بک ایجنسی' مہران نیوز ایجنسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں۔"

ان کے بے گانہ سے روکھے پھیکے انداز پر ایک لمحے کو لاؤنج میں ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتی ثانیہ ششدر سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اماں جی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ثانیہ کے پاس آ بیٹھیں۔

"جانے کون سی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے ــــ اپنے حسن سے میرے بیٹے کو اپنے قابو میں کر لیا ہے کہاں اتنا فرمانبردار' اتنا خیال رکھنے والا ہوا کرتا تھا' یہ حیثیت رہ گئی ہے ماں کی' دوسروں کی بھی تو بہوئیں ہیں راج کرائی ہیں سسرال کو' اور فالتو میں رعب بھی سہتی ہیں میں نے تو اتنی نرمی اتنی محبت' اتنے لاڈ پیار سے رکھا ہوا ہے۔ اتنے تو اس کے نخرے ہیں' اپنے میکے کی امارت اور تعلیم کا ہم پر کیا احسان ہے۔ ہوں گے امیر وہ اپنی جگہ ہم کیا کسی سے کم ہیں۔ جب ہماری ہی خوشی غمی میں شریک نہیں تو ہمیں اس کی صورت اور امارت کا چاٹنا ہے؟ میرے خاور پر تو جیسے سحر پھونک دیا ہے اس خوب صورت چڑیل نے۔"

شام کو فریال کو دیکھنے کے لیے آنے والے مہمانوں کے ساتھ کیا ڈیلنگ ہوئی اس کا تو ثانیہ کو پتا نہ چل سکا کیونکہ وہ کالج چلی گئی تھی البتہ رات کھانے پر شہرین کے ماتھے کی تیوریاں' بلقیس آپا اور اماں جی کے پھولے پھولے چہرے دیکھ کر خاصی حد تک اندازہ ہو گیا کہ بہر حال کوئی گرما گرمی ضرور ہوئی ہے یا پھر متوقع ہے۔

"یہ مجھ بد نصیب کی تقدیر تھی کہ خاوند حادثے میں چل بسا اور میں ٹانگیں کٹوا بیٹھی چھ ننھی جانوں کی ذمہ داری میرے میکے پر آ پڑی مجھے تو بڑا مان تھا بڑا آسرا تھا کہ بھائی میرے بچوں کو پھولوں کی طرح رکھے گا۔ مجھ کم بخت کو کیا خبر تھی بیوی کے آجانے کے بعد بھائی کی نظر بدل جائے گی۔ اب اس جوگی بھی نہیں ہوں کہ محنت مزدوری کر کے ہی بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ پڑی ہوں بھائی کے در پر لاوارثوں کی طرح بچوں کا آگا پیچھا کون دیکھے گا۔ ان بد نصیبوں کا کون والی وارث ہو گا سوچا تھا اب یہ فکریں بھائی بانٹ لے گا۔ اللہ نے پیسہ بھی کھلا دے رکھا ہے بادشاہوں کے محل جتنا گھر ہے جگہ مل ہی جائے گی مگر جب دل ہی تنگ پڑ جائیں تو محلوں کو کیا کرنا۔"

بلقیس آپا بڑی دلسوزی سے بغیر کسی کو مخاطب کیے کہہ رہی تھیں۔ جواب میں خاور مغل کی فراخ پیشانی پر بل پڑتے ثانیہ نے صاف دیکھ لیے تھے۔ شہرین تو ناک بھوں چڑھا کر نہایت بے نیازی کے عالم میں دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی۔

"میرے حساب سے آپ لوگوں کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے آپ کے نام سے آپ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ہر ماہ ایک کثیر رقم جمع کرواتا ہوں اس کے علاوہ آپ کے ہر بچے کا جیب خرچ باقاعدگی سے ہر ماہ انہیں مل جاتا ہے' آپ کے بچے شہر کے بہترین انگلش میڈیم اسکول میں زیر تعلیم ہیں ان کے جوتے کپڑے دیگر ضروریات کے لیے علیحدہ سے رقم مختص کر کے اماں جی کے حوالے کرتا ہوں اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر آپ میرے سیکرٹری مختار اعوان صاحب سے کسی بھی وقت جتنی چاہیں رقم نکلوا سکتی ہیں۔ گھر میں آپ سمیت آپ کے ہر بچے کے لیے علیحدہ بیڈ روم ہے' آپ کی آسانی کے لیے آپ لوگوں کا پورشن باقی گھر سے الگ بنایا ہوا ہے' آپ کی خدمت کے لیے چوبیس گھنٹے ملازم موجود رہتے ہیں' گھر میں اس کے علاوہ بھی آپ لوگوں کی چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو شکوہ ہے تو میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

ان کے مدلل دو ٹوک' حتمی انداز پر اماں جی سمیت بلقیس آپا جز بز سی ہو کر رہ گئیں۔

"بیٹے یہ صحیح ہے تم نے ہر طرح سے بیوہ معذور بہن اور بوڑھی ماں کے آرام کا خیال رکھا ہوا ہے مگر بچے روپے پیسے اور عیش و آرام کے علاوہ بھی بندے کی ہزار ضروریات ہوتی ہیں۔ ہم لوگ ترستے رہ جاتے ہیں کہ تم دو گھڑی کو ہمارے پاس بیٹھو مل کے ہم اپنے دکھ سکھ کی باتیں کریں۔ ہنسیں بولیں۔ بہو نے تو خیر قسم کھائی ہوئی ہے۔ دکھ سکھ میں شریک نہ ہونے کی۔ مگر تم تو ہمارے اپنے ہو' ہمیں تو یوں لگتا ہے تم ہمارے درمیان رہتے ہوئے بھی ہمارے نہیں ہو۔"

جواب میں خاور مغل نے یکے بعد دیگرے بہن اور ماں پر گہری نظر ڈالی اس چپ چپ سی نگاہ میں عجب تمسخر' طنز اور آزردگی تھی۔

"اس دور میں سب سے بڑی ضرورت جسمانی تسکین ہی ہے' پیسہ ہے تو اس سے من پسند کھانے کھائے جا سکتے ہیں رقم ہاتھ میں ہے تو پورا بازار خریدا جا سکتا ہے جیب گرم ہے تو بادشاہوں جیسا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے سب کچھ مایا ہی ہوتی ہے آپ کے پاس پیسہ موجود ہے اس سے جو جی چاہے خریدیں۔"

"مگر انسان کا نعم البدل پیسہ نہیں ہوا کرتا۔" اماں جی کو دلی رنج پہنچا تھا بیٹے کے جذبات سے عاری انداز پر۔

"اچھا۔" ان کی نظریں جیسے ماں کی نظروں میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

"یہ سب پرانے زمانے کے خیالات ہیں اماں جی! انسان چاہے تو پیسے کے بل پر انسان کو بھی خرید سکتا ہے۔"

"اس کے جذبات اس کے دل کو تو نہیں خرید سکتا ہے نا۔" ثانیہ کہنا چاہ رہی تھی مگر صورت حال کو دیکھتے ہوئے دل میں ہی دبا کر رہ گئی اپنا خیال یوں بھی وہ خاور مغل سے براہ راست کبھی مخاطب نہیں ہوئی تھی اور بڑی بات تو یہ تھی نہ ہی اس کی اتنی ہمت پڑتی تھی۔

"بہو اگر تم تھوڑا سا وقت نکال کر آجاتیں مہمانوں سے مل لیتیں تو کیا حرج تھا۔"

اماں جی اپنی مالدار' طرح دار' بے پناہ حسین بہو کو سیدھا سیدھا آڑے ہاتھوں تو نہیں لے سکتی تھیں۔ اس لیے دبے دبے انداز میں اپنی خفگی جتا رہی تھیں۔

"میں نے کوشش کی تھی آنٹی مگر ٹائم نہیں ملا۔" وہ بظاہر نہایت رسانیت سے کہہ کر اٹھ گئی تھی۔ پھر رات کو ثانیہ کے ساتھ باہر واک کرتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ہاں میں کروں ناں ان کی خاطر داریاں' پاس داریاں جیسے مجھے تو پھولوں کی سیج پر بٹھایا ہوا ہے۔ جادو گرنی نے میرے شوہر کو قبضے میں کر رکھا ہے' اسے میرا ہونے ہی نہیں دیا جب پھل کھانے ہی اپنے نصیب میں نہیں ہیں تو پتوں شاخوں کی دیکھ بھال کر لینے سے کیا حاصل۔"

"کیا مطلب بھابھی؟" وہ ہونق سی شہرین کو دیکھنے لگی "کیا خاور بھائی آپ کے ساتھ اچھے نہیں ہیں؟ ساجدہ آنٹی کا کہنا تو یہ ہے کہ آپ کی کشش نے خاور بھائی کے مزاج بدل دیے ہیں۔" ثانیہ کو خاصا تعجب تھا۔

"ہونہہ' بڑھیا کے دماغ میں تو خناس بھرا ہے۔" شہرین چیخ چیخ گئی تھی۔

"میاں میرا ہے اور ناز نخرے ماں بہن کے اٹھاتا ہے' ارے مجھے تو ایک ایسی ساعت نصیب نہیں ہوئی ان پانچ سالوں میں جس میں دل کو یہ یقین ہوا ہو کہ خاور صرف اور صرف میرے ہیں۔ میرے تو وہ بنے ہی نہیں ہیں کبھی' جانے فطری جذبے کیسے قریب لے آئے جو کاشی اور زینی کی صورت میں میرے سونے آنگن میں دو پھول کھل گئے' ورنہ اس پتھر صفت بے حس انسان کے قرب میں شاید ساری عمر کے لیے پیاسی بیٹھی رہتی۔"

ثانیہ جیسے سناٹے میں آگئی۔ شہرین کے چہرے پر بولتی نارسائی' تشنگی اور حسرت پکار پکار کر اس کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔

"تو بھابی! آپ خود کو بدل کر دیکھ لیں ہو سکتا ہے آپ کا موجودہ روپ ان کی پسندیدگی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ میرے پڑوس میں ایک آنٹی رہا کرتی ہیں۔ ہیں تو بالکل ینگ مگر میں انہیں شروع سے آنٹی ہی کہتی رہی ہوں' نمو آنٹی' وہ کہا کرتی ہیں تعلقات استوار کرنے کی پہلی سیڑھی caring behavior (دوسروں کا خیال رکھنا) Sharing and ہوا کرتا ہے آپ ان کو کھولیں ان کے دل کی بات انہیں زبان پر لانے کا موقع دیں پھر اس کے مطابق ان کے مطلوبہ روپ میں ڈھل جائیں۔"

شہرین نے ملول سے انداز میں اس کے گلابی رخسار تھپکے۔

"ارے ثانیہ ڈیئر! تم نہیں جانتیں خاور مغل کا دل ایک ایسا بند قلعہ ہے جس میں داخل ہونے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے کوئی دراڑ نہیں ہے جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکے۔ اس کٹھور شخص کا دل جیتنا ناممکن ہے میں ان پانچ سالوں میں ہر حربہ اپنا چکی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے وہ کسی سے...." ثانیہ نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ کر شہرین کی طرف دیکھا۔

وہ مضمحل سے انداز میں مسکرا دی۔

"ایسا بھی کچھ نہیں ہے میں الف تا یے اس کی ہسٹری پڑھ چکی ہوں کھنگال چکی ہوں۔ اس نے ساری زندگی نہ کوئی دوست بنایا نہ راز دار بزنس اور صرف بزنس اہم ہے اس کے لیے ہر شے سے بڑھ کر میں نے اکثر اوقات خفیہ طریقے سے اس کی باہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھی ہے۔ اس کی کالز اس کے آفس کا ماحول ہر شے چیک کر ڈالی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا بھلا بتاؤ جس شخص نے ساری عمر کسی مرد سے بھی دوستی نہ کی ہو وہ عورت سے کیا تعلق رکھے گا۔ حتیٰ کہ امریکہ جیسے آزاد خیال ملک میں دو سال گزارنے کے باوجود اس کے سرد پتھر جیسے دل کو جذبات کی آنچ نہیں پگھلا سکی۔ اب تو میں ہر طرف سے مایوس ہو چکی ہوں ثانیہ۔"

ثانیہ الجھ سی گئی تھی۔ خاور مغل کی شخصیت اسے اول روز سے بڑی پراسرار اور حیرت دار سی لگتی تھی۔ یوں جیسے پرانے طرز کی بنی ہوئی کوئی خوب صورت سی آسیب زدہ حویلی ہو جسے دور سے دیکھ کر جسم و جاں میں پھریری سی دوڑ جاتی ہو۔ وہ ان سے اچھا خاصا خائف رہتی تھی اور اب تو مزید ہراساں سی ہو گئی تھی۔

"ارے کہاں نکل رہی ہو تم؟" صائمہ اور راضیہ دونوں جڑواں تھیں اور میٹرک کے پیپرز دے کر ابھی فارغ ہوئی تھیں خصوصی اہتمام سے تیار ہو کر بشیر کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہی تھیں۔ جب ساجدہ بیگم نے پیچھے سے کڑک دار آواز میں استفسار کیا۔ ان کی آنکھوں میں ناگواری اور غصہ تھا۔

"یونہی نانی جان ذرا آؤٹنگ پہ جا رہے ہیں۔" صائمہ نے بوتیک کا ڈیزائن کردہ نئے نویلے پیور کاٹن کے جدید کڑھائی والے سبز سوٹ کے کلف زدہ اکڑے ہوئے دوپٹے کو ایک سائیڈ پر کرتے ہوئے بڑے لاپروا سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"کون سی آؤٹنگ ہوتی ہے اس وقت شام سر پر ہے۔ اور جوان جہان لڑکیاں اکیلی نکل رہی ہیں بن سنور کر چلو بیٹھو گھر آرام سے۔"

"ارے چھوڑیے بھی نانی جان کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہیں۔" راضیہ نے اپنے بوب کٹ بالوں کو مرر میں دیکھنے کے بعد نانی کے کندھوں کو ہلکا سا چھوا اور پھر بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ساجدہ بیگم تلملا کر انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔

"دیکھ لو کس قدر خود سر ہے یہ اولاد تمہاری نہ شرم نہ حیا دیدوں کا پانی ہی ڈھل گیا ہے۔ ایک وہ لڑکا ہے اطہر سارا سارا دن بائیک اڑاتا رہتا ہے۔ خبر جو ہے ماموں کے پاس تجوریاں بھری ہوئی ہیں۔ مفت کا پیسہ ہے سو برباد کر رہے ہیں بڑی فریال ہی کو دیکھ لو۔ نوکری کی تو شور مچا دیا کہ مجھ سے صبح شام ٹیکسیوں ویگنوں پہ دھکے نہیں کھائے جاتے اور ماموں سے فرمائش کرکے نئی سوزوکی کار لے لی۔ اب صبح سے نکل پڑتی ہے اور شام گئے سارا پیٹرول پھونک کر نوابوں کی طرح ٹھاٹھ سے گھر واپس آتی ہے نہ کوئی پوچھنے والا نہ بولنے والا۔"

"روک ٹوک اور پوچھ گچھ تو گھر کے مرد ہی تو کیا کرتے ہیں یہاں ماموں کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ شتر بے مہار نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے میں معذور مجھ سے کون ڈرے۔ ماموں نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ سو بگڑیں گے نہیں تو اور کیا ہو گا۔" بلقیس آپا ماں کے واویلے پر سارا دوش بھائی کو دے رہی تھیں۔

"اس کے پاس تو ایک ہی جواب ہوتا ہے روپے پیسے کی کھانے پینے کی عیش آرام کی تنگی ہے تو مجھ سے

کہیں باقی باتوں کے لیے میں ذمہ دار نہیں ہوں۔"

"جانے وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے' وہ تو بڑا لحاظ والا بڑے احساس والا ہوا کرتا تھا۔" بلقیس کو بھائی کے رویوں پر سخت ملال تھا۔

تانیہ بائیو کی ڈایا گرام بناتے ہوئے چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی اس کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔



"ارے جانو' چندا میری' جلدی سے چپ ہو جاؤ ابھی آیا آ رہی ہے۔" آں آں کرتی ہاتھ پاؤں مارتی زینی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے وہ لان میں ٹہل رہی تھی' جب اندر سے خاور مغل نکل کر پورچ کی سمت بڑھتے نظر آئے۔

تانیہ نے ایک لحظہ کو اپنی توجہ زینی سے ہٹا کر ان کی جانب مبذول کی۔

سلور گرے تھری پیس سوٹ میں وہ تک سک سے تیار بڑی شان بے نیازی سے پُر اعتماد مضبوط چال چلتے ہوئے سفید کرولا تک آئے تھے۔ براؤنش بلیک گھنے بالوں کا گچھا بڑے اسٹائلش انداز میں ان کی پیشانی پر پڑا ہوا تھا۔

"نجانے کتنے دل تو اسی گچھے میں اٹک گئے ہوں گے۔" اس نے بے خیالی کے عالم میں سوچا تھا۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کچھ سوچ کر وہ رک گئے۔

"ہیلو بے بی کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" انہوں نے رسماً پوچھ لیا۔

"فائن۔" وہ ان کی موجودگی میں ہمیشہ کی طرح گھبرا کر بوکھلا سی گئی تھی۔

"اسٹڈی کیسی جا رہی ہے؟" انہوں نے یونہی پوچھ لیا' بایاں ہاتھ گاڑی کا لاک کھول رہا تھا۔

"ٹھیک ٹھاک۔" تانیہ کو جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑے الجھے الجھے سے ہوں۔ ان کی گہری بھوری آنکھوں میں عجیب سی سرخی جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بابت پوچھنا چاہ رہی تھی مگر اتنی ہمت کہاں سے لاتی۔

"نو پرابلم۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے اسی نارمل سے انداز میں اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر سوال کیا اور اس کے سر نفی میں ہلا دینے پر زن سے گاڑی نکال کر لے گئے۔

وہ زینی کو لوری دیتے ہوئے کتنی ہی دیر ان کے بارے میں سوچتی رہی۔ یونہی بے دھیانی کے عالم میں ان کے رویوں کا تجزیہ کرتی رہی۔

رات کو پڑھتے پڑھتے پیاس لگی۔ اپنے فریج میں جھانکا اتفاق سے دونوں بوتلیں خالی تھیں۔ وہ گلاس اٹھائے باہر آئی۔ لاؤنج سے گزری تو لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر آ گئی۔

صوفے میں دھنسے' منہ میں سگریٹ دبائے بظاہر تو وہ ٹی وی کی سمت متوجہ تھے مگر ذہن جانے کن بھول بھلیوں میں گم تھا۔ جسم پر قیمتی سلیپنگ گاؤن لپٹا ہوا تھا۔ لاؤنج کی فضا میں سگریٹ کی مہک کے ساتھ ساتھ ان کے مخصوص پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو شامل تھی۔

اس نے مڑ کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے باقی پورا گھر نیند کی آغوش میں تھا۔

معاً" ان کی نظر اس پر پڑی۔ وہ قدرے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے' تانیہ خجل سی ہو کر آگے بڑھ آئی کہ اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں تھا۔

"آپ سوئے نہیں ابھی تک خاور بھائی۔" تھوک نگل کر ہاتھ میں پکڑے گلاس کے کناروں پر مضبوطی سے انگلیاں جماتے ہوئے اس نے انہیں مخاطب کیا' انداز میں جھجک تھی۔

"نہیں۔۔۔" اس سے مختصراً" جواب کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جم گئی تھیں۔

کچن میں گئی تو پانی پینے کے بعد اپنے لیے کافی بنائی اور ساتھ میں ازراہ ہمدردی ان کے لیے بھی بنائی۔

"تھینکس۔" بے تاثر سے انداز میں کہہ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا پھر اخلاقاً" سامنے والی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

تانیہ کا ارادہ ایسا نہیں تھا مگر پھر کچھ سوچ کر احتیاط سے بیٹھ ہی گئی۔ وہ مکمل طور پر ٹی وی کی جانب متوجہ تھے شاید بی بی سی لگا ہوا تھا تانیہ نے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

کتنی شاندار پرسنالٹی ہے مگر آنکھوں اور چہرے پر اتنی بے گانگی کیوں ہے' ہونٹوں پر اپنائیت آمیز مسکراہٹ کے نشان کیوں نہیں ملتے۔ مجھے ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے مگر میں نے ابھی تک ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی جھلک بھی نہیں دیکھی نہ ماں بہن کے لیے' نہ بیوی بچوں کے لیے نہ کسی دوست آشنا کے لیے' کتنے بند بند سے لگتے ہیں دیکھنے میں' شیریں بھابی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہیں۔ لیکن پھر بھی ہیں تو انسان ہی ناں' ممو آنٹی کہا کرتی ہیں خدا نے کسی شخص کو پیدائشی برا نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ کو تو اپنی ساری مخلوق سے برابر کا پیار ہے انسان کے اچھا برا ہونے میں سب سے پہلے ماں باپ کی دی گئی تربیت اس کے بعد ارد گرد کا ماحول اور پھر معاشرے کے افراد ہوا کرتے ہیں' ان کے ساتھ ایسا کیا مسئلہ ہے؟ ماں خائف' بہن شاکی' بیوی مظلوم' بچے توجہ کے منتظر اور ایک یہ ہیں ہر شے بھلا کر صرف بزنس میں گم رہتے ہیں۔

"آپ کو کسی قسم کا کوئی مسئلہ تو نہیں ہے یہاں۔" وہ اپنے دھیان میں نہایت انہماک سے ان کو پڑھ رہی تھی جب دفعتاً اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا تھا۔

ایک لمحے کو تانیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا' چوری پکڑے جانے کے خیال سے چہرے پر خفت کی سرخی چھا گئی۔ خاور مغل نے ایک لحظہ کو اس سترہ اٹھارہ برس کی دوشیزہ کا معصومیت اور سادگی کے رنگوں سے سجا دلکش کومل گلابی چہرہ دیکھا پھر بے تاثر انداز میں نگاہ ہٹالی کہ نظر کے اس تصادم نے تانیہ کی پیشانی عرق آلود کر دی تھی۔

"جج۔۔۔ جی نہیں تو۔"

"ہوں۔۔۔" وہ مکمل طور پر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے اصولاً" اب اسے اٹھ جانا چاہیے تھا اس کا یہاں کوئی کام نہیں تھا۔

"خاور بھائی! آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر جانے کیوں ایک قدم آگے بڑھا کر بے ساختہ رک کر پوچھ بیٹھی تھی۔

جواب میں انہوں نے صرف بھنویں اٹھا کر مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر کہنے لگی۔ "خاور بھائی میں نے اکثر محسوس کیا ہے جیسے آپ کو خدانخواستہ کسی الجھن کا سامنا ہے۔ آپ کے انداز میں بڑی بے کلی اور اضطراب سا پایا جاتا ہے۔ جس سے لگتا ہے آپ کو کوئی پریشانی ہے۔"

اس کے خاموش ہونے پر خاور مغل نے چونک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اتنی معصوم سی' چھوٹی سی سادہ سی لڑکی محسوسات کے اعتبار سے اتنی پختہ بھی ہو سکتی ہے۔

"نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ جا کر آرام کیجیے۔" ان کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ اسے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دبے قدموں وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فاطمہ! ایک کپ چائے بنا دینا اسٹرانگ سی۔ سر میں بہت درد ہے۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔" وہ بعجلت کچن کے دروازے سے ہانک لگا کر بڑھ گئے تھے یہ دیکھے بغیر کہ کچن میں ماسی نہیں تانیہ کھٹر پٹر کر رہی ہے۔

اپنے لیے دوپہر کا کھانا نکالتی تانیہ نے اپنا کام روک کر ان کے لیے چائے بنائی اور مدھم سی دستک دے کر ان کا جواب ملنے پر اندر چلی آئی۔

"ارے آپ نے کیوں زحمت کی۔" وہ ٹائی ڈھیلی کیے اپنے اسی فارمل ڈریس میں ایزی چیئر پر دراز تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

انداز میں بہت تھکن اور کسلمندی نمایاں تھی۔
"کوئی بات نہیں۔" اس نے کپ انہیں تھمادیا۔
"خاور بھائی! آپ اتنے تنہا اتنے آدم بیزار سے کیوں رہتے ہیں سب سے الگ تھلگ اپنی ہی دنیا میں گم۔" آج وہ ساری ہمتیں بیدار کر کے بالآخر پوچھ ہی بیٹھی تھی۔
"آپ کا وہم ہے بے بی۔" اس کی بات پر وہ پہلے ٹھٹکے پھر سر جھٹک کر تختی سے کہہ کر چائے کی سمت متوجہ ہو گئے تھے گویا مزید کچھ نہ سننے بولنے کا سگنل دے دیا ہو۔ مگر وہ جیسے طے کر کے آئی تھی۔
"اس طرح کا رویہ تو خود آپ کے لیے بہت پرابلمز کری ایٹ کردے گا آپ بہت اکیلے ہو جائیں گے۔ نمو آنٹی کہا کرتی ہیں ہم معاشرے میں اکیلے نہیں ہوتے ہاں مگر اس وقت جب افراد سے کوارڈینیشن میں خلل واقع ہو جائے اور کمیونیکیشن گیپ پیدا ہو جائے۔"
اس کے سادہ و فطری رواں لہجے پر اور سب سے بڑھ کر اس کے جملوں کے انتخاب پر وہ یکلخت بھونچکا ہو کر حقیقی معنوں میں اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔
وہ ان کے یوں منجمد سا ہو کر گھورنے پر اندر سے ہراساں سی ہو گئی شاید مجھے اتنی جرات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔
"کیا ہو رہا ہے بے بی۔" اس شام وہ لان میں سبزے پر بیٹھی پڑھ رہی تھی جب وہ ادھر چلے آئے۔
"جی۔۔۔ بس پڑھائی، آپ آئیے نا بیٹھیے پلیز۔"
اور تانیہ کو حیرت اس وقت ہوئی جب وہ واقعی لان چیئر گھسیٹ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔
"میں تو بہت بزی رہتا ہوں دھیان نہیں دیا اس پوائنٹ پر آپ کو آؤٹنگ وغیرہ کے لیے جانا ہو تو ضرور بتائیے گا۔"
"خاور بھائی اگر میں یہ کہوں کہ آپ اتنا بزی رہتے نہیں ہیں جتنا کہ خود کو بزی رکھتے ہیں تو۔۔۔" اس نے ان کی دوسری بات گویا سنی ہی نہیں تھی۔
وہ اس بار بڑے زبردست انداز میں چونکے، تانیہ نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خود کو شاباش دی۔ گویا اس کا تکا درست نکلا تھا۔
"آپ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں۔" ان کی پیشانی پر بے شک غصے اور ناگواری کے بل پڑے ہوئے تھے مگر آنکھوں میں گردش کرتی پریشانی اور تعجب بہرحال تانیہ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔ اس کا اندھیرے میں چلایا گیا تیر نشانے پر جا لگا تھا۔
"نمو آنٹی کہا کرتی ہیں جب کوئی شخص زمانے سے خائف ہوتا ہے تو بے گانگی اور غصے کا خول لپیٹ کر قلعہ بند ہو جاتا ہے۔ اس قلعے کو باہر سے دیکھنے والے اسے بڑا مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھتے ہیں جب کہ جو بہادر ہمت کر کے اس کے اندر گھستا ہے وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ جاتا ہے کہ آہنی قلعے کے اندر تو دراصل ریشم جیسی نرمی ہے۔"
"آپ اتنی چھوٹی سی ہو کر اتنی بڑی اور مشکل باتیں کیسے کر لیتی ہیں۔" وہ حقیقتاً متحیر رہ گئے تھے۔
"اس کا کریڈٹ نمو آنٹی کو جاتا ہے، ان ہی کا کہنا ہے کہ شیئر کرلینے سے دکھ آدھا رہ جاتا ہے آپ کے ساتھ اگر کوئی پرابلم ہے تو اسے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیں شہرین بھابی سے شیئر کرلیں آنٹی یا آپا سے کہہ دیں ورنہ آپ پُرپیچ سوچوں کے جال میں الجھتے چلے جائیں گے۔"
اس نے بڑے خلوص سے انہیں مشورہ دیا تھا جس پر جانے انہوں نے عمل در آمد کا سوچا یا نہیں البتہ یہ ہوا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ بڑا اپنائیت آمیز اور کسی حد تک دوستانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی سرگرمیوں میں، اس کے فرصت کے اوقات میں دلچسپی رکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر چھائی سختی اور بے گانگی کا نقاب اس کی موجودگی میں غیر ارادی طور پر سرک جایا کرتا تھا۔
حیرت تو اسے اس وقت ہوتی تھی جب اس نے انہیں۔
"تو کہ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے" یہ دھیرے دھیرے گنگناتے سنا ایک ہی مصرع آنکھیں بند کیے بڑے جذب کے عالم میں وہ اپنی ہی ترتیب دی گئی دھن میں گنگنارہے تھے اور پھر اسے حیرت اس وقت ہوئی، جب ایک دن کشور ناہید کی "بے نام مسافت" سے ایک نظم منتخب کر کے اسے سنانے لگے۔
آگ اور برف کے درمیان پگھلے لاوے کی صورت آنکھیں۔
جو دل کی کہی ان کہی ہوتے دیکھیں۔
بس لیں تو اچھا ہی ہو۔
خواہش کی تحریر سے، زندگی کی روایت نبھاتے بہت مرکز دی۔
بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے خامشی کے کفن میں لپیٹا۔
بس اب راستوں میں درختوں کی پرچھائیوں کا دھواں سمجھ لو وہ دیوار گرتی نظر آرہی ہے۔
"خاور بھائی! آپ اور شاعری۔" وہ استعجابیہ بولی تھی۔
"تم تو یوں حیران ہو رہی ہو گویا شاعری مجھ جیسے بندے کے لیے شجر ممنوعہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔"
وہ بے اختیار مسکرا دیے تھے اور اسی پل اندر داخل ہوتی شہرین گنگ سی رہ گئی۔ اس نے تو کبھی ان کے بھینچے ہوئے پتھریلے عنابی ہونٹوں کے غنچوں کو شگفتگی سے کھلتے نہیں دیکھا تھا۔
"بھابی! ملاحظہ کر رہی ہیں آپ اپنی نیرنگئی فطرت کے کمالات، آج خاور بھائی اپنی پسند کی شاعری سنا رہے ہیں۔" تانیہ نے خوشدلی سے شہرین کو مخاطب کیا تھا۔
"ہاں دیکھ رہی ہوں۔" شہرین کے انداز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا، نظریں خاور مغل کے چہرے پر جمی تھیں جہاں مسکراہٹ یوں غائب ہوئی تھی جیسے کبھی آئی ہی نہ ہو۔
"بلکہ میں تو منتظر ہوں جب یہ خود بھی شاعری کرنے لگیں گے۔ بدلتی رتوں کا کیا پتا چلتا ہے۔"
شہرین کے لہجے کی تلخ اور ترش جھنکار کو تانیہ تو سمجھ نہ سکی اور خاور مغل نے سمجھ کر بھی توجہ نہ دی۔
اس دن صبح سے مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔
اس نے کالج سے چھٹی کا پروگرام بنالیا ٹھنڈ بھی ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔ شام کے اوقات میں یونہی موسم کی خبر لینے وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو دھک سے رہ گئی۔
ایک کونے میں کرسی ڈالے ہلکی نیلی شرٹ اور گرے پتلون میں وہ بڑے سکون و اطمینان سے بیٹھے بھیگ رہے تھے۔ آسمان پر گہری بدلیوں کا رقص جاری تھا۔
"خاور بھائی۔۔۔!" وہ شال اچھی طرح لپیٹ کر شیڈ کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اسے ان سے اس دیوانے پن کی توقع نہ تھی۔
"ہاں آؤ بھئی تانیہ! میں اس وقت تمہاری ضرورت ہی محسوس کر رہا تھا۔" وہ اتنے ایزی ہو کر بیٹھے تھے گویا اپنی خواب گاہ کے پُرسکون ماحول میں ہوں۔
"آپ تو سارے بھیگ گئے ہیں خاور بھائی۔" تانیہ نے فکرمندی سے انہیں دیکھا۔
"ارے یار! مزے میں ہوں۔" انہوں نے اتنی ہی بے فکری سے ہاتھ ہلایا اور اس سے جیسے تانیہ پر بہت کچھ منکشف ہو گیا۔
"خاور بھائی! ایک بات پوچھوں۔"
"پوچھو ضرور پوچھو، لیکن اس سے پہلے میری ایک بات سن لو۔" ان کے انداز میں محسوس کی جانے والی بشاشت تھی جو آن کی آن میں ان کے مزاج پر چھا گئی تھی۔
"جی کہیے۔" اسے خاور مغل بڑے "نئے" سے محسوس ہوئے۔
"تمہارا یہ انداز تخاطب بڑا پیارا اور دلکش لگتا ہے۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ بھی ذرا سا جھینپ کر ان کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔
"بس عادت سی پڑ گئی ہے۔" پھر وہ اپنی بات پر آ گئی، سنبھل کر مخاطب ہوئی۔
"خاور بھائی! آپ کو کوئی دکھ ہے؟"
اس کے غیر متوقع سوال پر استفہامی انداز میں اسے

PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھنے لگے۔

"ممو آنٹی کہا کرتی ہیں جب انسان کو بہت کاری زخم لگے کوئی بڑا روگ یا دکھ جان کو چمٹ جائے تو وہ اسی طرح گرمی سردی اور زمان و مکان کے حساب سے بے خبر ہو جایا کرتا ہے۔" بڑا گہرا نکتہ نکالا تھا اس نے۔

خاور مغل نے ایک گہری سانس لی بولے اب بھی کچھ نہیں۔

"بتائیں نا خاور بھائی کیا ایسی ہی کوئی بات ہے۔" اس نے اب کے بے دھڑک اصرار کیا تھا کہ بہرحال ان کا خاموش انداز کچھ نہ کچھ معانی ضرور رکھتا تھا۔

"تمہارے اس سوال کے جواب میں مجھے بے ساختہ ایک نظم یاد آ رہی ہے۔ کہو تو سنا دوں۔" بالآخر وہ بولے۔

"ہاں ضرور لیکن پہلے یہ وضاحت ضرور کر دیجیے کہ اتنی لمبی ـــــ مصروف زندگی میں شاعری کا شغف کیسے ہوا۔؟" اسے تجسس تھا کہ آیا پہلے سے اس میدان کے شہسوار رہے ہیں یا تازہ تازہ شوق ہوا ہے۔

"جب میں امریکہ میں ہوتا تھا وہاں فارغ اوقات میں اردو ادب سے دل بہلاتا تھا اسی زمانے کی کچھ یادیں رہ گئی ہیں ورنہ اس سے پہلے اور اس کے بعد مصروفیات کے جنگل میں ایسا بھٹکا کہ پھر رستہ ہی نہ ملا بہرحال نظم سنو۔"

پوچھنے والے تجھے کیسے بتائیں آخر
دکھ عبارت تو نہیں ہے جو تجھے لکھ کر دے دیں۔
یہ کہانی بھی نہیں ہے کہ سنائیں تجھ کو
نہ کوئی بات ہی ایسی کہ بتائیں تجھ کو
زخم ہو تو تیرے ناخن کے حوالے کر دیں۔
آئینہ بھی تو نہیں ہے کہ دکھائیں تجھ کو
یہ کوئی راز نہیں جس کو چھپائیں تو وہ راز
کبھی چہرے کبھی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
جیسے آنچل کو سنبھالے کوئی اور تیز ہوا
جب بھی چلتی ہے تو شانوں سے ڈھلک جاتا ہے
اب تجھے کیسے بتائیں ہمیں کیا دکھ ہے

ان کے پرسوز دلکش لب و لہجے کے زیر و بم میں وہ خود کو ڈوبتا محسوس کر رہی تھی نظم سنا کر وہ چپ چاپ سامنے خلا میں تکنے لگے تھے جب کہ وہ ہنوز اس کے سحر میں گم تھی۔

"تو آپ ادھر ہیں۔" اسی لمحے شہرین ادھر آ گئی تھی۔ اس کے لہجے اور چہرے پر کچھ تھا جس نے تانیہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی شرمندہ سا کر دیا۔

"اور ادھر آپ کا موبائل کمرے میں بج بج کر تھک گیا۔" وہ خاور سے ہی مخاطب تھی۔ خاور مغل نے ایک لفظ کہے بغیر موبائل ہاتھ میں لے لیا۔

تانیہ نے جانے کی غرض سے قدم آگے بڑھائے اسی لمحے انہوں نے ماوتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔

"ایک منٹ تانیہ! تم یوں کرو ڈریس چینج کر کے نیچے آ و میں بھی چینج کر کے آتا ہوں باہر چلتے ہیں لانگ ڈرائیو پر واپسی پر آئس کریم کھائیں گے ٹھیک۔" وہ کہہ کر پھر فون کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔

"چلیے بھائی! آپ بھی تیار ہو جائیں۔ اکٹھے چلتے ہیں مزا رہے گا۔" اس نے سیڑھیاں اترتی شہرین کو مخاطب کر کے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی دعوت تمہیں ملی ہے لانگ ڈرائیو اور آئس کریم کھانے کی تم ہی جاؤ میرے ساتھ تو ایسا نادر روزگار واقعہ کبھی نہیں ہوا۔"

شہرین کے کڑوے کسیلے تلخ انداز میں کیا تھا بدگمانی، تمسخر، طنز، جلاپا اس کے لہجے کی کاٹ نے تانیہ کو چند ساعت کے لیے گم صم سا کر دیا۔ بہرحال بچی تو نہیں تھی جو شہرین کے حاسدانہ تیور نہ سمجھ سکتی۔ اس کا خاور مغل کے ساتھ یوں اتنے حسین موسم میں تنہا گھومنا پھرنا یقیناً "بیوی ہونے کے ناتے اسے شاق ہی گزرنا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر تانیہ نے ٹال مٹول بھی کرنا چاہی مگر خاور مغل نے ایک نہ سنی وہ بڑی ترنگ میں نظر آ رہے تھے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے۔

تانیہ ان کے مزاج کے بدلتے موسموں کو سمجھنے میں جب قطعی ناکام رہی تو بالآخر ان سے الجھ بیٹھی۔

"خاور بھائی! یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے آپ کے مزاج میں اتنا تنوع کیوں ہے کبھی کچھ کبھی کچھ ممو آنٹی کہا کرتی ہیں مزاج میں اس قسم کی بے ربطی اور بے ترتیبی اس صورت میں آیا کرتی ہے جب دل میں سکون نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنا سکون قرار کہیں لٹا بیٹھے ہیں؟"

جواب میں اس نے ان کے پتھر چہرے پر دکھ کی عجب سی دراڑیں محسوس کیں ان کا چہرہ ایک لمحے کو عجیب سا پڑ گیا تھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ جذبات کی شدتوں کو چھو آئے ہیں عمر کے کسی حصے میں؟"

وہ بغور انہیں دیکھ رہی تھی "کیونکہ ممو آنٹی کہتی ہیں شدتوں کے موسم میں بھیگنے کے بعد انسان کے مزاج میں یا تو خزاں کی زرد بے رنگی چھا جاتی ہے یا پھر اس کی کڑواہٹ مزاج کو وحشت زدہ کر دیتی ہے۔" وہ اس کے عجیب متاسف و ملول انداز میں مسکرائے پھر گویا ہوئے۔

تمام عمر جیے اور کچھ نہ کر پائے
کسی کے ہو کے رہے اور نہ اپنا کر پائے
زمانہ اس کے حوالے سے یاد کرتا ہے
کہ جس سے اپنے ستارے نہ مل پائے

"خاور بھائی ـــ" وہ ایک لمحے کو سناٹے میں رہ گئی تھی تو اس کا واہمہ درست نکلا ایک بات تھی جس تک شہرین کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ جسے شہرین ناممکن میں بدل گئی تھی۔

تانیہ نے گہرے دکھ کے احساس سے لبریز ہو کر ان کی سمت دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی وحشت ان کے چہرے پر چھائی یاسیت تشنہ کامی اور لب و لہجے کی تلخی اس بات کی شاہد تھی کہ مزاج کی یہ بے کلی یونہی بے سبب نہیں تھی۔

"وہ کون تھی خاور بھائی؟" تانیہ کے دل میں خاور مغل کے لیے بہت سی ہمدردی جمع ہو گئی تھی۔

"ایک چراغ منزل۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز میں گاڑی ایک نسبتاً سنسان سڑک کے کنارے روک دی اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر کے مناظر دیکھنے لگے۔

"آپ کو کہاں ملی تھی؟"

"ایسے ہی برستے موسم میں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دل کی مکین بن جائے گی۔"

"کلاس فیلو تھی۔" وہ بڑے سبھاؤ سے زخموں سے کنکر چننے کا کام سرانجام دے رہی تھی۔

"نہیں......!"

"کوئی رشتہ دار۔"

"نہیں اس سے اس قسم کا کوئی ربط استوار نہیں تھا بابا مرحوم کے کسی جاننے والے کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ دونوں ابو ظہبی میں تھے۔ وہ ہمارے ہاں آئی تھی تعلیم مکمل کرنے کے لیے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے معاشیات کر رہی تھی ہوسٹل میں ہی رہتی تھی۔ ہمارے ہاں ویک اینڈ پر آتی تھی۔ اس کے گارجین تھے ہم لوگ یہاں اور اس کا پورے پاکستان میں کوئی نہیں تھا۔" وہ سحر زدہ کیفیت میں اس کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔

"کیا آپ نے پہلی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا۔"

"نہیں، مجھے تو بہت عرصے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کوئی شے ایسی بھی ہے جسے پسند کیا جا سکتا ہے شروع شروع میں تو میں شدید خائف رہا کرتا تھا اس کے وجود سے یہ تو جدائی نے بتایا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ اس کے ساتھ رہ کر تو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ میری ضرورت بھی بن سکتی ہے۔ یوں بھی جب تک پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا رہے فاقے کی کیفیت سے آشنائی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک اس کی ذات کا چشمہ میسر رہا میں سیراب ہوتا رہا تب تک احساس کی حدت پیاس بھی نہ بھڑکی جب سوتے خشک ہو گئے جب خیمے اکھڑنے لگے تو احساس ہوا وہ تو چشمہ آب حیات تھا۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔"

"کیا چیز آپ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔"

"میری بزدلی۔" انہوں نے بڑی فراخدلی سے تسلیم کر لیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بزدل اور آپ ۔۔۔؟" تانیہ نے ان کے لمبے چوڑے بارعب، دبنگ وجود کو دیکھتے ہوئے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

"ہاں، مصلحتوں کی آڑ لینے والا بزدل ہی ہوا کرتا ہے۔" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا وہ بھی آپ کو پسند کرتی تھی اور کیا آپ نے کبھی اس سے اظہار کیا؟" اس کو تہہ تک پہنچنے کی عجلت سوار تھی۔

وہ مجروح سی ہنسی ہنس دیے۔

"ایسا کچھ ہمارے درمیان آیا ہی نہیں، تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ روایتی عشق و محبت کی داستان ہے ارے بھئی اگر ایسا ہوا ہوتا تو عمر کا بے کا تھا۔ کیوں اتنے برس ایک ہی روگ پالتا رہتا ۔ اپنے اندر بھلا نہ دیا ہوتا سب کچھ۔"

"کیا وہ بہت حسین تھی؟" اسے بڑا اشتیاق ہو رہا تھا اس نادیدہ ہستی کے متعلق جاننے کا جس نے خاور مغل جیسی مضبوط چٹان کو پانی کر دیا تھا۔

"یہی تو سارا رونا ہے بی بی۔" ان کے انداز پر وہ خاک بھی نہ سمجھی۔

"کیا اس نے کبھی آپ سے اپنی چاہت کا اظہار کیا۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیے "آخر ہو نا ٹین ایجر، بچکانہ رومانٹک آئیڈیاز ہی آئیں گے ذہن میں، ارے بھئی حقیقی زندگی ——— میں ایسا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ اچھا میں تمہاری تسلی کے لیے تمہیں اس کی کچھ تصویریں دکھاتا ہوں۔ میں جب امریکہ ہوتا تھا تو اس دوران اس نے بھیجی تھیں۔ یہ مجھے اتنی عزیز ہیں کہ ہر دم اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

انہوں نے پچھلی سیٹ پر پڑا اپنا بریف کیس تھاما۔ لاک کھول کر اس کے ایک خفیہ خانے سے چند کاغذات نکالے اور اس کی گود میں ڈال دیے۔ تانیہ نے احتیاط سے ایک کاغذ کی تہہ کھولی۔ موتیوں کی سی لکھائی میں سفید براق ورق کے عین وسط میں درج تھا۔

عزیزم خاور!

مانتا ہوں بہت رات ہے اندھیرا ہے
کٹھن بھی ایسی کہ جس کی کوئی مثال نہیں
مگر تم حوصلہ اور ہمتیں جواں رکھو
اب اس قدر بھی پریشانیوں سے کیا حاصل
کہاں کہاں تیرا رب ذوالجلال نہیں

فقط ایک خیر اندیش

اس نے استعجاب کے عالم میں دوسرا ورق کھولا یہ کسی اور تاریخ کا تھا مگر اسٹائل وہی تھا۔

عزیزم خاور!

ہزار سانحے پردیس میں گزرتے ہیں
جو ہو سکے تو کبھی ہم سے رابطہ رکھنا

فقط ایک خیر اندیش

اس نے تیسرا خط کھولا۔

عزیزم خاور!

شاخیں رہیں تو پھول بھی پتے بھی آئیں گے
یہ دن اگر برے ہیں تو اچھے بھی آئیں گے

فقط ایک خیر اندیش

پھر اس نے آخری خط بھی کھولا۔

عزیزم خاور۔

قیمت نہ لگا جذبۂ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گا
ہٹ کر مجھے آئینۂ کردار سے مت دیکھ

فقط ایک خیر اندیش

"یہ اس کا آخری خط تھا جو جانے سے پہلے وہ میرے بیڈ روم میں ٹیبل پر چھوڑ گئی تھی اور پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئی۔"

"وہ کون تھی خاور بھائی! ایسی انوکھی، ایسی ہمدرد، اتنے اعلا ظرف والی۔" تانیہ نے بغیر اس سے ملے ہی اس کی تحریر کی خوشبو سے اس کے مزاج کا پتا لگا لیا تھا۔

"میں بھی آج تک ورطۂ حیرت میں ہوں کہ۔

ستارۂ شام بن کے آیا برنگ موج سحر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا ہمیں تو حیران کر گیا وہ

اس کی ذات کا بھید پوری داستان سن کر ہی پا سکو گی۔ اسی قصہ عجائب کو سنانے کے لیے تمہیں ساتھ لایا ہوں کہ تم نے بڑے غیر محسوس انداز میں مجھے پرت در پرت کھلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کٹھن نے تو میرے اعصاب تک کو سن کر کے رکھ دیا ہے میں اپنی ذات کی قید میں محصور ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان سب لوگوں کو مصنوعی خون لگا کر زخم دکھانے کی عادت ہے اور میں نے اپنے وجود کے اندر پڑے اتنے بڑے گھاؤ کو بے اعتنائی اور رکھائی کے پیراہن میں چھپا رکھا ہے اپنوں کے لگائے گئے زخموں کا مرہم بازار کی دکانوں پر دستیاب نہیں ہوتا۔ تمہیں پتا ہے تانیہ! یہ ٹھاٹھ باٹھ عیش و عشرت یہ تعیش ان سے کچھ برس پہلے تک یہ لوگ قطعی ناآشنا تھے۔ انہوں نے خواب میں بھی ایسے آرام نہ دیکھے تھے۔ ہم بہت معمولی سی حیثیت کے مالک ہوا کرتے تھے۔ تم یقین کرو گی سارے پورے گھر کا خرچہ میری کل تنخواہ پانچ ہزار دو سو روپے سے چلا کرتا تھا۔"

وہ انکشافات پر انکشافات کرتے چلے جا رہے تھے۔

"ایسے نہیں خاور بھائی ترتیب سے بتائیے سارے واقعات۔" اس نے بیچ میں ٹوک دیا تھا۔



میرے بابا اور اماں جی کا تعلق سرحد کے ایک پسماندہ گاؤں سے تھا دونوں کے قبیلے بھی مختلف تھے مگر محبت ایک ساتھ دونوں کے دلوں میں جل اٹھی تھی۔ قبیلے کے سرداروں نے اس بندھن کو ناممکن قرار دیا تو دونوں بھاگ کر پنجاب آ گئے اور شادی کر لی۔ پڑھائی لکھائی کا رواج تو ان کے قبیلوں میں نہیں تھا سو دوڑ دھوپ کر کے بابا ایک فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ تنگی ترشی سے ہی سہی زندگی کے دن بیت گئے۔ سب سے بڑی بلقیس آپا کی شادی بابا نے اپنی زندگی میں ہی کر دی تھی۔ مجھے پڑھانے کا انہیں بہت شوق تھا۔ سو پیٹ کاٹ کر بھی انہوں نے اپنا اور میرا بھی تعلیم کا یہ شوق پورا کیا مجھ سے چھوٹی نفیس کی بات بھی اپنے جیسے سفید پوش لوگوں میں طے ہو گئی۔ نفیس سے چھوٹا عمر بھی پڑھ رہا تھا عمر اور بلقیس آپا کی سب سے بڑی اولاد فریال دونوں ہم عمر ہی تھے۔

میں نے ابھی ایم بی اے مکمل نہیں کیا تھا جب بابا جان کا انتقال ہو گیا۔ میں پہلے بھی ٹیوشنز کر کے اپنا خرچہ پورا کرتا تھا اب گھر کا بھی چلانے لگا۔ تقدیر کا چکر کہ کچھ عرصے بعد بلقیس آپا اور ان کے خاوند کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ان کے شوہر تو موقعہ پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بلقیس آپا ایک ٹانگ سے معذور ہو گئیں۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی اولاد فریال میٹرک میں تھی اور سب سے چھوٹا بیٹا دانش ابھی فقط تین سال کا تھا۔ فریال سے چھوٹا اظہر آٹھویں میں تھا پھر راضیہ اور صائمہ اور ان سے چھوٹی تانیہ پورے کنبے کا بوجھ مجھ پر آن پڑا ایم بی اے کر کے کچھ خواری کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری تو مل گئی مگر گھر کا خرچا چلانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا۔ فلیٹ کرائے کا تھا پھر بجلی، پانی سوئی گیس کا بل، عمر کی پڑھائی کا خرچہ، آپا کے سارے بچوں کی پڑھائی اور کھانے پینے کا انتظام، نفیس کی شادی کے لیے جہیز کا مسئلہ آپا کی بیماری کا خرچہ، ہر طرف سے مسائل کے انبار نے مجھے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا پڑھا دیا۔ مزاج میں خود بخود کھردرا پن اور کم گوئی رچ بس گئی۔ ان ہی دنوں نیما صدیقی کی آمد کا غلغلہ اٹھا جس نے مجھے مزید تپا دیا۔

پتا چلا موصوفہ بابا جان مرحوم کی فیکٹری کے مالک کی بیٹی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے صدیق صاحب کاروبار سمیٹ کر فیملی سمیت ابو ظہبی چلے گئے تھے وہیں طویل عرصے تک رہائش رہی کبھی پاکستان آنا ہوا تو بابا جان سے ضرور ملتے۔ بابا جان ان کے بڑے وفادار اور جانثار قسم کے ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کو لاہور سے ایم اے کرنا تھا یہاں رہائش ہوسٹل میں قرار پائی تھی چونکہ ان کا پاکستان میں اور کوئی خاص جان پہچان اور بھروسے والا بندہ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے خط لکھ کر ہمیں نامزد کیا تھا۔

میں یہ خبر سن کر جی بھر کے غصے ہوا تھا۔ البتہ اماں

اور آپا کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔
"کہاں ہمارا یہ تین کمروں کا تنگ و تاریک فلیٹ کہاں ان کی نازوں پلی بیٹی کہاں رکھیں گے اسے اماں خوامخواہ کی مصیبت کیوں مول لیں' آپ کو نہیں خبر یہ امیر کبیر شہزادیاں تو ایسی جگہوں پر حبس کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں' آپ لکھ دیجیے معذرت انہیں۔"

"تو بھلا ایسے ہی لکھ دوں۔" اماں بگڑیں۔
"مہمان تو خدا کی رحمت ہوا کرتے ہیں' بڑے احسانات ہیں سیٹھ صاحب کے تمہارے بابا پر' بڑا بھروسہ کرتے تھے وہ' کبھی اپنے رتبے کا احساس نہیں دلایا ہمیشہ نرمی اور محبت سے پیش آئے۔"
"ہم ان کے احسانات کا بدلہ چکانے کے اہل نہیں ہیں' آپ مطلع کر دیجیے انہیں۔" میں چڑ سا گیا تھا۔

مگر ادھر کس کو پروا تھی۔ سارے گھر میں خوشگوار سی ہلچل مچی ہوئی تھی' آپا' فریال اور نفیس کے سر تھیں جن کے ذمے پورے گھر کی صفائی اور از سر نو آرائش تھی۔ سامان ادھر سے ادھر کرنے میں عمر اور اطہر لوگ پیش پیش تھے۔ اس کی آمد کے دن اماں جی نے خصوصی طور پر اپنے ہاتھ سے مزے مزے کی ڈشز بنائیں۔

"اللہ کا واسطہ ہے اماں! یہ ڈھکوسلے رہنے دیں۔ ہم جب اس سے اپنی حیثیت نہیں چھپا سکتے تو خوامخواہ مصنوعی تکلف کی فضا قائم کر کے مقابلہ کرنے سے کیا حاصل۔"
اماں میرے کڑوے کسیلے لہجے پر شدت سے برامان گئیں۔
"لو کے مجھے تو تیری کوئی کل سیدھی ہی نہیں لگتی' نا وہ کون سا تیرے کندھے پر سوار ہونے کو آ رہی ہے جو مرچیں چبا رہا ہے' چند دن رہے گی پھر ہاسٹل چلی جائے گی۔ کبھی اتوار کے اتوار آیا کرے گی۔ ہم سے اس نے کیا لینا دینا اچھا اب چلو جاؤ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"
"پہلے یہاں کم مصائب تھے جو یہ بھی۔" میں بڑبڑاتا ہوا گھر کی واحد سواری سیکنڈ ہینڈ موٹر بائیک کی چابیاں تلاش کرنے لگا۔
"ارے بائیک پر لینے جاؤ گے۔" اماں نے حیرت سے مجھے دیکھا تو میں بھنا سا گیا۔ "اور کیا شہزادی عالیہ کے لیے شاہی بگھی کا اہتمام کروں۔"
"ارے کیوں ناراض ہو رہے ہو میں تو یہ کہہ رہی ہوں باہر جھاجوں مینہ برس رہا ہے ایسے میں بائیک پر کیسے جاؤ گے۔"
"اف اللہ! گویا ٹیکسی کے کرائے میں بجٹ پھر خراب ہوگا۔" میں نے دل ہی دل میں کبیدہ خاطر سا ہو کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے چابی رکھ دی۔
ایئرپورٹ پر جب میں نے اسے دیکھا تو ایک لمحے کو بالکل بت سا بن گیا' میرے تصور کے برعکس وہ نہایت سادہ اور عام سی شکل و صورت والی تھی' اس کے سراپے میں مجموعی طور پر کشش تھی مگر انداز میں امیر زادیوں جیسی کوئی جھلک کبھی نہ تھی۔
تین کمروں پر مشتمل اس چھوٹے سے' افراد سے کھچا کھچ بھرے فلیٹ میں وہ اہل خانہ کے ہمراہ یوں آرام سے پاؤں پسارے میٹھی باتیں بنا رہی تھی۔ جیسے ازل سے ہی ان ہی کے بیچ رہتی آئی ہو۔
"ارے یہ تو نہایت سیدھی اور اللہ لوک قسم کی بچی ہے۔" تیسرے دن جب وہ سامان سمیٹ کر ہاسٹل شفٹ ہو گئی تو اماں جی نے ذاتی رائے دے کر نئے موضوع کا آغاز کیا۔
"صحیح کہتی ہیں اماں ورنہ ہم نے تو سوچا تھا اتنی پڑھی لکھی ہے امیر ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی اولاد ہے۔ نخروں کے ٹوکرے ہمراہ لائے گی۔" بلقیس آپا بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔
"کتنی سادگی سے آلتی پالتی مار کر ہمارے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھا رہی تھیں جیسے ہمیشہ ایسے ہی کھاتی رہی ہوں۔" نفیس کو اس کی یہ ادا بہت بھائی تھی۔
"بہت کم دل والے ایسے ہوتے ہیں جنہیں خدا دولت سے نوازتا ہے تو بھی وہ اپنا ظرف بلند اور دل کشادہ رکھتے ہیں۔ دیکھو تو اندازے سے ہی کتنے تحائف لے آئی یہ کہہ کر جھولی میں ڈال دیے کہ آنٹی

میرا یہاں اور کون ہے' آپ لوگ ہی تو ہیں میرے لیے' ماشاء اللہ بڑے کھلے دل کی ہے اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ ورنہ ہم نے تو بڑے بڑوں کو دولت کے زعم میں انسان کو حیوان سے بھی کم تر سمجھ کر دھتکارتے دیکھا ہے۔"
"نیما باجی کہہ رہی تھیں ویک اینڈ پر آئیں گی تو ہمارے ساتھ گڑیا گڑیا کھیلیں گی۔" راضیہ اور صائمہ اپنی جگہ محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔
سارا گھر ہی اس کے اخلاق کا' اس کے مزاج کی سادگی و پُرکاری کا اور اس کی فیاضی طبع کا گرویدہ ہو چکا تھا مگر مجھے نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی تپ چڑھ جاتی تھی۔ آجاتی ہیں محترمہ اپنی امارت کا جادو جگانے۔
جب دیکھو کبھی راضیہ اور صائمہ کے فراک آ رہے ہیں' عمر اور اطہر کے لیے بیٹ بال یا شرٹس لائی جا رہی ہیں۔ فریال کے لیے بوتیک سے کوئی سوٹ پسند کر کے لایا جا رہا ہے اماں اور بلقیس باجی اور نفیس کے لیے کسی ضرورت کی چیز خریدی جا رہی ہے۔ دینے کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ اگلے کو ضرور ہی تحفہ لیتے ہی بن پڑتی۔
"آنٹی! کل میں گئی تھی ناں ادھر تو یہ شرٹ کا پیس پسند آ گیا خیال آیا ماشاء اللہ عمر کا رنگ بہت کھلتا ہوا ہے اس پر بہت سوٹ کرے گا بہت سارے لوگ لے رہے تھے ٹھیک ٹھاک سستا مل گیا میں نے کہا چلو کیا حرج ہے بھلا اتنا اچھا کپڑا دوبارہ جانے کب ملے میں نے لے لیا کہ آپ کو دکھاؤں گی۔"
بلقیس آپا یا اماں جی رسماً کہتیں۔
"ارے نہیں چندا! تم کیوں تکلیف کرتی ہو یہ بہت زیادہ ہے۔"
"تکلف کہاں آنٹی! مجھے یہ تو یونہی ٹرائل کے طور پر لائی ہوں' آپ میرے ساتھ چلیے گا کسی دن' بے شک اپنی پسند سے اور لے لیجیے گا۔ اے تو رکھیے نا' ارہاں آج پکا کیا ہے' بھئی نفیس ذرا اپنے ان نفیس و نازک ہاتھوں سے کھانا تو لگا دو' قسم سے بڑی بھوک لگ رہی ہے اور یہ چھوٹی مخلوق کدھر ہے میں دیکھتی ہوں ان کو۔" جب بھی آتی گھر میں ادھر ادھر آزادانہ گھومتی پھرتی مزے سے انجوائے کرتی۔ ایک لمحے کو بھی کبھی کسی کو احساس نہیں دلاتی تھی کہ وہ خصوصی مہمان نوازی کی مستحق ہے۔
کبھی لاڈ سے اماں کی گود میں سر رکھ دیتی۔
"آنٹی! ذرا اپنے اصلی والے سرسوں کے تیل سے مالش تو کر دیجیے۔"
ان دنوں میں بہت پریشان سا تھا۔ عمر کو فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن دلانا تھا داخلہ فیس اور کتابوں کاپیوں یونیفارم وغیرہ کے لیے کم از کم ڈیڑھ دو ہزار کی رقم درکار تھی تنخواہ ملنے میں ابھی ایک آدھ ہفتہ باقی تھا اور اتفاق سے اس کے داخلے کی آخری تاریخ قریب تھی۔ تنخواہ سے تو یک مشت اتنی بڑی رقم کی بچت ناممکن ہی تھی۔ چھوٹے دانش کی طبیعت خراب تھی' اس کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت تھی۔ اسی پریشانی میں داخلے کی تاریخ ذہن سے نکل گئی' تنخواہ ملنے پر سب سے پہلے عمر کو ڈھونڈا۔
"عمر! وہ تمہارے داخلے کا کیا بنا' یار لیٹ ہی ہو گئے تم اب۔۔۔"
"ارے نہیں بھائی! داخلہ تو ہو گیا۔" میں عمر کے رنجیدہ ملول چہرے کی جگہ ہشاش بشاش انداز دیکھ کر ششدر رہ گیا تو رہ گیا۔
"مگر کیسے؟ پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟" میں چونکا تھا۔
"کہیں اماں اور آپا لوگ بات کر رہے تھے' نیما باجی نے سن لیا پھر میرے پاس آ کر خفا ہوئیں کہ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا اپنے داخلے کا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں وہ مجھے لے گئیں اور انہوں نے ہی داخلے وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا۔"
میرے اندر کا غیرت مند مغل بچہ ایک لمحے کو جوالا مکھی کا روپ دھار گیا۔
"تم نے کیوں لیا ان کا احسان' تمہارا بھائی مر گیا تھا جو یوں ایرے غیرے کے آگے دکھڑا رو رہے تھے۔"
میں نے شعلہ برساتی نگاہوں سے اسے گھورا جواب میں وہ مسمسی سی صورت بنا کر منظر سے ہٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا۔
ویک اینڈ پر وہ آئی تو میں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ اس کے پاس قالین پر رکھ دیا وہ نیچے ہی بیٹھی راضیہ اور صائمہ کو سبق یاد کروا رہی تھی۔
"یہ کیا ہے؟" اس نے حیران نظریں میری سمت دوڑائیں۔
"یہ آپ کا احسان ہے محترمہ جو آپ نے عمر پر کیا تھا۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔
ایک لمحے کو اس کے چہرے پر ناگواری کے عکس لہرائے پھر بڑی صفائی سے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے اس نے قدموں میں پڑی رقم اٹھائی اور ٹیبل پر میرے نزدیک کھسکا کر بولی۔
"یہ احسان نہیں قرض تھا جس کی وصولی عمر سے قرار پائی ہے وہی یہ رقم واپس کرنے کا پابند ہے۔ آپ کے ساتھ تو میرا ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔" وہ کہہ کر کچن میں گھس گئی تھی غالباً۔
پھر فریال کے رزلٹ پر اس نے ایک ہزار روپیہ نقد اور ساتھ میں نصاب کی کتابوں کا سیٹ اپنی طرف سے گفٹ بنا کر اس طرح دیا کہ اسے واپس کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ وہ احسان بھی اس انداز میں کیا کرتی تھی جیسے اس کا فرض اور ہمارا حق سمجھ کر کر رہی ہو۔ لینے والے کی انا کا ہرٹ ہونا تو درکنار الٹا اسے یہ احساس دلاتی تھی کہ تم یہ چیز لے کر مجھ پر بڑا احسان کر رہے ہو۔ میں اس کی ان حرکتوں پر دل ہی دل میں بہت نالاں رہتا تھا۔
"ہمیں نہیں چاہیں آپ کی عنایتیں، نوازشیں، براہ کرم انہیں اپنے پاس ہی رکھیں۔" میں تنتناتا ہوا اس کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔
"کیوں کیا ہوا؟" میں نے جتنے جلال سے بازپرس کا آغاز کیا تھا اس نے اتنے ہی سکون سے دریافت کیا تھا۔
میرا دل جل کر خاک ہو گیا۔ آپا کے بیٹے کی طبیعت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا آج شام وقت نکال کر اسے لے چلوں گا۔ بڑی مشکل سے ایک ماہر ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا تھا۔ آنے پر پتا چلا دانش اور بلقیس آپا کو نیہا اپنی گاڑی پر لے گئی تھی۔
واپسی میں وہ دوائیوں اور پھل فروٹ سے لدی پھندی گھر لوٹی تو میں کھولتے دل و دماغ کے ساتھ اس پر الٹ پڑا۔
"ارے باؤلے ہوئے ہو خاور۔" اماں بیچ میں پڑ گئیں "ایک تو بچی نے نیکی کی اوپر سے اسے یہ صلہ دیا جا رہا ہے، بچہ درد سے تڑپ رہا تھا خدانخواستہ وقت پر ڈاکٹر کو نہ دکھایا جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ تو بچی اتفاقاً ادھر آنکلی ورنہ کیا کرتے کیسے لے کر جاتے۔"
"ایسی کیا بات ہے آنٹی! آپ لوگ جو میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ دیکھیے نا گھر والوں سے اتنی دور پڑی ہوں پھر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اپنے ہی گھر میں اپنوں کے بیچ ہوں اب بھلا اپنوں میں تکلف تھوڑی چلتا ہے۔ آپ سب مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں میں جواب میں تھوڑا سا کام آجاؤں تو آپ کا حق بنتا ہے اور میرا اولین فرض، آپ تو ایسی باتیں کر کے الٹا مجھے شرمندہ کر ڈالتے ہیں۔" نہایت معصومیت سے اماں جی سے لپٹ کر وہ اپنی چاہت کا اظہار کر رہی تھی۔
میں حسب سابق بل کھا کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا کہ آگے رہ ہی کیا گیا تھا کہنے کو۔ وہ یونہی غیر محسوس انداز میں گھر کا خیال رکھتی تھی۔ کبھی مجھے خبر ہی نہ ہوتی کس طرح گھر میں چینی، گھی یا آٹا آجاتا۔ کسی بچے کی اسکول کی فیس دے دی جاتی، مختلف تہواروں کی مناسبت سے تحفے کے بہانے بچوں کی پہننے اوڑھنے کی ضروریات پوری ہو جاتیں اور اس قدر پلاننگ کے ساتھ وہ اس مدد کو اپنے فرائض میں شمار کر کے شرمندہ شرمندہ سی ہو کر پیش کرتی گویا اگلے کے حق میں کچھ کم ہی دیا ہو۔
مجھے اس کے انداز سراسر چھچھورے اور نامناسب سے لگتے تھے شاید اس لیے کہ یہ میری غیرت اور خودداری پر تازیانہ بن کر لگتے تھے۔ میں دانستہ طور پر اس کی موجودگی میں سب میں بیٹھنے میں کتراتا تھا۔ ہم دونوں میں محسوس کیا جانے والا کھنچاؤ موجود تھا جو اماں جی کی ہزار تنبیہ کے باوجود دور نہیں ہو سکا تھا۔ میں

اس سے کم سے کم مخاطب ہونے یا مخاطب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔
"خاور! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم دونوں کے بیچ جائیداد وغیرہ کا کوئی تنازعہ ہو۔"
نفیس کے سسرالی رشتہ دار آئے ہوئے تھے اسی سلسلے میں اماں نے اسے بھی بلوا بھیجا تھا میں کچن سے مرد حضرات کے لیے چائے کے لوازمات لینے کو اندر آیا تو وہ برتنوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے دریافت کرنے لگی۔ انداز میں حد درجہ سادگی تھی۔
میں نے اپنے اندر ابل پڑنے والے غیض پر بمشکل قابو پایا تھا۔
"یا یہ کہ آپ کا کوئی مربع میں نے اپنے نام کرا لیا ہے۔" ادھر ہنوز معصومانہ استفسار تھا۔
"خوامخواہ میرے منہ مت لگو۔" میں جھلا کر ٹرے اٹھانے لگا۔
"نہیں پھر بھی خاور! سوچنے کی بات ہے، ہے نا۔" وہ اپنی بات پر بضد تھی۔
"اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خونخوار حریفانہ انداز میں پیش کیوں آتے؟ ضرور ہم دونوں میں ماضی میں کوئی اعلا درجے کی دشمنی رہی ہے۔"
وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ تب ہی اتنے وثوق سے کہہ رہی تھی۔
"فضول بات نہیں کرو اور پلیز ذرا جلدی نپٹاؤ اپنا کام، اتنی سست رفتاری سے تو چیونٹی بھی نہیں کرتی ہو گی۔" میں خوامخواہ چڑ سا گیا تھا۔
"اچھا تو پھر جاؤ چیونٹی سے کرا لو۔" نہایت اطمینان سے اس نے اتنی بے ساختگی کے عالم میں جواب دیا تھا کہ اندر آتی نفیس کسی صورت اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی تھی۔ میں کھسیا کر کچن سے باہر آگیا۔
اس دن کے بعد سے یہ ہوا کہ ہماری آپس کی چپقلش اور کشیدگی میں قدرے کمی واقع ہوتی گئی۔ بالواسطہ کے بجائے دوبدو براہ راست محاذ آرائی ہونے لگی۔ شاید پہلی کارروائی چپ کا حصار توڑنا ہی ہوا کرتی ہے۔ پہلے اپنے طنز و تمسخر اور خفگی کا اظہار اماں، آپا یا دوسرے بچوں کے توسط سے اس تک پہنچاتا تھا اب یہ کام بغیر کسی واسطے کے انجام پاجاتا تھا۔
ان دنوں میں باہر جانے کے چکروں میں تھا ایک دوست سے بات کرنا تھی اماں کو کہہ گیا تھا رات دیر سے لوٹوں گا۔ رات گئے گھر آیا تو خلاف توقع نیہا کو دروازے پر موجود دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پھر چپ چاپ اندر آگیا۔ چینج کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں آگیا۔ یہیں ایک کونے پر میرا پلنگ بچھا تھا۔ اک رائٹنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری بھی سائیڈ پر سیٹ تھی۔ ڈرائنگ روم والا کمرہ باقیوں کے مقابلے میں خاصا کھلا تھا۔ رات کو یہ میرے استعمال میں ہی ہوتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اماں آپا نفیس اور باقی ساری لڑکیاں سوتی تھیں، جب کہ تیسرے چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں عمر اور اطہر کے پلنگ بچھے تھے۔
چینج کر کے آیا تو وہ سینٹر ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس رکھ رہی تھی۔
"کیا پکا ہے آج؟" مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اس وقت۔
"ٹنڈے آلو۔" سن کر ہی میرے چہرے پر کوفت زدہ اثرات نمودار ہو گئے۔
یہ سبزی مجھے زہر لگتی تھی۔
"تمہیں شاید پسند نہیں۔" وہ مسکرا دی میرے تاثرات سے سمجھ گئی تھی۔
"ساری بھوک ہی اڑا دی اس کے نام نے۔" میں نے برا سا منہ بنایا۔
"اچھا ٹھہرو تمہارے لیے کچھ اور سوچتی ہوں۔"
پندرہ منٹ بعد وہ ٹرے لگا کر لائی تو گرم گرم روٹی کے ہمراہ فنگر چپس، ٹماٹو کیچپ، ایک کٹوری میں آلو اور پیاز کا رائتہ اور پودینے کی چٹنی دیکھ کر میری روح تک خوش ہو گئی بے تکلفی سے ڈٹ کر کھانے لگا۔
کھانے کے بعد وہ چائے کے دو کپ لے آئی اور

وہیں بوسیدہ سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے ہمارے درمیان سناٹا بولتا رہا۔

"خاور تم ان دنوں بڑے الجھے الجھے سے لگ رہے ہو۔ کن چکروں میں ہو۔"

"چکر کیا ہونے ہیں' غم روزگار کے دھکے ہیں اور کیا ——" مجھ پر تھکن اور اعصابی دباؤ کے ساتھ ساتھ بے زاری بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔

"ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ موجودہ دور میں جتنے بھی کمائیں جہاں سے بھی کمائیں کم ہے' پھر جہاں ماشاء اللہ افراد زیادہ ہوں وہاں ضرورتیں بھی خود بخود چادر چھوڑ کر پاؤں پھیلانے لگتی ہیں۔ بہت مشکل ہے گزارا ان دنوں۔"

مجھے خاصا تعجب ہوا۔ بھلا نازوں پلی لاکھوں میں کھیلتی امیرزادی کو ان جھمیلوں کی کیا خبر' وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس کے ہاں بھی ہو رہا ہو۔

"اب دیکھو نا' تمہیں کتنی محنت کرنا پڑتی ہے سارا سارا دن باہر کھپتے ہو' ٹیوشنز بھی کرتے ہو پھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ آخر تم بھی انسان ہو' کوئی مشین تو نہیں ہو کہاں سے بندہ پورا کرے ذمہ داریاں بھی تو بہت ہیں۔ میں تو کہتی ہوں' بڑی ہمت ہے تمہاری' بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہو جو اتنی تندہی سے اتنی جانفشانی سے اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنا آرام و سکون تج کیے ہوئے ہو۔"

میں اس کی ہمدردانہ باتوں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اتنی فراخدلی سے تو کسی نے بھی میرے ایثار' میری قربانی اور میری فرض شناسی کا اقرار نہیں کیا تھا اس کا انداز اتنا اپنائیت آمیز تھا اور وہ اس طرح ہماری سطح پر آ کر اسی حساب سے بات کر رہی تھی کہ میں بھی اپنی غیر فطری انا' غیرت اور نام نہاد پردہ پوشی کو پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ اپنے خیالات شیئر کرنے لگا۔

"اس قدر مہنگائی کے دور میں اتنے سارے افراد کے ہمراہ چند ہزار سے کیا بنتا ہے میں سوچتا ہوں آگے کیا بنے گا۔ ابھی عمر بہت چھوٹا ہے' فرسٹ ایئر میں ہی تو ہے' ادھر نفیس کے سسرال والے جلدی جلدی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں' بلقیس آپا کی قربان بھی کل کو نفیس کے برابر آ رہی ہے۔ پھر دوسرے بچوں کی تعلیم اور خوراک کے مسائل' بلقیس آپا کی دوا کا انتظام گھر کے خرچے' بلوں کی ادائیگی یہ سب کیسے پورا ہو گا۔ خرچ ہیں کہ دن بدن کسی دیوہیکل جن کی طرح بڑھتے ہی چلے آ رہے ہیں سوچو تو اگر آج نفیس کے سسرال والے جلدی مچا دیں تو اس وقت میرے پاس اس کو جہیز کے نام پر دینے کے لیے شاید ایک جوڑے کے پیسے بھی نہ ہوں۔"

حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نہایت کبیدہ خاطر اور دلگرفتہ سا قالین پر صوفے سے پشت ٹکائے بیٹھا تھا۔ سوچیں آکٹوپس کی طرح ذہن کو جکڑے ہوئے تھیں۔

"ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو' ضرور ایسا ہی ہو گا تنخواہ کی رقم سے بچت کا سوال تو چیل کے گھونسلے میں ماس ڈھونڈنے والی بات کے مترادف ہو گا۔"

اس نے بڑے سبھاؤ سے میری بات کی تائید کی تھی ——پھر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگی۔

"خاور——" کافی دیر بعد اس نے پکارا اس کے لہجے اور نظروں میں کوئی خیال تحریر تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے دلی سے محض اس کی سمت دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی طرح باہر چلے جاؤ جیسے لندن' امریکہ وغیرہ۔"

میں کافی دیر تک اس کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر مسکرا دیا۔

"تمہارے ذہن میں آنے والا یہ آئیڈیا کچھ عرصہ پہلے ہی میرے دماغ میں آ چکا ہے' میں بھی اسی سوچ میں ہوں بلکہ ان دنوں ان ہی کوششوں میں لگا ہوا ہوں' اگر دو چار سال بھی باہر لگا آؤں تو بہت سے چھوٹے بڑے مسائل نپٹ جائیں گے۔"

"آنٹی سے بات ہوئی اس سلسلے میں؟"

"نہیں' براہ راست تو نہیں البتہ ایک بار یونہی

دبے دبے انداز میں تذکرہ کیا تھا مگر اماں سخت خائف ہیں۔ وہ باہر بھجوانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔"

"ظاہری بات ہے ماں کا دل ہے نا' اولاد کو اتنی دور آنکھوں سے پرے کرنے کا حوصلہ کیسے کریں گی۔" اس کے لہجے میں اماں کے لیے بڑی محبت اور لگاوٹ تھی۔

"اماں کو تو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ واویلا مچا دیں گی اور میں انہیں دکھی کر کے باہر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اس سلسلے میں تم فکر نہیں کرو' میں آنٹی کو سمجھا دوں گی کہ اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے والدین کو قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔"

"تم قائل کر سکو گی انہیں۔" میں بے یقین سا تھا۔

"بس تم دیکھتے جاؤ۔" اس نے چٹکی بجائی۔

اور پھر واقعی اس نے اپنی مسلسل کوششوں سے بالآخر اماں کو رام کر ہی لیا ورنہ شاید وہ کبھی بھی مجھے خود سے جدا نہ ہونے دیتیں۔ بابا جان کی ناگہانی وفات اور بلقیس آپا کے شوہر کے حادثے نے انہیں بہت وہمی بنا دیا تھا۔ میرے لیے وہ بہت حساس ہو گئی تھیں۔ کسی دن اتفاقاً" دیر سویر ہو جاتی تو ان کا بلڈ پریشر لو ہونے لگتا تھا۔

اس نے جانے کہاں کہاں سے تاویلیں گھڑی تھیں۔ دلائل پیش کیے تھے۔ سنہری خوابوں کی جھلک دکھائی تھی کہ اماں خود ہی مجھے باہر کے لیے اپلائی کرنے کی ترغیب دینے لگیں۔ وہ اس کی مانتی بھی تو بہت تھیں۔ یا شاید اس میں کچھ ایسی بات تھی کہ دوسرے سے انکار ہو ہی نہیں پاتا تھا۔

پاسپورٹ اور ویزے کا کام تو کسی نہ کسی طرح اپنی فرم سے کچھ ایڈوانس نکلوا کر کہہ سن کر ہو گیا مگر اب ٹکٹ کروانے کے لیے وہاں جا کر رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کے لیے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار کی خطیر رقم درکار تھی' میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں اسی فکر میں' ویزے کی مدت بھی —— خاصی مختصر تھی۔ اگر مقررہ مدت گزر جاتی تو پھر ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ اماں نے نفیس کے لیے رکھا ہوا زیور فروخت کرنے کے لیے دینا چاہا مگر میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔

"اور بن جائیں گے خاور بھائی!" نفیس نے بھی اصرار کیا مگر میری ہمت نہیں پڑی حالات کا کیا پتا ہوتا ہے کیا خبر وہاں جا کر کیسے حالات ہوں۔ خود اپنی جان کے لالے پڑ جائیں تو ایسے میں کیا یہ مجرمانہ احساس بھی ہمراہ لیے پھروں گا کہ بہن کے حق میں ڈاکہ ڈالا' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جاؤں تو کہاں جاؤں میرے مزاج کے سرد و سپاٹ موسموں کے باعث میرا حلقہ احباب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کوئی ایسا جان پہچان کا بندہ نہیں تھا جس سے قرض لیتا۔

"خاور——! ٹائم بہت ہو گیا ہے' یہ نیما کو ذرا چھوڑ آؤ ہاسٹل تک کہیں بند ہی نہ ہو جائے۔"

اماں کو موسمی بخار نے آ گھیرا تھا۔ سو وہ بھی اطلاع ملنے پر یونیورسٹی سے کلاسز لے کر شام کو ادھر ہی چلی آئی تھی عیادت کے لیے۔

"تم پہلے ہی تھکے ہوئے آئے ہو بہت تکلیف کرنا پڑ رہی ہے تمہیں۔" بائیک پر سنبھل کر ذرا فاصلے سے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص ہمدردانہ انداز میں کہا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔" میں نے مروتاً کہا۔

"کچھ ہوا بندوبست پھر ویزا ختم ہونے کی ڈیٹ تو نزدیک آ گئی ہے۔" اس کی پُر تشویش آواز پر میں نے گہری سانس لی۔

"دوڑ دھوپ تو کی ہے اچھی خاصی مگر کیا کیا جائے پیسے کی ہوس میں سب پاگل ہو رہے ہیں۔ جس کے پاس نہیں ہے وہ تو دوڑ ہی رہا ہے۔ جس کے پاس ہے وہ "ھل من مزید۔" کا ورد کرتا ہوا "محروم" سے بھی آگے دوڑ رہا ہے۔ آفس میں کچھ لوگوں سے سلام دعا ہے' کچھ بابا کے جاننے والے ہیں مل ملا کر شاید بیس بائیس ہزار ہاتھ لگ جاتے مگر اس سے بھی کیا بنے گا۔ یہ تو نصف بھی نہیں ہے مطلوبہ رقم کے۔"

میرے اعصاب پر بہت زیادہ بوجھ پڑا ہوا تھا۔

"ہوں۔۔۔ یہ تو ہے۔" وہ سوچ میں گم تھی۔

"حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تو لگتا ہے شاید جانے کا پروگرام چوپٹ ہی ہو جائے۔"

"ارے نہیں بھئی۔" میرے شکستہ مضمحل لہجے پر وہ دھک سے رہ گئی۔

"اتنی تگ و دو سے تو امریکا کا ویزا لگا ہے ورنہ تو لوگوں کی عمریں گزر جاتی ہیں ایمبسی کے چکر لگا لگا کر' خوش قسمتی ہے تمہاری جو اتنی جلدی تمہارا کام ہو گیا ہمت کیوں ہار رہے ہو خاور۔"

"تو پھر کیا کروں۔" میں نے نیند کے لیے ترستی ہوئی آنکھوں کو مسلتے ہوئے تلخی سے دریافت کیا۔

"ہمت و حوصلہ خاور! کوئی تدبیر سوچو ایسے تو نہیں کرتے نا۔" وہ میری ٹوٹی بکھری پژمردہ حالت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے دائیں شانے پر رکھ دیا اور تسلی کے سے انداز میں دبا کر میرا حوصلہ بڑھانے لگی۔ انداز بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماں' کسی بگڑے روٹھے بچے کو پیار سے سمجھا بجھا کر منا رہی ہو۔

"حوصلے اور ہمت کی باتیں وہاں کی جاتی ہیں جہاں امید کی کوئی کرن جھلملا رہی ہوتی ہے۔" میں جھنجلاہٹ اور دل گرفتگی کے احساس سے چُور تھا۔ "جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہو وہاں حوصلے کی لاٹھی کیا کام آئے گی۔"

"مشکلات' مصائب اور پریشانیاں بھی تو انسانوں پر ہی پڑتی ہیں یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں' زندگی کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ ان سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ مقابلہ کرتے ہیں اللہ مسبب الاسباب ہے' اگر اس نے ایک راستہ کھول دیا ہے تو دوسرا بھی ضرور کھولے گا اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے نا کہ ہم دستک دینا ہی چھوڑ دیں۔ دوسرے معنوں میں اس کی ذات سے مایوس ہو جائیں نا۔"

وہ تسلی کے سے انداز میں دھیرے دھیرے میرا کندھا تھپکتی رسانیت سے بول رہی تھی الفاظ تو دل پر مرہم رکھ رہے تھے یا نہیں اس سے قطع نظر اس کے ہاتھ کا لطیف اپنائیت آمیز لمس البتہ دکھتے' سلگتے اعصاب پر چھینٹے ڈالنے کا کام ضرور سر انجام دے رہا تھا۔

"ابھی تو تمہیں بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ ابھی سے تھکنے لگے ہو؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے تم پر جتنی ذمہ داریاں ہیں اس لحاظ سے تمہیں خود کو بہت مضبوط اور بہادر بنانا ہو گا تم اتنی کم عمری سے اپنی ذات کی ضروریات کو پس پشت ڈال کر اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لیے پھر اپنی یتیم بھانجیوں اور بھانجوں کی پرورش کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے ہو یقین جانو خاور! یہ تمہاری ذات کا بڑا دلکش پہلو ہے۔ قربانیاں دینے کا عمل انسان کی شخصیت میں بڑا نکھار بڑا وقار لے آتا ہے۔ تمہارا دل جو اتنا خوب صورت ہے اس کا کوئی نعم البدل ہی نہیں ہے۔ ان شاء اللہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم اپنے فرائض سے احسن طریقے سے عہدہ برآ ہو جاؤ گے پھر تمہارے پاس بہت سارا وقت ہو گا صرف تمہارے لیے۔"

اس کی لوریاں دیتی ہوئی دھیمی خوب صورت نرم آواز میرے اندر سکون کے چشمے جاری کر رہی تھی۔ بائیک کی اسپیڈ ہلکی کرتے کرتے بالآخر قدرے ویران سی شاہراہ پر درخت کے قریب روک دی۔

"میں بہت تھکنے لگا ہوں نیایوں لگتا ہے صدیوں تک یونہی تنہا آبلہ پائی کرتا رہوں گا اور منزل پھر بھی نہیں ملے گی۔" اتنے دنوں کی ذہنی توڑ پھوڑ اور سوچوں کے خلفشار نے میری قوت حیات گویا ختم ہی کر ڈالی تھی۔ بڑے دل شکستہ سے انداز میں سر جھکا دیا۔

"نہیں خاور! تمہیں ہرگز بھی تھکنا نہیں چاہیے اور تم اکیلے بھی کب ہو' اگر دیکھو سمجھو تو کتنے آشنا چہرے تمہارے اردگرد نظر آئیں گے اکیلا تو وہ شخص ہوتا ہے جس کو بھری دنیا میں کوئی سننے سمجھنے والا نہیں ہوتا۔ جس کی سلامتی کے لیے کوئی ہاتھ خدا کے حضور نہیں اٹھتا۔ جس کی پکار پر کوئی لبیک کہہ کر نہیں آتا تم تو بہت خوش قسمت ہو دیکھو تو تمہارے اردگرد کتنے

لوگ ہیں تم سے محبت کرنے والے تمہارے لیے فکر مند رہنے والے۔ دعاؤں کی سوغات دینے والے تمہارے دکھ درد کی دوا کرنے والے' ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ خاور! تم اکیلے نہیں ہو خود کو کبھی تنہا مت سمجھنا۔ ہم جو ہیں تمہارے اپنے۔"

وہ دھیرے دھیرے مجھے جوڑتی بناتی رہی۔ میرے حوصلوں کی عمارت بلند کرتی رہی' تاریکیوں کے بادلوں میں چاندنی کی جھلک دکھلاتی رہی۔

ششدر تو میں اس دن رہ گیا جب اس نے تیس ہزار کی خطیر رقم میری جھولی میں ڈال دی۔

"یہ کیا۔۔۔؟" میں ہکا بکا دیکھتا رہ گیا تھا۔

"تمہیں پتا تو ہے یو اے ای کی سائیڈ پر سونا بہت سستا ہوتا ہے بلکہ والدین بچے کی کسی خوشی پر تحفے کے طور پر سونے کی چھوٹی موٹی چیز دے دیتے ہیں عزیز رشتہ دار بھی بڑی فراخدلی سے گفٹ کے طور پر سونے کی ہلکی پھلکی چیز 'تحفتاً' دینے میں گریز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی بہت سے ایسے تحائف جمع ہیں ظاہر ہے سب کے سب تو نہیں پہنے جاتے نا میں نے ابھی برتھ ڈے کی گولڈ کی چین' بی اے کے رزلٹ پر ماما کی طرف سے دی گئی انگوٹھی اور بریسلٹ اور ایک کسی عزیز کا دیا ہوا لاکٹ بیچ دیا۔ بھئی کچھ تو فائدہ ہو جب پہنے نہیں تو بے کار میں پاس جمع رکھنے سے کیا حاصل' کتنے بہت سے جوڑے ہوئے ہیں۔" وہ اس قدر عام سے سرسری سے انداز میں صفائی دے رہی تھی گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میں سمجھ گیا تھا وہ حسب سابق مقابل کو شرمندگی سے بچانے کے لیے اپنے لہجے اور انداز کی ازلی لاپروائی کو بروئے کار لا رہی تھی۔

کچھ لوگ لے کر بھی شرمندہ نہیں ہوتے اور کچھ سر بھرے دیتے ہوئے بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔

میں نے کشمکش کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"پلیز خاور۔۔۔!" وہ بصد منت بولی "کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا جس پر مجھے اپنے کیے پر ندامت ہونے لگے۔ یقین کرو یہ کچھ بھی نہیں ہے' یہ تو محض خراج ہے تمہارے اس جذبے پر جس کے تحت تم اپنی ذات کے تقاضے فراموش کر کے اتنے سارے لوگوں کی خوشیوں اور خوشحال زندگیوں کے لیے جدوجہد کر رہے ہو۔ اگر تمہارے مستقبل کے ساتھ اتنے سارے لوگوں کا مستقبل مشروط نہ ہوتا تو شاید میں تمہارا ساتھ نہ دیتی کہ اس صورت میں تمہارا یہ اقدام تمہاری ذاتی آسائش کے لیے ہوتا تھا۔ مگر تم پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں تمہیں اپنے بہن بھائیوں کا مستقبل سنوارنا ہے۔ معذور بیوہ بہن کے بچوں کی پرورش کرنا ہے قربانی اور ایثار کے اس سمندر میں میرا حصہ تو اک قطرے کی مانند ہے اصل مرحلہ تو تمہیں ہی طے کرنا ہے ناں۔"

"تھینکس۔۔۔" ایک عجیب سے جذبے سے مغلوب ہو کر میں اٹھا اور اس کے مقابل آ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"بس بس اب ڈائیلاگ جھاڑنے کی کوشش مت کرنا میں جانتی ہوں تمہیں اس کی الف بے بھی نہیں آتی' میں دیکھوں ذرا یہ عمر کیا کر رہا ہے بھلا۔" وہ اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں بات بدلتی ہوئی ہاتھ چھڑا کر اندر بڑھ گئی تھی۔

پیسہ تو بہرحال اپنی جگہ ایک مسلم ضرورت ہے مگر سچ بات ہے پیسوں کی مدد کے علاوہ بھی جس طرح اس نے مجھے بلڈ اپ کرنے میں اپنی ہمتیں مجتمع کرنے میں اور پرعزم بنانے میں مدد دی تھی اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا کس کس طرح سے مجھ جیسے شکستہ حال تقدیر کے مارے بندے کو کول ڈاؤن کرنے کا سبب بنی تھی۔

ایئرپورٹ تک وہ میرے ہمراہ تھی۔ عمر اور اطہر کے ساتھ اماں جی اور آپا لوگوں سے الوداعی ملاقات بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اماں جی رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں اور میرا دل ان کی ہر سسکی پر ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

ایسے میں وہی تھی جو سب کو تسلیاں دے رہی تھی حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ میں بھی دور نہیں رہا تھا لمحہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

والوں سے اور اب تو اتنی دور جا رہا تھا جہاں سے واپس لوٹنے کا بھی کچھ یقین نہیں تھا۔ بڑے ضبط اور جبر سے کام لے کر اپنے اندر امنڈتے شور مچاتے آنسوؤں کو اندر ہی محصور کر کے ماں بہنوں سے رخصت لی تھی۔

”تم بالکل فکر مت کرنا ادھر کی‘ میں موجود ہوں نا‘ سب سنبھال لوں گی پھر ماشاء اللہ عمر بھی اچھا خاصا سمجھ دار ہے۔ دیکھو گھبرا مت جانا شروع شروع میں تمہیں وہاں کا ماحول اجنبی لگے گا یہاں کا خیال بہت ستائے گا مگر آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے اور دیکھو جتنے اچھے یہاں سے جا رہے ہو اس سے زیادہ اچھا بن کر واپس لوٹنا ہم سب تمہارے منتظر رہیں گے۔“

عمر اور اطہر کو گلے لگا کر پیار کیا‘ جاتے سمے ایک الوداعی نگاہ اس پر ڈالی سفید سادہ سے کاٹن کے شلوار سوٹ میں اس کا سادہ بے ریا مخلص اور ہمدرد وجود کتنا نمایاں کتنا پرکشش آمیز لگ رہا تھا اتنی عام سی ہوتے ہوئے بھی کتنی منفرد کتنی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ جانے کیوں دل میں ایک عجیب دلگداز جذبے نے سر ابھارا‘ موقع ہوتا تو اس وجود کو ایک بار بازوؤں میں لے کر اس پر مہر تشکر ثبت کر دیتا۔

”اللہ حافظ خاور! پہنچ کر خیریت کی اطلاع ضرور دینا۔“ اس نے بڑے حوصلے سے مسکرا کر الوداع کیا۔

یہ اس کی باتوں‘ اس کے جذبوں‘ اس کے خلوص کی روشنی تھی جس نے پرائے دیس میں مجھے بھٹکنے نہیں دیا۔ میرا عزم بیدار رکھا۔ جب بھی تھک کر مایوس ہونا چاہا وہ مہربان باتیں‘ وہ ولولے جگاتا لہجہ سماعتوں میں گھل جاتا‘ کبھی ایسا بھی ہوا جب کڑی مسافت طے کرتے کرتے میں نے ایک جگہ تھک کر پڑاؤ ڈالنے کا سوچا اور ادھر سے اس کا ”نامہ“ آجاتا‘ میں پھر سے رخصت سفر باندھ لیتا۔

نفیس اور عمر کے خطوط سے پتا چلتا رہا کہ وہ واقعی اپنا کہا پورا کر رہی تھی گھر کے انتظام و انصرام اور گھر والوں کے پرابلمز کے بارے میں برابر خبر رکھتی تھی ایم اے کرنے کے بعد اس نے بینک میں جاب کر لی تھی۔

نفیس کی شادی پر کوئی ڈیڑھ برس بعد میں واپس لوٹا تو بڑی حد تک معاشی بوجھ ہلکا ہو چکا تھا نفیس کا سارا جہیز تیار تھا۔ بچوں کی پڑھائیاں ٹھیک ٹھاک چل رہی تھیں گھر کا بجٹ نارمل ہو چکا تھا اور گھر والوں کے چہروں پر خوشی کے عکس جگمگا رہے تھے میرا دل بھی مسرور ہو گیا۔ اماں جی بتا رہی تھیں نیما نے بہت ساتھ دیا یہ سب اسی کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ ہے۔ بہت خیال رکھا ہے اس نے۔

”وہ کہاں ہے ہوسٹل میں ہو گی۔“ میں نے گھڑی دیکھ کر قدرے بے چینی سے دریافت کیا۔

”ارے نہیں‘ اپنے بینک سے چھٹی لے کے گئی ہوئی ہے پرسوں سے جہلم وہاں اس کے کوئی جاننے والے ہیں حال ہی میں ابوظہبی سے آئے ہیں ان کا پتا کرنے کے لیے گئی ہے۔“

”تو کیا شادی میں شریک نہیں ہو گی وہ؟“ میرا دل جانے کیوں اسے روبرو دیکھنے کو مچلنے لگا تھا۔

”کیوں نہیں شریک ہو گی بھلا پرسوں شام تک آجائے گی واپس۔“

اور مجھے یہ دو دن کا عرصہ بہت طویل لگا۔ میں خوش تو تھا کہ ایک ذمہ داری سے بحسن و خوبی فارغ ہو رہا ہوں مگر میری یہ خوشی نامکمل سی لگ رہی تھی۔ سب نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ میری قربانیوں کو سراہا تھا مگر میرا دل ہنوز تشنہ تھا یہ کسی اور ہستی کی طرف سے خراج کا طالب ہو رہا تھا۔ ”اسے کہتے ہیں ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہمیں خبر ہی نہ تھی ورنہ کوئی استقبالی پروگرام ترتیب دینے کے لیے ضرور ٹھہر جاتے۔ اور سنائیے کیسے مزاج ہیں جناب خاور مغل صاحب کے۔“

اس کی زندگی سے بھرپور بشاش آواز بہار کا جھونکا بن کر کمرے میں پھیل گئی تھی۔ اس کے اندر داخل ہونے پر جس بے قراری سے میری نگاہوں نے اس کے سراپے کو اپنے حصار میں لیا تھا میرے لیے بذات خود بڑا حیران کن تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹنا بھول گئی تھیں۔

وہ ویسی ہی تھی‘ پہلے کی طرح سادہ رو‘ سادہ مزاج سادہ

لباس اپنے مخصوص لاپروا انداز میں سب سے مخاطب کبھی ادھر آ رہی ہے تو کبھی ادھر یہاں وہاں ہر جگہ ہر ایک کے ساتھ اور ہر طرح کی صورت حال میں ہم قدم۔

”نفیس کا معاملہ تو اللہ نے نمٹا دیا بس اب اچھی سی بڑی سی کوٹھی خریدنا رہ گئی ہے اس کو بھرنے کے لیے سامان چاہیے پھر گاڑی بھی خریدنا ہے اور فریال کے لیے کچھ سامان چاہیے‘ اب یہ فلیٹ بھی چھوڑ ہی دینا ہے کب تک اس کابک میں رہیں گے۔“ اماں مستقبل کے منصوبے بنا رہی تھیں۔

”گویا تین نئے ٹارگٹ ہیں ماموں کے لیے۔“ فریال شوخی سے مسکرائی۔

”گھر‘ گاڑی اور گھریلو سامان۔“

رات کو وہ حسب معمول جانے لگی تو بلقیس آپا نے عمر کو پکارا۔

”عمر جاؤ نیما کو چھوڑ آؤ نیچے تک۔“ اس کی گاڑی کی چابی تو تھی اس کے ہاتھ میں۔

”میں چھوڑ آتا ہوں۔“ میں عمر کے آنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اچھا بھئی‘ اللہ حافظ کب تک ہو یہاں؟“ نیچے پہنچ کر اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے خوشدلی سے دریافت کیا۔

”دو تین دن اور ہوں چابی مجھے دو‘ میں ڈرائیو کرتا ہوں۔“

”ارے نہیں‘ میں چلی جاؤں گی آرام سے‘ تم پھر واپس کیسے آؤ گے؟“

اس نے میری تکلیف کا خیال کرتے ہوئے منع کر دیا۔

”خیر ہے‘ آجاؤں گا تم بیٹھو۔“ میں چابی لے کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

”اگلی بار آؤ گے تو ان شاء اللہ العزیز اپنی کرولا کا دروازہ کھول کر شان سے مجھے بیٹھنے کی آفر کرو گے۔“

ہمیشہ سے دوسروں کا مان بڑھانے والی عادت اس کے خمیر میں شامل تھی۔

سارے راستے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں وہ گھر کے معاملات ڈسکس کرتی رہی یہاں کے حالات بتاتی رہی۔

”ہیں۔۔۔ یہ کیا‘ یہ تو ہاسٹل نہیں ہے تم شاید راستہ بھول بیٹھے ہو۔“ گاڑی کے رکنے پر وہ حیرت سے پلکیں جھپکا کر مخاطب ہوئی تھی۔

”یہ آئس کریم پارلر ہے‘ یہاں آئس کریم کھائی جاتی ہے اور بے فکر رہو میں راستہ بھی ہرگز نہیں بھولا۔“ میرے انداز میں حد درجہ اطمینان تھا۔

”آؤ چلتے ہیں مگر ایک منٹ ایک امانت ہے تمہاری میرے پاس۔“ میں نے کوٹ کی اندرونی پاکٹ سے اپنا والٹ نکالا ساتھ ہی سائیڈ کی دوسری پاکٹ کھنگال کر اندر سے ایک چھوٹا سا خوب صورت سے ریپر میں لپٹا گفٹ باہر نکالا۔

اس نے میرے ایک ہاتھ میں رقم کے پھولے ہوئے لفافے اور دوسرے میں ننھے سے گفٹ کو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھا تھا۔

”نیما یہ ایک حقیقت ہے کہ جو کچھ تم نے میرے لیے میری فیملی کے لیے کیا ہے اس کا بدلہ مجھ جیسا بے فیض شخص چکا ہی نہیں سکتا میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ تمہارے احسانات‘ تمہاری مہربانیوں کے صلے میں کچھ پیش کر سکوں تاہم رسم دنیا کو یہ تمہارا قرض۔“

میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رقم والا لفافہ اس کے پرس میں ڈال دیا۔

”ہاں اور یہ میری خوشی ہے‘ ایک چھوٹا سا معمولی سا تحفہ پلیز اور اب انکار نہیں کرنا۔“

مگر یہاں بھی وہ میرا مان بڑھا گئی‘ خوش دلی سے میرے ہاتھ سے گفٹ لے کر کھولتے ہوئے بولی۔

”بھئی واہ! لینے سے انکار کون کافر کرتا ہے۔“ اس کے ہاتھ بڑی سرعت سے ریپنگ پیپر کھول رہے تھے۔

”واؤ زبردست۔“ نگینوں جڑا خوب صورت ڈیزائن والا بریسلٹ دیکھ کر اس نے مسرت انداز میں کہا۔ میرا دل شادماں ہو گیا حالانکہ میں جانتا تھا اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاس ایک سے بڑھ کر ایک بیش قیمت اور خوب صورت جیولری موجود تھی مگر جس طرح اس نے میرے خلوص کی قدردانی کرتے ہوئے نہ صرف تحفہ پسند کیا تھا بلکہ نہایت اشتیاق کے عالم میں اسی وقت پہن کر بار بار اپنا بازو دیکھ رہی تھی اس کے اس عمل نے مجھے بڑی انوکھی سی سرشاری بخشی تھی۔

آئس کریم کھاتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے میں اسے وہاں کے قصے سناتا رہا۔ اس کی معیت میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔

دوسری بار جب میں وطن لوٹا تو اتنا کما چکا تھا جس سے گھر والوں کے خوابوں کی تعبیر ممکن ہو سکتی تھی۔ اس بار میں امریکہ کو مکمل طور پر خیرباد کہہ کر لوٹا تھا۔ اس مختصر عرصے میں گھر کے افراد میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ انہیں پیسہ استعمال کرنے کا سلیقہ آچکا تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی ایک شاندار سی کوٹھی اور نئی ٹیوٹا کرولا گاڑی پسند کی جا چکی تھی۔ میرے آنے کی دیر تھی کہ بے منٹ کے بعد فلیٹ چھوڑ کر نئے گھر میں منتقل ہو گئے عمر اور اظہر کی فرمائشی اشیاء سے مزین کرنے کے لیے رقم اماں جی اور فریال لوگوں کے سپرد کر دی انہوں نے اپنی مرضی سے گھر سیٹ کرایا۔

سب گھر والوں کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ جدید طرز کے قیمتی ملبوسات' اچھا کھانا پینا اور آسائش و آرام نے گویا سب کی صورتیں ہی بدل دی تھیں۔ میں خوش تھا کہ گھر والوں نے جیسے سکھ کے خواب دیکھے تھے بالآخر میں انہیں ان کی تعبیر دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

رقم میرے پاس موجود تھی سو بسم اللہ کر کے بزنس شروع کیا۔ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر ہی پھاڑ دیتا ہے بزنس بہت جلد چل نکلا اور یوں گھر میں دولت کی ریل پیل بڑھتی ہی چلی گئی میرے سیٹ ہوتے ہی اماں اور آپا لوگوں کی میری شادی کی فکر ہوئی' میں چاہ رہا تھا پہلے فریال کی شادی ہو جاتی مگر فریال کی ضد تھی ابھی وہ جاب کرنا چاہتی ہے۔ اماں نے بھی کہا۔

"چلو ایک آدھ سال اسے شوق پورا کر لینے دو' یوں ساعمر نکلی جا رہی ہے یوں بھی اصولاً" اب تمہاری باری ہے میں اپنے چاند سے بیٹے کے لیے بہت حسین پڑھی لکھی اور کسی اونچے گھر کی لڑکی لاؤں گی۔ ایسی کہ سب دیکھتے رہ جائیں۔"

میں ان دنوں عمر کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھجوانے کے چکروں میں تھا خیال تھا کہ ادھر ایک تو ٹک کر پڑھ لے گا دوسرا جاب کی پرابلم نہیں رہے گی۔

مجھے خبر بھی نہ تھی کہ اماں اور آپا مع بھابھیوں کے ان دنوں میرے لیے لڑکی تلاش کرنے کی مہم چلا رہی ہیں اور کسی ایک کو منتخب بھی کر چکی ہیں۔ خبر تو تب ہوئی جب انہوں نے کسی شہرین نامی لڑکی کے بارے میں مجھے بتایا اور اس کی تصویر دکھا کر رائے لی۔

"بے انتہا خوب صورت ہیں شہرین' ماموں۔"

فریال بڑی خوش ہو کر اطلاع دے رہی تھی۔

"اور امیر بھی بہت ہیں اتنا بڑا گھر ہے ان کا۔" بلقیس آپا نے رائے دی۔

"کم عمر بھی ہے میرے بیٹے کے ساتھ خوب جچے گی۔" اماں میری نظر اتار رہی تھیں میں ان لوگوں کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے جملے تو کان میں پڑ رہے ہوں مگر مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

گھر میں کافی چرچا رہنے لگا شہرین کے حسن جہاں سوز کا' اس کے باپ کی امارت کا اس کی نازک مزاجی کا۔ مجھے یہ سب کچھ بے زار کن اور ناگوار گزر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن جب اماں نے سنجیدہ ہو کر میری رائے طلب کی تو میں نے بالآخر تامل کرتے ہوئے دل کی بات بتا ہی دی۔

"کیا۔۔۔؟" اماں ہی کیا سارے گھر والے بھونچکا رہ گئے اور مجھے ان کی حیرت پر حیرت ہونے لگی۔ میرے خیال میں تو یہ سن کر انہیں خوشی سے کھل جانا چاہیے تھا۔

"تو بھلا بتاؤ کیا بے وقوفوں والی بات کرتی ہو تم نیما سے شادی کرو گے۔" بالآخر بلقیس آپا نے ابتدا کی۔

"کمال کرتے ہو بچے اتنے بڑے بزنس مین ہو اتنا

نام ہے تمہارا بھلا لوگ کیا خیال کریں گے یہ ہے تمہاری پسند۔" اماں جی کے انداز نے میرے خون میں کھولن پیدا کر دی۔

"مجھے آپ کی منطق سمجھ میں نہیں آئی اسے اپنانے سے میرے نام یا بزنس پر کیا اثر پڑے گا۔ بلاشبہ وہ اتنی اچھی ہے کہ اسے اپنانے والا اپنی قسمت پر رشک کرے گا۔ اس میں کیا برائی ہے کیا عیب ہے۔"

"ماموں کیا آپ انہیں ہماری ممانی بنائیں گے؟ میری دوستیں کیا کہیں گی۔" فریال نے منہ بسور کر مایوسی کے عالم میں کہا۔

"کیوں کیا ۔۔۔ کہیں گی۔" مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا گھر والوں کے انداز پر۔

اماں میرا غضب ناک موڈ دیکھ کر بڑے سبھاؤ سے بات بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے بچے' نیما بہت اچھی لڑکی ہے بڑا ساتھ دیا ہے اس نے ہمارا مگر وہ تیری دلہن نہیں بن سکتی۔ دیکھ ناں تو تو ایسے شہزادوں جیسے نقوش کا مالک ہے وہ عام سی شکل و صورت والی ہے۔ پھر عمر بھی اس کی اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ ماں باپ کا پچھلے سال ابوظہبی میں ہی انتقال ہو گیا اب اس کے پاس رہا ہی کیا ہے۔ اب ہمارا اتنے بڑے گھرانے کے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے شہر کے معززین میں ہمارا شمار ہوتا ہے ایسی ویسی بہو لے آئے تو کیا دنیا والے تمسخر نہیں اڑائیں گے سو سو باتیں بنائیں گے لوگ۔"

اماں جی کی بات سن کر میں نے نہایت بے یقینی اور تاسف کے عالم میں انہیں دیکھا تھا۔ باقی سب لوگوں کے چہروں کے تاثرات بھی اماں کی باتوں کی خاموش تصدیق کر رہے تھے۔

"اماں! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ شکل و صورت اسی کی جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے اور عمر میں تو وہ مجھ سے تین چار سال چھوٹی ہی ہو گی' امیر والدین کے انتقال کے بعد وہ خدانخواستہ غریب تو نہیں ہو گئی۔"

ان کی خود غرضانہ سوچ نے مجھے سلگا کر رکھ دیا تھا۔

"بچے! آج کل رشتے کرتے ہوئے یہی سب کچھ دیکھا جاتا ہے شکل و صورت والی ہو' کم عمر ہو اور امیر ہو' مرد کی عمر کو کون پوچھتا ہے تو تو آج سے دس سال بعد بھی ماشاء اللہ اسی طرح جوان اور خوب صورت دکھائی دے گا۔ مرد کی عمر کو زنگ نہیں لگتا عورت چاہے اپنے مرد سے دس پندرہ سال چھوٹی ہو تو بھی جوڑی چل جاتی ہے جب تجھے اتنی حسین امیر کم عمر لڑکیاں مل سکتی ہیں تو تو کیوں اس معمولی سی بے آسرا' بے ٹھکانا لڑکی کے لیے دل چھوٹا کرتا ہے۔"

مجھے لگا جیسے کسی نے بم میرے اعصاب پر پھوڑ دیا ہو۔ یہ میری ماں تھیں جو کل تک مجھے نیما سے چپقلش رکھنے پر پھٹکارا کرتی تھیں اس کے باپ کے بابا جان پر احسانات گنوا کر تا رتی تھیں کل تک جس لڑکی کی اعلا ظرفی' فراخدلی اور محبت کرنے والی فطرت کے گن گا گا کر جیا کرتی تھیں آج وہ ان کی نظروں میں معمولی اور بے آسرا لڑکی بن گئی تھی۔ یا خدا یہ دولت اس طرح بھی ذہنوں کی کایا پلٹ سکتی ہے میں سکتے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"اگر آپ کا حافظہ آپ کا ساتھ دیتا ہے تو ذرا یاد کیجیے اس معمولی لڑکی نے ہمارے گھر کے لیے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ آج ہم جو کچھ ہیں اسی کی قربانیوں اور ایثار پسند طبیعت کے باعث ہیں۔ ذرا یاد کیجیے یہی معمولی لڑکی جب آپ کے گھر کے حسرت زدہ ماحول میں آ کر اجنبیت کا احساس مٹا دیا کرتی تھی۔ جو تحائف کے نام سے گھر بھر کے کپڑے اور کھانے پینے کا اہتمام کرتی تھی' جو آپ کی اولاد کی فیسیں اور کاپیاں کتابیں دے کر ان کی مدد کیا کرتی تھی جو بغیر احسان جتلائے آپ کے گھر کے بجٹ کو پورا کر دیا کرتی تھی۔ جو آپا کے علاج کے لیے مہنگی سے مہنگی دوائیاں خرید کر لاتی تھی۔ کوئی بیمار پڑتا تھا تو خود اپنی گاڑی پر اپنے پلے سے خرچہ کرتی تھی۔ جو اتنے امیر باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود آپ کے گھر کی روکھی سوکھی من و سلویٰ سمجھ کر کھایا کرتی تھی۔ جس نے ایسے کڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

وقت میں مالی امداد کی جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ جس کی رقم سے میں اس قابل ہو سکا کہ باہر جا کر آپ لوگوں کو اس قسم کے ٹھاٹھ کراؤں۔"

غم و غصے سے میرا چہرہ سرخ پڑتا جا رہا تھا۔

"تو کیا ہوا تم نے واپس تو کر دی ہے اس کی رقم رکھ تو نہیں لی ناں ہم نے۔"

آپا کی بے حسی پر میرا دل کڑھ کر رہ گیا۔

"بات رقم کی نہیں ہو رہی ہے آپا!" میں نے بمشکل تمام اپنا اشتعال ضبط کیا تھا۔ "ایسی ہزار رقمیں بھی میں اسے واپس کر دوں تب بھی اس کے احسانات کا بدلہ نہیں اتارا جا سکتا مالی مدد کا بدل ہو سکتا ہے۔ مگر جذباتی مدد کا کوئی بدل نہیں ہوا کرتا۔ اس کے جذبوں کے خلوص، محبت اور اس کی بیش قیمت ہمدردیوں کو سامنے رکھا جائے تو ہمارے گھر کے ایک ایک فرد کا بال بال اس کے قرضے میں جکڑا محسوس ہو گا۔"

"اے تو ہم نے بھی تو اس کے لیے کچھ کم نہیں کیا۔ یہ تھوڑا ہے ہم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی ماں باپ سے اتنی دور تھی ہم نے اس کی عزت کی حفاظت کی اس کو اتنی محبت دی وہ رشتوں کی ترسی ہوئی تھی۔ بھلا اور کسی کے ہاں اسے اتنا آرام اتنا پیار ملنا تھا!"

اماں کے بے حسی اور خود غرضی کے لبادے میں لپٹے جملوں نے میرے اندر آگ سی دہکا دی۔

"اب کیا ان کے احسان کے بدلے میں ہم آپ کی زندگی تباہ کر دیں۔" فریال نے بھی بڑا پن دکھاتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔

"تم چپ رہو اور جا کر اپنا کام کرو۔" میں نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ اس طرح غرا کر بات کی تھی۔ وہ ماموں کے مشتعل ہونے پر خائف سا ہو کر اندر چلی گئی۔

"ہاں تو صحیح ہی تو ہے۔ بھلا شادی کوئی گڈے گڑی کا کھیل تو نہیں ہوتا ناں کہ جیسے بھی چلاؤ نبھ جائے گی۔ یہ بات واضح ہے کہ نیما تمہارے ساتھ کسی لحاظ سے سوٹ نہیں کرتی اور تمہارے ساتھ تمہارے اسٹینڈرڈ اور اسٹیٹس کے مطابق کوئی خوب صورت سی امیر زادی ہی بچے گی۔"

آپا کو اپنی بچی کی بے عزتی پسند نہیں آئی تھی سو چیں بہ جبیں ہو کر بول پڑی تھیں۔

"زندگی مجھے گزارنا ہے اور میں یہ جان چکا ہوں کہ میرے ساتھ نیما کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی کسی بھی طبقے کی اور کوئی زہرہ جبیں نہیں چل سکتی۔ نہ صرف میرے ساتھ بلکہ آپ لوگوں کے ساتھ بھی کسی بڑے گھر کی نخریلی حسینہ کا گزارا نہیں ہو گا۔ نیما تو ہر لحاظ سے فٹ ہے یہاں۔"

"ہم کر لیں گے بھیا گزارا۔" آپا چمک کر بولیں۔

"ہمیں تو بس شیریں جیسی خوب صورت اور نازک سی بھابھی چاہیے۔"

"تم دیکھ تو لو اسے ایک بار ملو تو سہی اتنی خوب صورت اور کم عمر ہے وہ کہ۔" اماں مجھے للچا رہی تھیں۔ میں بے بسی سے سر پکڑ کر رہ گیا۔

"اماں! آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔ کیوں آپ کی آنکھوں پر امارت اور حسن کی پٹی پڑ گئی ہے۔ جس قسم کا بندہ ہوں اس لحاظ سے میں نیما جیسے مزاج کی حامل لڑکی کے ساتھ ہی ایڈجسٹ ہو سکتا ہوں وہ مجھے سمجھتی ہے۔ اچھی طرح۔ میرے خیالات کا پرتو ہے۔ نہ مجھے حسن کی طلب ہے نہ امارت کی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مجھے اپنے مزاج کے موسموں کا ساتھی چاہیے اور وہ صرف نیما ہی ہو سکتی ہے۔"

میرے حتمی انداز نے اماں کو بھڑکا دیا۔

"مگر ہم ایسی معمولی صورت شکل والی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتے۔ آخر چار بندوں میں ہمیں بھی منہ دکھانا ہے۔ شیریں تمہیں نہیں پسند تو کوئی اور دیکھ لیتے ہیں مگر وہ نیما کسی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔ غضب خدا کا سارے جاننے والے لعن طعن کریں گے کہ بہو ملی تو ایسی گری پڑی لاوارث ہم سے دوسروں کی باتیں نہیں سنی جاتیں۔ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں آخر تمہیں ماں بہنوں کو ناراض کر کے اپنی پسند کی دلہن لانا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہمیں چھوڑ دو دوبارہ اسی فلیٹ میں۔ وہاں رہ لیں گے تم یہاں اپنی دل کی ملکہ کے ہمراہ ہی خوش رہنا اور ہم سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا۔"

ماں کا سرد مہر انداز مجھے اندر سے باہر تک بے بسی کی آگ میں جھلسا گیا۔ اسی لمحے کوئی اندر داخل ہوا۔

یہ نیما تھی۔ دھواں دھواں چہرہ لڑکھڑاتی ہوئی چال، بے اوسان انداز، وہ اندر داخل ہو کر گرنے کے سے انداز میں قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے بغور اس کے لرزتے کانپتے وجود کو دیکھا اور جیسے میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

مجھے عجیب سا احساس تو ہوا تھا جیسے کوئی دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑا ہو کافی دیر سے مگر پھر اماں سے بحث و مباحثے اور گرما گرمی میں دوبارہ دھیان نہیں گیا۔ تو کیا اس نے ساری باتیں سن لی ہیں۔

"نہیں میرے خدا۔ اس کو اپنی ایثار پسندی اور ہمدرد فطرت کی اتنی کڑی سزا نہیں ملنی چاہیے۔"

میرا رواں رواں مرتعش تھا مگر دعا گو ہو کر رہ گیا تھی۔

اس کا ہر انداز پکار رہا تھا کہ یہی بات تھی۔

"گرمی میں آئی ہوں ناں تو لو لگنے سے اعصاب ہی الٹ گئے میرے۔"

کتنی دیر بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی مگر اس کی آواز کی مخصوص کھنک کی جگہ کھوکھلا پن اور لرزش مجھ سے پنہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ جب سے نئے گھر میں شفٹنگ ہوئی تھی گھر والوں کی اس کے ساتھ پذیرائی کی وہ پہلے والی گرم جوشی اور والہانہ انداز نہیں رہے تھے وہ بھی شاید محسوس کر چکی تھی اس لیے بہت کم کم آتی تھی۔

حسب معمول وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی خود کو مصروف اور بے خبر ظاہر کرتی رہی مگر اس کے روئیں روئیں سے پھوٹتی بے چینی اور اضطراب کی موجیں بغور دیکھنے پر واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھیں۔

"اچھا آنٹی! اب چلتی ہوں۔" تھوڑی دیر بعد وہ بیگ اٹھاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاتیں تھوڑی دیر۔" اماں نے رسما" کہا ان کے انداز میں بڑا ٹھنڈا پن اور بے مہری تھی۔ مگر اس نے نہایت تحمل اور اعلا درجے کی فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔

"ضرور رک جاتی آنٹی! لیکن کچھ کام ہے مجھے، دراصل ان دنوں میں اپنی جہلم ٹرانسفر کرانے کے چکروں میں ہوں۔ وہاں کچھ جان پہچان کے عزیز موجود ہیں دعا کیجئے گا۔ میرا کام ہو جائے۔" پھر وہ میری طرف پلٹی تھی۔

"اور ہاں بھئی جناب خاور مغل! آپ شادیانے کب بجوا رہے ہیں۔ ذرا جلدی جلدی کر ڈالیے یہ کام تاکہ ہم بھی جاتے جاتے آپ کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔"

میں نے سر اٹھا کر گہری نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔ وہی بے لوث، بے ریا مسکراہٹ آنکھوں میں کمال درجے کا ضبط میں کچھ کہنا چاہتا تھا اسے روکنا چاہتا تھا اس کے پیچھے آ کر ساری حقیقت منکشف کرنا چاہتا تھا مگر کسی نادیدہ طاقت نے میرے قدموں کو زمین میں گاڑ دیا تھا۔ وہ چلی گئی اور میں اسے دروازے تک چھوڑنے کی ہمت بھی اپنے اندر پیدا نہ کر سکا۔

کتنا بے توقیر کر دیا تھا اماں اور آپا لوگوں کے خیالات نے اسے۔ کس طرح اس کی عزت نفس کو روندڈالا تھا۔ اس کی انا، اس کی خودداری پر کس طرح تازیانہ لگایا تھا۔ اسے خود اپنے نظروں میں کتنا گرا دیا تھا۔ میں پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ وہ جو سب کو جوڑنے والی تھی، مرہم رکھنے والی تھی جو ہمدم و ہمراز اور چارہ گر و دمساز تھی سب کی کس بے دردی سے اس کے خلوص اس کے ایثار کا مذاق اڑایا گیا تھا ان زہریلی کٹھور باتوں کے ڈنک کس کس طرح اس کی روح کو زخمی کر رہے ہوں گے۔

بے چینی، اضطراب اور دکھ کی لامتناہی چادر نے میرے پورے وجود کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

محض دو ہفتے بعد وہ رخت سفر باندھے تیار تھی۔ میں اس عرصے میں ہتھیار ڈال چکا تھا۔

"ارادہ تھا کہ تمہاری شادی تک رک جاؤں مگر ٹرانسفر آرڈر زیادہ ہی جلدی آ گئے۔ بہرحال میری طرف سے بھی بہت سارا خوش ہو لینا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاتے سمے وہ الوداعی ملاقات کے لیے آئی تو سب سے مل کر بڑے بشاش سے انداز میں مجھے چھیڑا تھا۔ مکینوں کے دلوں کی کدورتوں اور بدگمانیوں سے آشنا ہوتے ہوئے بھی ان سے اتنی لگاوٹ اور اتنے خلوص سے ملنا بڑے دل گردے والے لوگوں کا کام ہوا کرتا ہے۔

"اماں جی! آپ لوگوں کے ہاں مجھے جو پیار محبت اور احساس تحفظ ملا میں اس کا کوئی بدلہ نہیں دے سکتی آپ کو' آپ لوگوں کا بہت شکریہ کہ اتنا عرصہ مجھے غریب الوطنی کا اور بے آسرا ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ میں آپ سب لوگوں کو بہت مس کروں گی۔ مجھ سے اگر نادانستگی میں کوئی گستاخی سرزد ہو گئی ہو تو چھوٹی سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔"

سب سے مل کر وہ ہوا کے جھونکے کے مانند خاور والے نکل گئی اور جیسے میری زندگی سے بھی خوشی اور سکون کی برکھا ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ جانے سے پہلے اس نے پورے گھر کا ایک چکر لگایا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو کھو دینے کا ہولناک احساس میری رگ رگ میں انگارے دوڑا رہا تھا۔ یونہی سائیڈ ٹیبل پر رکھے سفید لفافے پر نظر پڑی کھولا۔

عزیزم خاور!

قیمت نہ لگا جذبۂ ایثار طلب کی
ہر شے کو فقط چشم خریدار سے مت دیکھ
میں اور کہیں صاف دکھائی نہیں دوں گا
ہٹ کر مجھے آئینہ کردار سے مت دیکھ

تمہاری خیر اندیش۔



وہ کب کے خاموش ہو چکے تھے مگر تانیہ ہنوز جیسے کسی طلسم کے زیر اثر خود کو اسی ماحول میں جذب پا رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گزرا ہو وہ خود کو اس کہانی کا ایک کردار سمجھتے ہوئے شکست و ریخت کے ان جذبات کو مکمل طور پر محسوس کر رہی تھی۔

پھر اس نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا' خاور مغل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ان کے چہرے اور آنکھوں میں کیا تھا؟

تانیہ سے زیادہ دیر تک دیکھا نہیں گیا۔

ملال' حسرت' تشنہ کامی' تاسف' دلگرفتگی اور شکستہ پائی کی دھول نے ان کے چہرے کے سارے رنگ نچوڑ لیے تھے۔ ان کی سرخ وحشت زدہ آنکھوں میں ویرانیوں کے سائے رقصاں تھے۔

اس سمے وہ اتنے ٹوٹے پھوٹے اتنے شکستہ نظر آ رہے تھے کہ تانیہ کا دل شدت غم سے بیٹھنے لگا۔

"تو یہ تھا سارا قصہ بے بی۔ اب تم جان ہی چکی ہو گی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ اپنے رویوں میں کس حد تک حق بجانب ہوں اور دیکھ لو ان کو ان کی ہوس زر اور ظاہری آن بان نے کتنا بے سکون کر کے رکھ دیا ہے۔ اب مجھ سے شاکی کیوں ہوتے ہیں۔ بھگتیں اب اپنا بھگتان۔ انہوں نے خود اپنے لیے یہ سامان پیدا کیا ہے۔ اپنے ہی جال میں پھنس چکے ہیں۔ اب وہ جذبات مجھ سے طلب کرتے ہیں جنہیں عرصہ ہوا خود اپنے ہاتھوں سے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ میرے اندر کیا باقی رہا ہے ان کو دینے کے لیے دل کے سارے خزانے تو لوٹ لیے۔ جذبات کے سارے الاؤ بجھا دیے۔ اب میں اندر باہر سے برف کے تودے کی صورت اختیار کر چکا ہوں۔ کوئی چیز اب مجھے نہیں پگھلاتی' نہ آنسو' نہ آہیں' نہ جذبے' نہ خلوص۔ مجھے خود اپنے آپ سے محروم کر ڈالا ہے ان لوگوں نے۔"

ان کی آنکھوں کی وحشتیں بول رہی تھیں۔

"آؤ بے بی گھر چلتے ہیں۔" پھر وہ اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے اسٹیئرنگ وہیل کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سارے راستے دونوں گم صم سے بیٹھے رہے۔

گاڑی سے اترتے ہوئے پہلے اس کی نظر سیڑھیوں کے پاس کھڑی شہرین کی جانب گئی پھر بے اختیار کلائی پر بندھی گھڑی پر جا ٹھہری اور وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ رات کے تقریباً" ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔

خاور مغل تو چابی ہاتھ میں جھلاتے آگے بڑھ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی کچھ ہچکچا کر شہرین کے پاس سر جھکا کر مجرمانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"سوری بھابھی! کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔"

"دیر تمہیں نہیں مجھے ہوئی ہے جو تمہارا کھیل نہیں سمجھ سکی۔ میں تمہیں بہت معصوم اور سادہ مزاج کی لڑکی خیال کرتی تھی۔"

"خبردار شہرین مزید ایک لفظ مت کہیے گا۔ کسی کی بے غرضی کو یوں سر عام نیلام نہیں کرتے۔"

وہ اسی لمحے پلٹ آئے تھے۔ تانیہ کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"دوسروں کا تو آپ کو بہت خیال ہے جس کا رکھنا چاہیے اس پر تو کبھی ایک لمحہ رک کر تفصیلی نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی۔" شہرین کے سلگتے انداز اس کی اندرونی کیفیت کے غماز تھے۔

"خیال وہاں رکھا جاتا ہے جہاں دل رکھے جاتے ہیں' مان رکھے جاتے ہیں اور یہ کوئی جادو کا کھیل نہیں ہوتا کہ چھڑی گھمانے سے مطلوب سامنے آ جائے اس کے لیے بڑی تپسیا کاٹنی پڑتی ہے۔ بہرحال آپ کی تسلی کے لیے بتا دوں کہ یہ وہ نہیں ہیں جس سے آپ کو خائف ہونا چاہیے۔"

وہ کہہ کر رکے نہیں تھے تیز تیز قدموں سے اندر ہو گئے تھے اور اسی لمحے تانیہ بھی فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اس گھٹن زدہ بدگمان فضا میں زیادہ دیر نہیں رہ سکے گی۔ ڈیڈی پر زور دے کر وہ اپنا ٹرانسفر لاہور سے پنڈی میڈیکل کالج میں کروا سکتی تھی۔ وہ جہلم سے ویسے بھی بہت نزدیک پڑتا تھا۔

"جا رہی ہو بے بی تم بھی۔" جاتے سمے وہ ان کو وش کرنے آئی تو انہوں نے تھکے تھکے انداز میں دھیمے سے مسکرا کر کہا۔

وہ سوچنے لگی کیا جواب دے۔

"چلو تمہاری مرضی۔ لیکن یہ یاد رکھنا ہم تمہیں دوبارہ ضرور یہاں لائیں گے اور بہت جلد لائیں گے۔" انہوں نے ہلکے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ہلایا تھا۔

اس وقت تو وہ ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی البتہ جب تین چار ماہ بعد وہ لوگ عمر کا پرپوزل اس کے لیے لے کر آئے تب ان کی بات کا اصل مفہوم سمجھ میں آیا۔

عمر امریکہ سے آ چکا تھا اسٹڈیز کمپلیٹ کر کے اور اب بزنس میں بھائی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ روبرو تو تانیہ کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ البم میں اس کی تازہ ترین تصاویر بغور ملاحظہ کی تھیں۔ دیکھنے میں وہ خاور مغل ہی کی طرح دلکش نقوش اور بھرپور سراپے کا مالک تھا۔ مگر اصل چیز تو بندے کا مزاج اور عادات ہوا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں خاور مغل نے اس کی تسلی کروا دی۔

"فکر نہیں کرو میں اپنے بھائی کو جانتا ہوں۔ بڑا سادہ مزاج' مخلص اور رشتوں کا احترام کرنے والا شخص ہے۔ اس کے ساتھ تمہارے جیسی نیک طور اطوار کی لڑکی ہی سوٹ کر سکتی ہے۔ ابتدائی بات چیت کے بعد جب تم مجھ پر کھل گئی تھیں اسی لمحے میں نے سوچ لیا تھا کہ میں عمر کو اپنی طرح زندگی کی تنہا کر دینے والی بھیڑ میں گم نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے مجھے اس کے لیے اسٹینڈ ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ مگر اتفاق دیکھو کہ ایسی نوبت نہیں آئی۔ مجھ سے پہلے ہی اماں اور آپا لوگوں نے عمر کے لیے تمہارا نام لے دیا۔ وقت نے حالات نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب انہیں کھوٹے کھرے کی پہچان ہو چکی ہے۔ میرے معاملے میں تو دیر سے ہوئی لیکن صد شکر کہ عمر کے معاملے میں دیر نہیں ہوئی۔ کوئی ایک دریچہ باقی ہے جہاں سے تازہ ہوا اندر آ سکتی ہے' بے بی تمہیں وہاں قدم جمانے کے لیے محنت تو ٹھیک ٹھاک کرنا پڑے گی کہ بدگمانیوں' کدورتوں اور رنجش کا کوڑا سمیٹنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے لیکن میں جانتا ہوں تم نے ایک بار قدم جما لیے تو پھر ایک نہ ایک دن ضرور کامیاب ہو جاؤ گی بشرطیکہ کوشش جاری رکھو راہ کی مشکلات سے نپٹنے کا ارادہ ٹھان لو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

نامیہ نے دھیرے سے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی جانب دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"میں مشکلات سے نہیں گھبراتی خاور بھائی۔ نمو آنٹی کہا کرتی ہیں اگر آپ کے اندر عزم زندہ ہے۔ چلنے کا حوصلہ موجود ہے تو پھر ہم سفری کے لیے کہیں دور ٹمٹماتے ایک مٹی کے دیے کی لو، کسی مہربان یاد کے جگنو بھی بہت کافی ہوا کرتے ہیں۔ کسی کا خیال، کسی کی یاد بھی تو بہترین ہم سفر ہوا کرتی ہے۔ پھر میرے ساتھ تو آپ جیسے شفیق اور مہربان ہستی کی آشیرباد شامل ہے۔"

"بھئی یہ تمہاری نمو آنٹی کیا چیز ہیں جو تمہیں وہاں لاہور میں بھی اتنے فاصلے کے باوجود نہیں بھولیں۔ کبھی ملواؤ نا ہمیں بھی ان سے۔ اب تو سچ مچ بڑا اشتیاق ہوتا جا رہا ہے جنہوں نے اتنی سی بچی کو اتنا شعور بخش دیا ہے۔"

"ہاں ضرور ملواؤں گی۔ بلکہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ابھی چلے چلتے ہیں یہ ساتھ میں دو گھر چھوڑ کر تو ان کا بنگلہ ہے۔"

وہ فورِ شوق میں یونہی ہمراہ ہو لیے۔

"ارے بے بی! یاد آیا تمہاری تو بے تکلفی ہو گی آتی جاتی رہتی ہو گی ان کے ہاں بھلا وہ میرے متعلق کیا خیال کریں گی۔ ان کے گھر والے بھی تو کوئی ہوں گے نا۔" وہ بوکھلائے تھے۔

"ان کے ساتھ ان کے شوہر ہوتے ہیں، آرمی میں میجر ہیں اور دو پیارے پیارے بچے ہیں چار چار سال کے دونوں جڑواں ہیں۔ ان کے شوہر شام کی چائے تک آجاتے ہیں۔ آپ ان سے بات کر کے دیکھیے گا بڑی میٹھی طبیعت کے ہیں سجاد بھائی۔ آپ بہت خوش ہوں گے ان سے مل کر ان کی فیملی بہت اچھی ہے لونگ کیئرنگ اور چارمنگ۔"

ملازم کی ہمراہی میں گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو لان میں میجر سجاد اخبار پڑھتے مل گئے بڑے تپاک سے ملے۔

"بڑے اچھے وقت پر آئے آپ لوگ۔ چائے بس آنے ہی والی ہے۔ بلکہ لیجیے آ ہی گئی۔ بھئی بیگم بشیر کو بھیج کر دو کپ اور پلیٹیں اور منگوا لیجیے۔"

خاور مغل نے بڑے تجسس سے نظریں اٹھائی تھیں اور پھر جیسے وہ پتھر کے ہو کر رہ گئے۔

"بسم اللہ، مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔"

بڑے سبھاؤ سے ٹرے میز پر رکھ کر وہ سیدھی ہوئی تھی۔ ہلکے آسمانی کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں وہی سادہ، شفاف چہرہ اور بشاش اپنائیت آمیز انداز لیے سو فیصدی وہی تھی۔

"آنٹی! یہ ہیں ہمارے گیسٹ خاور بھائی، جن کے متعلق میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان ہی کے ہاں میں ٹھہری تھی لاہور میں اور خاور بھائی یہ ہماری نمو آنٹی ہیں۔"

آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اس نے ہلکے سے مسکرا کر نامیہ کے مہمان کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی چند ثانیے کو دنگ رہ گئی۔

"ارے خاور تم۔۔۔ آپ"

"کیا آپ جانتی ہیں خاور بھائی کو۔" نامیہ خاور مغل کی گم صم کیفیت پر کیا کم حیران پریشان تھی جو نمو کی تحیر آمیز شناخت پر حیرت سے بت نہ بنتی۔

"ارے بھئی یہ وہی خاور تو ہیں سجاد! میں نے بتایا تھا ناں آپ کو ایم اے کرنے کے لیے جب میں ابوظہبی سے پاکستان آئی تھی تو ان ہی کے ہاں تو ٹھہری تھی بڑے عرصے تک ان کا ساتھ رہا ہے۔"

"اچھا اچھا یہ ہیں خاور پھر تو بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر نمو اکثر ذکر کیا کرتی ہیں آپ لوگوں کا کہ آپ کی فیملی نے ان کا بہت خیال رکھا۔" میجر سجاد بیوی کی خوشی پر اس سے زیادہ مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔

"اور کیسے ہیں سب لماں جی، بلقیس، تایا، عمر، اطہر، فریال وغیرہ۔" وہ بڑی بے تابی سے ایک ایک کا حال پوچھ رہی تھی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کیسی ہیں۔ شادی کر لی اور ہمیں بتایا ہی نہیں۔" خاور مغل بڑی مشکل سے اپنے تحیر کے گرداب سے باہر نکل پائے تھے۔

"بس جلدی میں ہی سب کچھ ہو گیا۔ اس لیے آپ لوگوں کو مطلع نہیں کر سکے۔"

نیما کے بجائے میجر سجاد نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔ "نیما کے اور میرے والد صاحب کی جان پہچان ابو ظہبی میں ہو گئی تھی۔ یہاں آئے تو نیما کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان دنوں ان کی جاب کا مسئلہ تھا۔ جن دنوں ان کی ٹرانسفر ادھر جہلم ہوئی اس زمانے میں ابا جان بہت بیمار تھے۔ وہ مرنے سے پہلے میرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے تھے۔ نیما کی جانب سے رضامندی کے اظہار کے بعد سادگی سے نکاح ہو گیا۔ جو سچ پوچھیے تو میں کہوں گا کہ نیما کے روپ میں بابا جان نے مجھے سب سے زیادہ قیمتی اور نایاب تحفہ دے دیا ہے زندگی بھر کے لیے۔"

میجر سجاد کے دھیمے سنجیدہ انداز میں بڑی محبت تھی۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات چیت اور دوبارہ ملاقات کے وعدے کے بعد وہ لوگ بالآخر اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب وہ واپس آ رہے تھے تو مغرب کی اذان ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے خاور مغل کے قدموں میں بڑی شکستگی تھی۔ چاروں طرف کی فضا ٹھنڈی چاندنی میں بھیگ رہی تھی۔ خنک ہوا تانیہ کے ریشمی ملائم بالوں سے چھیڑ خانیاں کر رہی تھی۔

"خاور بھائی۔" بالآخر ایک جگہ رک کر تانیہ نے گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لے کر پکارا۔

تو کہ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے یہ

تو کہ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے یہ

وہ اپنی ہی دھن میں دھیرے دھیرے گنگنا رہے تھے اردگرد سے بے خبر حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی بے گانہ سے ہو کر۔

"ہوں۔" اس کی پکار پر ان کے قدم ٹھٹکے تھے۔

انہیں پکار تو لیا تھا مگر اب تانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے۔ لفظ کہیں کھو سے گئے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ یا پھر دنیا بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی نمو آنٹی خاور مغل کی نیما نکلیں۔ لے شروع سے ہی نمو آنٹی بہت اچھی لگا کرتی تھیں جب وہ میجر سجاد کی دلہن بن کر نئی نئی جہلم آئی تھیں۔ ان سے پکی دوستی کرنے کے بعد وہ اکثر دل میں سوچا کرتی تھی بھلا نمو آنٹی سے زیادہ کوئی مہربان، ہمدرد اور پیاری فطرت کا اور کوئی ہو سکتا ہے؟

خاور مغل کی زبانی ساری کہانی سن کر نیما صدیقی کا روشن کردار اس کے سوچوں کے سمندر میں ایک عرصہ تک ہلچل مچاتا رہا تھا۔ وہ سوچتی بھلا نمو آنٹی زیادہ اچھی ہیں یا نیما صدیقی اور جب وہ فیصلہ نہ کر پاتی تو جھنجھلا کر ذہن کو کسی اور سمت لگا لیتی۔ خاور مغل کو نمو آنٹی سے ملانے کے لیے لیے جاتے ہوئے بھی اس کے دل میں یہی کشمکش تازہ تھی۔

"کہیں ایسا نہ ہو خاور بھائی ان سے مل کر کہیں۔ نیما تمہاری نمو آنٹی سے کہیں زیادہ اچھی تھی کیونکہ اس کی ایثار پسند فطرت کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

اس کے دل میں کہیں آرزو ...... تھی کہ نمو آنٹی نیما صدیقی کے مقابلے میں اگر جیتیں نا تو کم از کم ان کے برابر ضرور رہیں۔ اور یہ تو اسے خاور مغل کا چہرہ پڑھ کر اور اک ہوا تھا کہ وہ لڑکی سراپا جیت ہی جیت تھی۔ نیما صدیقی کے روپ میں بھی نمو آنٹی کے روپ میں بھی مسز سجاد کے روپ میں بھی۔

کہ قربانیاں اور ایثار پسندی دل و روح کے ساتھ ساتھ روپ کو بھی نکھار دیتی ہیں۔ اک نور کا کشش آمیز ہالہ سا بنا دیتی ہیں۔

"بے بی۔" وہ جانتے تھے کہ اس نے کیا کہنے کے لیے پکارا ہے اس لیے اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگے۔

"تمہاری نمو آنٹی سے مل کر میری ایک عرصے کی ذہن میں الجھی ہوئی تھی سلجھ گئی ہے میں تمہارے لاہور سے جانے کے بعد اکثر اوقات سوچا کرتا تھا کہ آخر وہ کون سی کشش تھی کون سی بات تھی جو میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز ایک چھوٹی سی معصوم سی

لڑکی کے سامنے کھول بیٹھا۔ آخر اس چھوٹی سی لڑکی نے میرے اندر کا بھید کیسے پا لیا کیسے میرے ماضی کے کواڑوں پر لگے زنگ آلود قفل کھول کر اسرار پا لیا! اب خبر ہوئی تمہارے باتوں میں تمہاری گفتگو میں اس کی محبت کی خوشبو جو شامل ہوتی تھی۔ اس کے خیالوں کی اس کی ذات کی مہک مجھے تمہارے طرز کلام میں محسوس ہوتی تھی۔ اس کشش نے مجھے تم سے قریب کر دیا۔ یاد کرو ذرا تم بات بات پر نمو آنٹی کا حوالہ دیا کرتی تھیں۔ تم سے باتیں کرنے میں اسے خود سے بہت قریب محسوس کرتا تھا شاید اسی لیے تم سے اتنی جلدی بے تکلفی ہو گئی۔ تمہارے مزاج اور تمہارے انداز رہ رہ کر مجھے مانوسیت کا احساس دلاتے تھے۔"

"خاور بھائی!" ان کے خاموش ہونے پر تانیہ نے دھیرے سے انہیں دوبارہ مخاطب کیا۔

"کیا آپ انہیں بتائیں گے کہ آج بھی آپ کے دل میں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکا۔"

"نہیں۔" خاور مغل نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں اسے خلش میں مبتلا کیوں کروں۔ اس نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ بہت کچھ برداشت کیا ہے بہت عذابوں سے گزرنے کے بعد سکھ اور سکون کی دولت نصیب ہوئی ہے اسے میں دبی ہوئی راکھ کرید کر اس کی پرسکون زندگی میں زہر کیوں گھولوں۔"

"کیا آپ یہ بھی نہیں جاننا چاہیں گے کہ ان کے دل میں آپ کے لیے کیا جذبات رہے ہیں۔" تانیہ ان کے رنگ بدلتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"نہیں۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز میں سانس کھینچا۔ "بے بی کچھ سوال ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی خوب صورتی نوک زباں کے بجائے دل میں رہنے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان پر آ جائیں تو اپنا حسن اور معانی کھو بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات اسرار بھی فرار کا ذریعہ بن جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ مطمئن ہے اسے اپنے شوہر اور بچوں کی محبت حاصل ہے۔ میرا دل اس کی بابت پر بہت مطمئن ہے۔ میں کسی بھی طرح ماضی کے کسی تذکرے سے اس کو اس کا تلخ اور کربناک ماضی یاد نہیں دلانا چاہتا۔ اس کو خوش اور ہنستا بستا دیکھ کر میرے دل پر پڑی احساس جرم کی سل کچھ کھسک گئی ہے۔ بے بی وہ اتنی اچھی ہے کہ جس کے ساتھ بھی جہاں بھی رہے گی پھول کھلا دے گی۔ شرط یہ کہ کوئی ان پھولوں کا قدر دان بھی ہو ہماری طرح بے قدرا نہ ہو۔ اور صد شکر کہ اسے ایسا قدر دان مل گیا ہے وہ خوش ہے۔ میں اس میں خوش ہوں۔ سچی محبت کرنے والے سود و زیاں نہیں دیکھتے وہ محبوب کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ آؤ چلیں۔" وہ آگے چل پڑے تھے۔

تو کہ محبوب مجھے تھا مجھے معلوم ہے یہ

اپنا پسندیدہ مصرعہ گنگناتے ہوئے۔

اور سست قدموں سے ان کے پیچھے چلتی ہوئی تانیہ کے ذہن میں ان کی سنائی ہوئی نظم کے فقرے مچل رہے تھے۔

نمائش کی تحریر سے زندگی کی روایت نبھاتے بہت عمر گزری۔

بہت حوصلوں کی شکستوں کو پندار نے

خامشی کے کفن میں لپیٹا۔

بس اب راستوں میں۔ درختوں کی پرچھائیوں کا

سندیسہ سمجھ لو۔

وہ دیوار گرتی نظر آ رہی ہے۔

قربانی لازم ہے زندگی کی نمو کے لیے۔

ہمدردی اور ایثار پسندی لازم ہے انسانیت کا علم بلند رکھنے کے لیے۔ ہمارا چلے سے کیا جاتا ہے جو دو گھڑی رک کر کسی کے دکھ سکھ سن لیں۔ زندگی کو اس قدر خود غرض بھی نہیں بنا دینا چاہیے کہ زندگی کا پتا دیتی دھڑکنوں کے راگ بھی کانوں تک نہ پہنچ پائیں۔

ہوس زر اور طلب حسن کے ماسوا بھی ایک شے ہوا کرتی ہے۔ انسان دوستی۔

انہی سوچوں میں گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ بیرونی لائٹس کی روشنی نے ان کے قدموں کو جگمگا دیا تھا۔ وہ دونوں روشنی سے لحہ بہ لحہ قریب ہوتے جا رہے تھے۔



نظر پڑی تو اک

شازیہ چوہدری

میری عید تم ہو

رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ عید کی آمد آمد تھی۔ اور محمود صاحب کے ہاں گاؤں جانے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

پچھلے ایک ہفتے سے سائرہ بچوں کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔

"یہ فادی تو بالکل ہی نکما لڑکا ہے۔ میٹرک میں ہے۔ مگر سلیقہ نام کو نہیں ہے۔ کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں اپنا بیگ تیار کرلو۔"

وہ اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے فہد عرف فادی کی خبر لے رہی تھیں۔

ناولٹ



Pakistanipoint

"گل نور! تم نے تو مجھے حد سے زیادہ مایوس کیا ہے۔ بڑی بیٹی ہونے کا ایک سکھ بھی نہیں دیا۔ میرا تو خیر کیا ہاتھ بٹاؤ گی۔ اپنی کتابیں کپڑے نہیں سنبھال پا رہیں۔" بی۔ اے فائنل کی طالبہ، ان کی سب سے بڑی بیٹی گل نور مسلسل ان کی تنقید کا نشانہ بن رہی تھی۔

"اور ماہ نور! چندا! اگر ہاتھ نہیں بٹا سکتیں تو بکھیڑا بھی مت ڈالو۔ کتنی مشکلوں سے تمہارا اسکول بیگ سیٹ کر کے رکھا تھا پھر پھیلا دیا سب کچھ۔"

سب سے چھوٹی، بابا کی لاڈلی پانچویں کلاس کی طالبہ ماہ نور بھی ان کی ناراضگی سے محفوظ نہیں رہی تھی۔

"سائرہ بیگم... بھئی، آپ کی تیاریاں کب اختتام کو پہنچیں گی۔ آفس سے بمشکل تمام چند چھٹیاں ملی ہیں۔ آپ کے انداز سے تو لگتا ہے آدھی یہیں خرچ ہو جائیں گی سامان باندھنے میں۔"

محمود صاحب ویسے بھی گاؤں جانے سے ہمیشہ الرجک رہتے تھے۔ محض بیوی بچوں کے شدید اصرار پہ دل پر پتھر رکھ کر ہامی بھرتے تھے۔ سائرہ کی تیاریاں دیکھ کر بیزاری سے دریافت کر رہے تھے۔

"خفا کیوں ہوتے ہیں۔ بس کل دوپہر کی ٹرین سے انشا اللہ روانہ ہو جائیں گے۔ بھلا بتائیے، میں بھی کیا کروں۔ دو تقاریب اوپر نیچے ہیں۔ عید اور پھر عید کے فوراً بعد شادی۔ اور پھر شادی بھی بہت لگے سگوں کی ہے۔ آپ کی بہن اور میری بھابی کی بیٹی کی۔ دوہرا رشتہ ہے۔ تیسرے یہ کہ جس سے ہو رہی ہے وہ لڑکا بھی



رشتہ داروں میں سے ہے۔ سو ہر طرف دیکھ ریکھ رکھنی پڑتی ہے۔ آپ کی صاحبزادی نے بھی تو کچھ نہیں کیا۔ اکیلے سارا جھنجھٹ نپٹانا پڑا۔ ان کو تو سوائے کتابوں اور سہیلیوں کے کسی کا ہوش ہی نہیں ہے۔ خیر فکر نہ کیجئے۔ کل ہم انشاء اللہ گاؤں میں ہوں گے۔"

اپنے متعلق امی کا کورا' بےلاگ تبصرہ سنتے ہوئے گل نور برے برے منہ بنا رہی تھی۔

"امی جتنے کپڑے آپ نے نکال کر پیک کرنے کو کہا سب کر دیے' اپنی کتابیں بھی رکھ لی ہیں۔ شام کو افطاری پہ بھی مدد کرتی ہوں۔ مگر آپ کو ساری دنیا کی ماؤں کی طرح اپنی بیٹی کی تعریف کرنا کب اچھا لگے گا۔"

"چلو' زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ فادی اور ماہ نور کو بلاؤ۔ روزہ کھلنے والا ہے۔" گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے سائرہ چپلیں پاؤں میں پھنساتی بہ عجلت اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بجو! دیکھ لیجئے گا۔ کتنا مزہ آئے گا گاؤں میں۔۔۔"

رات کو عشاء کی نماز اور تراویح پڑھنے کے بعد سب اہل خانہ لاؤنج میں آتش دان کے پاس بیٹھے سبز قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب فادی نے چہکتے ہوئے انداز میں گل نور کو مخاطب کیا۔

"یہ تو جا کے ہی پتا چلے گا۔" گل نور نے اکتائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"فادی بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں بجو۔ ویسے بھی ہر بار آپ گاؤں جاتے ہوئے بہت بور موڈ میں ہوتی ہیں۔ مگر وہاں جا کر ایک دم فٹ ہو جاتی ہیں۔"

ماہ نور نے بھائی کی تائید کے ساتھ ساتھ گل نور کی افتادِ طبع کے بارے میں بیان دیا تھا۔

اگلے روز گھر میں افراتفری کا سا عالم تھا۔ امی کو ڈر تھا کہ کچھ رہ نہ جائے۔ دوپہر ایک بجے وہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے پھر دو بجے تک راولپنڈی اسٹیشن چھوڑ چکے تھے۔ سفر طویل تھا۔ پھر روزہ بھی رکھا ہوا تھا۔ گل نور وقت گزاری کے لیے بیگ سے رسالہ نکال کر پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اونگھ آ گئی۔ کسی کے جھنجھوڑنے پر آنکھ کھلی تو ٹرین وزیر آباد اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ اور روزہ کھلنے کا وقت ہونے والا تھا۔

"تم تو خوب سو گئیں۔ اچھا روزہ کھلایا تم نے۔" امی اس کے لیے افطاری کا سامان ٹفن سے نکالتی ہوئی گویا ہوئیں۔

"مجھے ہمیشہ ٹرین کے سفر میں نیند آ جاتی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"امی! ہم کب نارووال پہنچیں گے؟" ماہ نور بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ رات کے دس بجے تک نارووال اسٹیشن آ جائے گا۔ وہاں سے تانگہ لے کر بیس پچیس منٹ میں اپنے گاؤں **سنگھوال** پہنچ جائیں گے۔"

رات کو چھوٹے بڑے اسٹیشن کی لائٹیں چلتی گاڑی سے دیکھنے میں کتنی پراسرار اور سحر انگیز لگتی ہیں۔ فادی نے دوپہر سے کھڑکی والی سیٹ پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ اسے فطری نظاروں سے بے حد لگاؤ تھا۔

جیسے ہی قریبی ٹرین اسٹیشن پر گاڑی رکی سارے الرٹ ہو گئیں۔ اب اس سے اگلا اسٹیشن ان کا تھا۔

"آپ بھی تو سارا گھر اٹھا لائی ہیں امی۔" رنگ برنگے بیگ اور سوٹ کیس گھسیٹتے فادی میاں کی جھلاہٹ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ گل نور نے در پردہ لطف لیا۔ وہ اور فادی ایک دوسرے کے ازلی حریف تھے۔

"بجو سے بھی تو کہیں۔ دونوں ہاتھ خالی لٹکا کے کھڑی ہیں۔"

اسے صرف ایک ہینڈ بیگ تھامے دیکھ کر فادی کو خود پر کی جانے والی زیادتی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ سارا سامان امی نے تانگے میں رکھوایا تھا۔ بابا جان مہمانی روایت کے مطابق میزبان فیم کے لئے پھل، مٹھائی وغیرہ خریدنے کے لئے نزدیکی مارکیٹ گئے تھے۔ واپس آئے تو فادی تانگا کروا کے سامان رکھوا چکا تھا۔ صرف ان کے بیٹھنے کا انتظار تھا۔

"کتنا سرپرائز ہو گا ممانی لوگوں کے لئے۔ کسی کو اطلاع ہی نہیں دی ہے۔" تانگہ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا تو فادی پرجوش ہونے لگا تھا۔ اب

گاؤں سنگھوال کے مخصوص وہ مانوس نقوش نگاہوں کے سامنے نمودار ہونا شروع ہوئے تو خود بخود ایک اپنائیت اور خوشی سی دل میں اترنے لگی۔

گل نور کا بچپن یہیں گاؤں میں گزرا تھا۔ محمود صاحب آرمی میں تھے۔ روز روز کے ٹرانسفر کے جھمیلوں سے بچنے کے لیے سائرہ نے شروع شروع میں سسرال میں رہنے کو ہی ترجیح دی تھی مگر پھر بچوں کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر فیصلہ بدلنا پڑا۔ گاؤں میں لڑکیوں کے لیے صرف پرائمری اسکول تھا۔ چنانچہ گل نور کے پانچویں پاس کرلینے کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے محمود صاحب فیملی کو ہمراہ لے گئے تھے۔ گاؤں میں دادو کے ساتھ ان کے دوسرے بیٹے اجمل اور ان کی بیوی موجود تھیں۔ اس کے علاوہ خوش قسمتی سے اپنی بیٹی زہراں کا رشتہ بھی اتفاق سے اپنے ہی گاؤں میں سائرہ کے بھائی قدیر کے روپ میں مل گیا کچھ عرصہ بعد دادو سائرہ کو محمود کے لیے بیاہ لائیں۔ یوں بیٹی کا سسرال اور بہو کا میکہ دونوں ہی پڑوس میں آباد تھے۔

قبرستان کی حدود ختم ہونے کے بعد سڑک کے دونوں اطراف لہلہاتی شاداب فصلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

"اوہ۔! یہ دیکھو اجمل چاچا کا ٹیوب ویل۔" فادی نے ماہ نور کا کندھا ہلا کر متوجہ کیا۔ "اس وقت بھی چل رہا ہے۔ شاید فصلوں کو پانی لگ رہا ہے۔"

اردگرد کے دیگر دیہاتوں سے لاؤڈ اسپیکر پر نعتیں اور درود شریف پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آخری عشرے میں دیہاتوں میں عبادات کی ادائیگی جوش و خروش کی انتہا پر پہنچ جاتی تھی۔

"تین چار دن بعد عید ہوگی۔ ہے ناں بجو۔" ماہ نور نے دلچسپی سے گل نور سے دریافت کیا۔

"شاید۔" گل نور اپنے دھیان میں گم غائب دماغی سے بولی تھی۔

تانگہ بڑ کے گھنے عمر رسیدہ درخت کے نیچے آکے کھڑا ہوگیا۔ یہاں سے سڑک ختم ہو جاتی تھی اور مکانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ گاؤں کے گھروں کی زیادہ تر چھتیں آپس میں متصل تھیں۔ درمیان میں صرف چھوٹی چھوٹی گلیاں تھیں۔ جہاں سے لوگوں کے علاوہ بوقت ضرورت صرف دو پہیوں کی سواری ہی گزر سکتی ہے۔

"چلو بھئی بچو۔ نیچے اترو۔ منزل آگئی ہے۔" محمود صاحب تانگے والے کو رقم ادا کرکے سوٹ کیس اتارنے لگے۔

"باؤ جی! میں چھوڑ دیتا ہوں گھر تک۔" تانگے والے نے خیر سگالی کے جذبے کے طور پر کچھ بیگ کندھے پر ڈال لیے۔ یوں گل نور، سائرہ اور ماہ نور کو بوجھ نہیں اٹھانا پڑا۔

"پہلے دادو کے گھر چلنا ہے کہ ماموں کے ہاں۔" محمود نے سب سے مشترکہ دریافت کیا۔ سائرہ دانستہ چپ رہیں کہ اگر انہوں نے میکے والوں کو ترجیح دی تو خوامخواہ محمود صاحب کو طعنہ زنی کا بہانا ہاتھ آجائے گا کہ سسرالی رشتہ داروں کو عزیز نہیں رکھتی۔ یوں بھی ان کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ میکہ اور سسرال کے درمیان محض ایک چھوٹی سی گلی کا فاصلہ ہی تو حائل تھا۔ بلکہ جس طرح مکان بنے ہوئے تھے اس لحاظ سے سسرالی گھر کی پچھلی دیوار میکے کے چھت سے ملی ہوئی تھی۔ کون سا کوسوں کا سفر تھا بیچ میں۔

"پہلے دادو سے ملیں گے پھر مامی کے ہاں۔" گل نور نے فیصلہ کردیا تھا۔

زہراں مامی کے ہاں بچوں کا زیادہ دل اس لیے لگتا تھا کہ ان کی ڈھیر ساری اولادیں تھیں۔ جن میں سے کچھ ان تینوں کے ہم عمر بھی تھے۔ رونق بھی خوب لگتی تھی۔ دادو کے ہاں اجمل چاچا اور ثروت چاچی ہی تھیں اور ان کے دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی تو شادی ہوئی تھی۔ زہراں سب سے بڑی تھیں۔ ان کے بعد محمود صاحب اور پھر اجمل چاچا تھے۔

"کون ہے بھئی۔ اے کنیز ذرا دیکھ تو۔" کنڈی ہلانے کی زوردار آواز پر گھر کے وسیع و عریض صحن میں ایک کونے پر جائے نماز بچھائے بیٹھی دادو نے غالباً کام کرنے والی چھوکری کو آواز دے کر کہا تھا۔

"ہائے بی بی جی۔ پروہنے آئے ہیں شہر سے۔"

جونہی کنیز نے پھاٹک کھولا دل پر ہاتھ رکھ کے خوشی سے چیخی تھی۔

"بسم اللہ۔ میرے بچے آئے ہیں۔" دادو تسبیح جائے نماز پر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"دادو۔ پیاری دادو۔" گل نور فادی اور ماہ نور سفر کی تھکن بھلا کر ان کی گداز آغوش میں سمائے تھے انہیں اپنی دادو سے بہت پیار تھا۔

"کتنے دنوں سے اڈیک رکھی ہوئی تھی میں نے۔ روز راہ تکتی تھی کہ عید سر پہ آرہی ہے اور میرے چاند میرے جگر گوشے ابھی تک نہیں آئے۔"

دادی جان انہیں لپٹا کر نہال ہو رہی تھیں۔

"چاچی اور چاچا کدھر ہیں دادو۔" گل نور بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"تیرا چاچا تو اعتکاف میں بیٹھا ہوا ہے۔ مسجد میں ہے۔ اور ثروت تیری پھپھو زہراں کے ہاں گئی ہے تھوڑی دیر پہلے۔ آج رات مل کے قرآن شریف پڑھنے کا پروگرام تھا ان کا۔ اے کنیز پچھلے کمرے کی کھڑکی سے اسے آواز دے کر بتا دو۔"

سب سے پچھلے کمرے کی مشترکہ دیوار کے درمیان ایک سلاخ دار کھڑکی بنائی ہوئی تھی رابطے کے لیے۔

"رہنے دیں دادو ہم ویسے بھی مامی کے ہاں جا رہے ہیں ان سے ملنے کے لیے اچھا ہے سرپرائز رہے گا۔" فادی کو ہمیشہ سے سرپرائز دینا پسند رہا تھا۔

"رات کا وقت ہے بچے۔ کچھ آرام کر لیتے۔ تھکے ہوئے ہو۔ صبح مل لینا۔"

"کہاں چین پڑے گا۔ بہن بھائیوں سے ملے بغیر۔" بیانڈہ نے محبت نے اپنی اولاد کی بے تاب فطرت پر تبصرہ کیا۔

"اے کنیز! جا بچوں کے ساتھ۔ زہراں کے گھر چھوڑ آ۔ اور ثروت کو بولنا جلدی سے گھر آجائے۔ روٹی پانی کا انتظام بھی کرنا ہے۔"

پتلی سی تنگ گلی سے گزر کر وہ ماموں کے گھر پہنچ گئے۔

"کون ہے بھئی۔۔؟" کنیز کے دروازہ کھٹکھٹانے پر اندر سے امتیاز نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"دروازہ تو کھولیں۔ امتیاز بھاؤ۔" کنیز کو شوخی سوجھنے لگی۔

"کیا بات ہے۔" امتیاز نے دروازہ کھول کر متحیر لہجے میں دریافت کیا پھر ان پر نگاہ پڑتے ہی تحیر خوشی میں بدل گیا۔

"ارے۔۔۔"

"السلام علیکم امتیاز بھائی۔۔!" تینوں نے کورس کے انداز میں کہا تھا۔ فادی ان سے گرمجوشی سے گلے ملا انہوں نے ماہ نور کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا البتہ گل نور کے سلام کے جواب میں خوشدلی سے مسکرا کر سر ہلایا۔

امتیاز بھائی سے مل کر تینوں ہمیشہ سے زیادہ خوش ہوتے تھے۔ پورے خاندان میں واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد تھے جو انجینئرنگ کے آخری سال میں تھے۔ لاہور میں زیر تعلیم تھے اور آج کل چھٹیوں کے سلسلے میں گاؤں آئے ہوئے تھے۔ وہ نام کے امتیاز ہی نہیں تھے بلکہ انہیں سچ مچ خاندان کے لڑکوں میں ایک امتیاز حاصل تھا۔ بچوں بڑوں سب میں پسندیدہ شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ اس میں ان کی نفیس اور شاہانہ عادات و اطوار کا بھی عمل دخل تھا۔ اور شاید یہ بات بھی تھی کہ پڑھائی کی وجہ سے انہوں نے عمر کا زیادہ حصہ لاہور ہاسٹلوں میں گزارا تھا۔ اس لیے گھر والوں کے لیے مہمان کی سی حیثیت رکھتے تھے۔ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ ان سے بڑے ریاض بھائی تھے۔ جو شادی شدہ تھے۔

اندر کمرے میں بھابی نسرین یاسرہ شاکو ثروت چاچی سفید چادریں بچھا کر عبادت میں مصروف تھیں۔ اطلاع ملتے ہی سب میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک میلے کا سا سماں تھا۔

"مامی کہاں ہیں۔۔؟" ماموں کے بارے میں تو اندازہ تھا کہ مسجد میں ہوں گے مگر زہراں ممانی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

"وہ ماسی باجراں کے گھر درود شریف کی محفل میں بیٹھی ہیں۔ امتیاز! جاؤ تم انہیں بلا لو میرے۔۔"

(بھائی)۔" ہنستی مسکراتی طبیعت والی بھابی نے بتا کر دیور کو مخاطب کیا تھا۔

"اور طیب اور عاطف؟"۔ فادی کو اپنے ہم عمر ماموں زادوں سے ملاقات کی بے چینی تھی۔

"وہ دونوں "حویلی" میں سوتے ہیں۔ جا کاشی جا کے چاچوؤں کو اٹھالا۔"

"حویلی" سے مراد گائے بھینسیں باندھنے والا باڑہ تھا جو گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ کاشی مٹی کی بنی سیڑھیاں چڑھتا چھت پر سے ہو کر بلانے دوڑ گیا۔ اطلاع ملنے پر ایاز بھائی بھی چلے آئے۔ وہ فوج میں ملازم تھے۔ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔

پل بھر میں رونقیں جاگ اٹھی تھیں۔

سب ہی ان کی آمد پر کھلے پڑ رہے تھے اور اتنی پذیرائی پر ان کی پچھلی ساری کوفت اور جھنجھلاہٹ جاتی رہی تھی۔ باتوں اور خاطر مدارات میں پتا ہی نہیں چلا کب سحری کا ٹائم ہو گیا۔

روزہ رکھنے کے بعد سب جو پڑ کر سوئے تو دن چڑھے آنکھ کھلی۔

--*

"آج تو لگتا ہے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے بارش کے۔ شانو تم نے بچپن میں ہانڈی تو نہیں چاٹی تھی۔؟"

صبح سے مسلسل جھڑی لگی ہوئی تھی۔ گل نور اپنے سے دو سال بڑی شانو سے دوستوں کی طرح بے تکلف تھی۔ شانو سے ایک سال چھوٹی یاسرہ سے تو اس کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔

"چلو بد تمیز۔" شانو اس کی شوخ چھیڑ خانی پر لجا گئی۔

آج انتیسواں روزہ تھا۔ اور عید کے اگلے دن ڈھولک رکھ لی جانی تھی۔ شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ پچھلے دنوں سے سارا گھر مصروف تھا۔ گاؤں کی دیگر لڑکیاں اور شانو کی سکھیاں روز آ کر کپڑے لتے کی تیاری میں ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔

ماموں اور اجمل چاچا فرنیچر کی خریداری کے سلسلے میں شہر کے چکر لگا رہے تھے امتیاز بھائی شادی کے انتظامات کرتے پھر رہے تھے جبکہ ایاز بھائی ادھر

جہاں ڈاکٹر نہ ہو

صحت کی دیکھ بھال، اور بیماریوں کا علاج

یہ امریکہ میں چھپی ایک بہت مقبول عام فہم طبی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس انتہائی اہم کتاب کا 50 سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور 100 سے زائد ملکوں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اردو ترجمہ کتاب کے نئے نظر ثانی شدہ انگریزی ایڈیشن کا ہے جو 1992ء میں چھپا ہے۔

یہ کتاب تقریباً ان سب بیماریوں کا احاطہ کرتی ہے جو عام لوگوں کو اور خاص طور پر دیہات میں رہنے والوں کو متاثر کر سکتی ہیں۔ کتاب بتاتی ہے وہ کون سے صحت کے مسائل ہیں جو پڑھنے والا خود حل کر سکتا ہے اور کون سے ایسے ہیں جن کے لیے ڈاکٹر اور تجربہ کار صحت ورکر کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آسان اور عام فہم انداز میں تصویروں کی مدد سے سمجھایا گیا ہے کہ کس طرح بہت سی عام بیماریوں سے بچا جا سکتا ہے اور علاج کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان کے لیے انتہائی مفید ہے جو طبی سہولتوں سے محروم اور طبی مراکز سے دور ہیں، ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے آپ کو اپنی، اپنے گھر والوں کی اور بستی والوں کی صحت کا خیال ہے تو یہ کتاب آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔

بڑا سائز 508 صفحات | قیمت/200 روپے

ملنے کا پتا

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

فون — 216361

اُدھر نزدیکی گاؤں میں اور دیگر دور دراز کے رشتہ داروں کے ہاں کارڈ ز پہنچانے کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔

"گل! تم نے شادی کے کپڑے کیسے بنوائے ہیں؟ ویسے پتا ہے امی نے تمہارے لیے اپنی پسند سے دو سوٹ بنوائے ہیں مگر اب یہ نہیں پتا کہ تم پہن بھی لو گی کہ نہیں۔ شہر والوں کی پسند وکھری ہوتی ہے۔"

بھابی بڑے شوق سے اسے جھلملاتے شوخ کپڑے دکھا رہی تھیں۔

"ارے بھابی۔ یہ کیا اسقدر بھاری۔ یہ تو خوامخواہ زحمت کی امی نے میں بڑے ہلکے پھلکے کپڑوں کی عادی ہوں۔ پلیز۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔" وہ بڑے تکلف اور ندامت سے کپڑوں کو تہہ کرتی کہہ رہی تھی۔

"تم یہ بتاؤ پسند آئے کہ نہیں۔ بھلے سے نہ پہنو۔ بعد کے لیے رکھ لیتے ہیں۔"

یاسرہ نے بڑی شوخ معنی خیز مسکراہٹ کے ہمراہ اس کی سمت دیکھا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"بھئی، آج افطاری کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" اسی لمحے امتیاز چلے آئے تھے۔

"کیا آج بہت روزہ لگ رہا ہے امتیاز بھائی۔"

ان کے عاجلانہ انداز پر گل نور خوبصورتی سے چوٹ کرتی ہوئی مسکرائی۔

انہوں نے پہلے حیرانی سے اور پھر ہنس کر اسے دیکھا۔

"میں اپنی بھوک کی وجہ سے نہیں کہہ رہا بلکہ آپ لوگوں کو وقت کا احساس دلا رہا ہوں۔ پانچ بج رہے ہیں اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد روزہ کھل جائے گا۔"

"مارے گئے۔" بھابی شانو کے جہیز کا جوڑا پیک کرتے ہوئے گھبراہٹ کے مارے اٹھ بیٹھیں۔

"اتنا وقت ہو گیا اور پتا ہی نہیں چلا۔" یاسرہ بھی بوکھلائے ہوئے انداز میں چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ شانو تو خیر دس دن کی مہمان تھی سو اس کو "چھٹی" ملی ہوئی تھی۔ نسرین بھابی کے بچوں کو سنبھال رہی تھی۔

"سارا دن جھڑی لگی رہی۔ اسی لیے اندازہ نہیں ہوا۔"

گل نور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی تھی۔ برآمدے کی داہنی سائیڈ پر کچن کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔

"بھابی! میں کچھ مدد کروں۔؟"

وہ بھی کچن میں چلی آئی تھی جسے یہاں کی زبان میں "رسوئی" بولتے تھے۔

ایک سائیڈ میں چولہے میں لکڑیاں دہک رہی تھیں۔ دوسرے چولہے پر یاسرہ ہانڈی بھوننے کی تیاریوں میں تھی۔

"ارے نہیں چندا۔!" بھابی نے مخصوص شفیق انداز میں کہا۔

"تم بیٹھو ادھر۔" انہوں نے ایک چوکی اس کی جانب کھسکا کر پھرتی سے آٹے کی "بھڑولی" کھول کر پرات میں آٹا نکالا اور نلکے سے پانی کا ڈونگا بھر کر گوندھنے لگیں۔

گل نور سے زیادہ دیر تک بیکار نہیں بیٹھا گیا۔ نال نال کرنے کے باوجود اس نے بیسن گھول کر پکوڑے تلنے شروع کر دیے۔

"خبر نہیں آج عید کا چاند نظر آتا ہے یا نہیں۔"

افطار کے بعد سب یہی چہ میگوئیاں کر رہے تھے بارش گو ہلکی ہو چکی تھی مگر شدید دھند میں چاند نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ٹی وی، ریڈیو ہی اطلاع کے ذریعے تھے۔ مگر دس بجے تک چاند نظر نہیں آیا تو سب مایوس ہو گئے۔

طیب اور عاطف بارش تھمنے پر حویلی میں سونے کے لیے چلے گئے۔ امتیاز بھائی کے کمرے میں بلال کا بستر سیٹ کر دیا گیا تھا۔ بیٹھک میں محمود صاحب اور قدیر صاحب بستر میں گھسے گپیں ہانک رہے تھے اور زنانہ ہال کمرے میں یاسرہ، شانو، نسرین، گل نور اور گل نور وغیرہ براجمان تھے۔ بارش کے بعد لائٹ گئی ہوئی تھی سو کپڑوں کا کام کل پہ ڈال دیا گیا تھا۔ برابر کے کمرے میں بھابی، بچے اور امتیاز بھائی محو خواب تھے۔

"لوگو۔ اٹھ جاؤ۔ اعلان سن لو۔ چاند نظر آ گیا

کل عید ہوگی۔"

کوئی گیارہ بجے کا ٹائم تھا۔ سب سو چکے تھے۔ صرف یاسرہ اور گل نور جاگ رہی تھیں جب امتیاز بھائی فادمی کے ساتھ اونچے اونچے سروں میں اعلان کرتے ہوئے ہال کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

"ہیں۔ واقعی۔؟" وہ لوگ اچھل کر بستروں سے نکل آئے۔ چاروں طرف سے چاند مبارک کی صدائیں آرہی تھیں۔

"ہائے۔ ہم نے تو کپڑے بھی استری نہیں کیے۔" لڑکیوں کو بجلی جانے کا اتنا افسوس شاید تب نہیں ہوا ہوگا۔

"اور مہندی بھی تو لگانی ہے۔" ماہ نور نے منہ بسورا۔

"فکر نہیں کرو۔ ابھی انتظام کرتے ہیں۔" امتیاز کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے لالٹین لے آئے تھے۔

ادھر چھت پر سے کنیز بھی اطلاع دینے آن پہنچی تھی۔ زہراں ممانی تو شام سے "میکے" میں تھیں۔

غرضیکہ رات میں دن کا سماں پیدا ہوگیا۔ گل نور نے سب کے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور آخر میں خود صرف ایک ہاتھ پر لگا سکی۔

"لو بھئی۔ مجھے تو اچھا خاصا نقصان ہوگیا۔" وہ افسوس کر رہی تھی۔ بچوں نے خوب میلہ لگا رکھا تھا۔ شور شرابے سے۔

"امتیاز بھائی سے لگوا لو۔ انہیں بڑی اچھی ڈیزائننگ آتی ہے۔"

یاسرہ نے شرارت سے بھائی کی طرف دیکھا جو ماہ نور کی مہندی کا ڈیزائن نوٹ کر رہے تھے۔

"ہاں۔ یاد ہے پچھلی عید پر اس نے میری کتنی اچھی لگائی تھی مہندی۔ ویرے امتیاز! گل کے ہاتھ پہ لگا دو۔"

بھابھی نے بھی جھٹ فرمائش داغی تھی۔

"رہنے دیں۔ صاف اناڑی لگ رہے ہیں۔ کہیں میرے ہاتھ پر آرکیٹیکچر نگ کا نمونہ نہ بنا دیں۔" گل نور نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔

"لاؤ دو۔ لگا دیتے ہیں یہ کیا مشکل ہے۔"

بہنوں اور بھابی کے مسلسل اصرار پر انہوں نے سادہ سے انداز میں کہتے ہوئے تنکا ایک ہاتھ میں لے کر مہندی کے پیالے میں ڈبونے کے بعد اس کا دایاں ہاتھ انگلیوں کے پاس سے تھام کر نقش و نگار بنانا شروع کر دیے۔

"رہنے دیتے امتیاز بھائی۔" وہ خفت سے کہہ رہی تھی۔

"دکھاؤ تو۔ اپنا نام تو نہیں لکھ گئے۔" وہ کام ختم کر کے ہاتھ دھونے کے لیے باہر نکلے تو یاسرہ مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے گل نور کے پاس کھسک آئی۔

"پاگل ہوگیا۔ وہ کیوں ایسا کرتے۔" گل نور نے سخت حیرانی کے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ یاسرہ کی مسکراہٹ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ پھر اسے اچانک کچھ یاد آگیا۔

"بھئی مجھے دادو کے ہاں جانا ہے۔ اجمل چاچا اعتکاف سے اٹھ چکے ہیں ان سے ملنا ہے۔" گل نور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے ہاں۔ بھئی ادھر تو مٹھائیاں وغیرہ بٹ رہی ہوں گی۔ سدا کی میٹھے کی شوقین نسرین بھی جھٹ سے تیار ہوگئی۔

"اتنی رات گئے اکیلے کیسے جاؤ گی۔" بھابی نے تشویش سے پوچھا۔

"امتیاز بھائی بھی جا رہے ہیں۔ ٹھہرو میں انہیں کہتی ہوں۔ ان کے ساتھ چلے جانا۔"

یاسرہ لپک کر نلکے پر ہاتھ دھوتے امتیاز کو مطلع کرنے کے لیے باہر چلی گئی تھی۔

——*

"بھئی عید کا لطف تو تب آئے اگر "چال" پر جانے کی اجازت مل جائے۔"

عید کی نماز ماسی ہاجراں کے ہاں گاؤں کی سب عورتوں کے ساتھ مشترکہ طور پر پڑھنے کے بعد گھروں کو واپسی ہوئی تو ڈھیروں مہمان منتظر تھے جن کے لیے طعام کا بندوبست کرنا تھا۔ اسی میں دوپہر گزر گئی۔ سہ پہر کے وقت فراغت ملی تو بھابی نے بڑی حسرت سے کہا۔

گاؤں سے دو ڈھائی میل دور ندی بہتی تھی جس کے اوپر بڑا شاندار برج بنا ہوا تھا اسے یہاں کی اصطلاح میں "چھال" کا نام دیا گیا تھا۔

"تو چلے چلتے ہیں۔ اب تو ہم فارغ ہیں۔۔۔۔"
گل نور کو بھی اشتیاق ہونے لگا تھا۔

اس کی بات پر بھائی ہنسنے لگیں۔

"تم اتنا آسان تھوڑا ہے چندا۔ گھر والوں سے اجازت کون دلوائے گا۔ اور بالفرض سب راضی ہو بھی جائیں تو امتیاز کبھی نہیں جائے گا۔۔۔۔"
کہنے کو تو ایاز بھائی بڑے تھے مگر یہ بات عیاں تھی کہ صحیح معنوں میں گھر کے اہم معاملات میں صرف امتیاز کا حکم چلتا تھا۔ ماموں اور ممانی اس کی رائے کے آگے چپ سادھ لیتے تھے۔

"اے۔ گل! اگر تم بھائی سے کہو تو وہ شاید مان ہی جائیں۔۔۔" یاسرہ نے اسے ٹھوکا دے کر تجویز سامنے رکھی۔

"نہیں۔۔۔" وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ کہنے کو تو وہ کہہ دیتی۔ آخر کزن تھے۔ بھائیوں کی طرح تھے۔ اس سے پانچ چھ سال بڑے تھے اور بڑی شائستگی اور نرمی سے پیش آتے تھے۔ مگر اسے اندیشہ یہ تھا کہ خبر نہیں وہ اجازت دیں نہ دیں اور وہ خوامخواہ بات کہہ کر گنوائے۔ اور اسے اپنی آن اور عزت نفس ہر شے سے زیادہ عزیز رہتی تھی۔

"نہیں بھئی۔ میں نہیں کہوں گی۔ اور وہ جو نہ مانیں تو خوامخواہ کی بے عزتی۔ بھابی آپ خود کہہ دیں۔ آپ تو بڑی ہیں۔"

اس نے اپنا دامن چھڑانا چاہا تھا۔ مگر یاسرہ نے ایک نہ چلنے دی۔

"تم کہہ کر تو دیکھو۔ وہ ضرور مان لیں گے پھر ان کے ذریعے امی' ابا جی اور باقی بڑوں سے اجازت لینا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔۔۔"

وہ بالآخر سب کے مجبور کرنے پر ان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ ادھر بچوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ فادی' طیب' عاطف' ماہ نور اور نسرین وغیرہ ادھر ہی تھے۔

"آؤ گل نور۔۔۔!" اسے دروازہ پر متذبذب پا کر امتیاز بھائی نے اپنائیت سے بلایا تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی اندر چلی آئی۔

"امتیاز بھائی! آپ سے ایک فرمائش کرنا ہے۔ بشرطیکہ پوری کر دیں۔" وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر کچھ مان بھرے۔ جھجکے سے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے ایک نرم نگاہ اس پر ڈالی۔ اورنج کلر کے ستاروں بھرے کپڑوں میں معصومیت سے منہ اٹھائے دیکھتی ہوئی وہ خاصی بے یقینی کا شکار لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ تم کہو۔" ان کے شیریں لہجے نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔

"پہلے وعدہ کریں' مانیں گے۔۔۔۔" وہ سرگرم عمل ہو گئی۔

وہ ایک لمحے کو حیران ہوئے پھر مخصوص دھیمے پن سے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"بھائی! وہ ہمیں "چھال" دیکھنی ہے۔ ہمیں لے چلیں گے ناں۔۔۔"

وہ سمجھ رہے تھے جانے کیا بات ہے۔ جو ان کی خوش مزاج سی پیاری سی کزن بتاتے ہوئے اس قدر جھجک رہی ہے۔ فرمائش سن کر طویل سانس لی۔

"اچھا جناب۔ اور کچھ۔۔۔!" ان کے بشاشت بھرے انداز پر اس نے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔ ادھر چھ پارٹی یہ پروگرام سن کر ایک دم پرجوش ہو گئی تھی۔ ذرا دیر بعد خواتین اور بچوں لڑکوں کا پورا گروپ پیدل مارچ کرتا ہوا "چھال" کی طرف رواں دواں تھا۔ ترت چچی' سائرہ بیگم اور زہراں کو بھی ہمراہ گھسیٹ لیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد چھال پر پہنچے۔ دور سے پانی کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ترو تازہ پانی لوہے کے پیچیدہ ساخت کے پلوں کے نیچے سے بل کھاتا شور مچاتا گزرتا بڑی تمکنت سے گزرتا لمبی چوڑی نہر میں بہہ رہا تھا۔

"بچو! احتیاط سے۔ نہر بہت گہری ہے اور پانی کبھی کبھی آندھی طوفان کی طرح تیز ہوتا ہے یہاں۔" زہراں اپنے شہری بھتیجے اور بھتیجیوں کو خصوصی ہدایت دے رہی تھیں۔

ایاز بھائی چال کے دوسری طرف بنے کھوکھے سے ٹھنڈی ٹھار بوتلیں لے آئے۔ پینے کے لیے ہاتھ میں پکڑیں تو خیال آیا کہ روزے سے ہیں پھر خود ہی اس خیال کی تردید کی کہ نہیں بھئی آج تو عید ہے۔ پورا مہینہ "پرہیز" کے بعد اب دن کو کھانا پینا عجیب سا لگ رہا تھا۔

خوب انجوائے کے بعد واپسی کے لیے رخت سفر باندھا۔

"ہائے اللہ۔ گھر کب آئے گا۔" گل نور کا پیدل چل چل کر برا حال ہو رہا تھا۔ آتے ہوئے تو جوش کے مارے سفر کی طوالت پہ دھیان نہیں گیا تھا مگر اب واپسی کے سفر میں پاؤں ست پڑتے جا رہے تھے۔ عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ کل کی طوفانی بارش کے بعد آج سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور افق پر شفق کی لالی اور ٹھنڈا تاثر دیتی سورج کی شعاعیں فصلوں، ٹیلوں اور درختوں پر جلوہ افروز ہو کر عجب دلنشیں نظارے پیش کر رہی تھیں۔

"کیا ہوا بھئی۔ کیا تھک گئی ہو۔" امتیاز نے ہمدردی سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"بہت۔۔۔" وہ بسوری۔

"افسوس بجو۔ آس پاس کوئی گائے بھینس یا گدھا گھوڑا بھی نظر نہیں آ رہا ورنہ آپ کے لیے "سواری" کا کچھ انتظام کر دیتے۔۔۔"

فادی نے بڑی سنجیدگی سے شرارت کی تھی۔

"فادی! بہت ماروں گی۔"

"امی! ایسا کریں۔ آپ لوگ ادھر سبزے پر تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کر لیں۔ بعد میں آ جائیے گا۔۔۔"

امتیاز نے ایک نگاہ گل نور کے تھکن زدہ چہرے پر ڈال کر کچھ سوچتے ہوئے ماں کو تجویز پیش کی۔ بزرگ خواتین تو پہلے ہی اس موڈ میں تھیں وہ نزدیکی ٹیلے پر بیٹھ گئیں۔ لڑکے اور بچے بدستور آگے بڑھتے گئے۔ بھابی اور ثروت چاچی بھی لڑکوں کے ساتھ تھیں۔ عصر ہو چکی تھی۔ گھر جا کے ہانڈی روٹی بھی دیکھنی تھی پھر شادی میں شرکت کے لیے مہمان وغیرہ بھی کل سے آنا شروع ہو جانے تھے۔ سارے کام دھندے اور انتظامات شادی کے ہنگامے شروع ہونے سے پہلے نپٹانے تھے۔

تو حاملنٹ آرام کرنے کے بعد پیچھے رہ جانے والا قافلہ سفر کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا اور جب وہ لوگ گھر پہنچے تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گل نور تو اس قدر نڈھال تھی کہ منہ ہاتھ دھو کر ان ہی کپڑوں میں پڑ کے سو رہی تھی۔

یہ بھی نہ دیکھا کہ کہاں سونے کے لیے لیٹی ہے۔

رات کھانے کے بعد امتیاز اپنے کمرے میں آئے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ لکڑی کی سادہ سی مسہری پر اورنج کپڑوں میں الجھے بکھرے بالوں سمیت وہ بے خبر سو رہی تھی۔

"جانے کتنی تھکن ہو گی۔ آرام کرنے سے اتر جائے گی۔" وہ اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے بیٹھک میں سونے کے ارادے سے باہر نکل آئے۔

"امی۔! میرے لیے بیٹھک میں ابا جی کے ساتھ چارپائی ڈال دیں۔" وہ برآمدے میں بیٹھی زہراں کے پاس چلے آئے تھے۔

"کیا ہوا۔ کمرے کا بلب فیوز ہو گیا کیا؟۔"

زہراں کو ہمیشہ اپنے لاڈلے کی پڑھائی لکھائی اور آرام کا دھیان رہتا تھا۔

"نہیں۔۔۔" وہ مبہم سا مسکرائے۔

"دراصل گل نور کو نیند کی جھونک میں پتا نہیں چلا۔ ادھر مسہری پر آ کے سو گئی۔ میں نے سوچا۔ اٹھا کر کیوں بے آرام کروں۔ اسے وہیں سویا رہنے دیں۔ آپ میں سے کوئی ایک ساتھ میں سو جائے۔ مجھے بیٹھک میں بستر سیٹ کر دیں۔۔۔"

ان کی بات سب کے لیے حیران کن تھی انہیں اپنے کمرے کے علاوہ کہیں اور نیند نہیں آتی تھی۔ ایمرجنسی میں بھی کمرہ اور مسہری چھوڑنا انہیں سخت گراں گزرتا تھا۔ مگر اب کے کس درجہ آمادگی اور آرام سے دستبردار ہو گئے تھے۔

"ہائے۔ میری بچی۔" زہراں کے دل میں بھانجی اور بھتیجی کی محبت نے جوش مارا۔ وہ ویسے بھی گل نور سے خصوصی محبت رکھتی تھیں۔

"کہاں عادی ہے پیدل چلنے کی۔" ماہ نور کو تو واپسی میں اس کے بابا جان نے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ "اے بخت میری بچی نے تو کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔" وہ اس کے بھوکا رہ جانے کے خیال سے پریشان ہو رہی تھیں۔

"ہاں۔ میں کھانے کے وقت ڈھونڈ رہی تھی اسے۔" بھابی نے جلدی سے بتایا پھر خیال کیا اپنی دادو کے یہاں چلی گئی ہوگی۔

"جایا سرو! بھائی کے لیے پلنگ بچھا دے بیٹھک میں اور پھر بہن کے پاس سو جانا امتیاز کے کمرے میں۔"

"گل نے بھی خوب کیا۔ ابھی سے قبضہ کر لیا ہے۔" امتیاز بھائی مڑے تو یاسرہ نے ذو معنی مسکراہٹ سے ماں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

بھابی اور شانو ہنس پڑیں۔ زہراں کے ہونٹوں پر بھی سرشاری مسکراہٹ در آئی۔ یہ فیصلہ تو اپنے طور پر وہ بہت پہلے کر چکی تھیں اور دبے لفظوں میں بارہا سائرہ کو اشارہ بھی کر چکی تھیں۔ واضح طور پر بھائی کے آگے جھولی دراز کرنے سے پہلے وہ امتیاز کے برسر روزگار ہونے کا انتظار کر رہی تھیں پھر اس سے بھی زیادہ ضروری شانو کے بعد یاسرہ کی شادی تھی۔ یاسرہ کا فی الحال خاندان میں کوئی جوڑ نہیں مل رہا تھا اور وہ لوگ باہر کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اپنا آخر اپنا ہی ہوتا ہے۔

--*

شادی کے ہنگامے پوری طرح جاگ چکے تھے۔ گھر کے تمام ذمہ دار افراد مصروف عمل تھے۔ گاؤں کے "کامیوں" کی خدمات کی حاصل کر لی گئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود سر کھجانے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ خاندان برادری کے لوگ تو جو تھے سو تھے اس کے علاوہ بھی ملنے جلنے والے دوست احباب اور تعلق داروں کا ایک ہجوم بیکراں تھا۔ جو مہندی کے دن تک نقطہ عروج تک پہنچ گیا تھا۔

گل نور، ماہ نور کی پیشن گوئی کے عین مطابق ابتدائی کوفت کے بعد اب بالکل فٹ فاٹ ہو کر پوری طرح "فارم" میں آچکی تھی اور تندہی سے بھابی اور واسو کے ساتھ کام دھندوں میں الجھی ہوئی تھی۔

اس کی کزنز اور گاؤں کی دیگر لڑکیاں اس کی سرگرمیوں کو بڑی دلچسپی اور ستائش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

"نی تیری ماسے کی بیٹی تو بڑی سادہ ہے۔ بالکل شہرن نہیں لگ رہی کوئی نخرا نہیں۔ دیکھ تو کیسے فکر مندی سے مردانے میں چائے پانی کے انتظامات میں لگی ہوئی ہے۔"

شانو کی کسی سکھی نے تعریفی انداز میں کہا تھا۔

"اور کیا" شانو کی گردن فخر سے اکڑنے لگی۔ "مزاج کی اتنی اچھی ہے کہ کیا بتاؤں۔ خیر سے تیل کی رسم میں سب کہہ کر تھک گئے کہ ڈانس کرو۔ سنا ہے شہری بڑا اچھا ڈانس کرتے ہیں مگر آفرین ہے۔ وہ غریب سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جان چھڑانے لگی کہ مجھے تو گانے کا ایک بول بھی یاد نہیں ڈانس کیا کروں گی۔ ذرا بھی چنچل نہیں ہے۔ جس طرح وہ غفور کی چاچے کی شہرن لڑکی تھی۔ یاد ہے کیسے لہرا لہرا کے منہ بگاڑ کے انگریزیاں مارتی تھی۔"

"ہائے بی بی! میں صدقے جاواں کپڑے بدل لو تسی کیسے پسینوں پسینوں ہو رہے ہو۔" کنیز اس کو حال سے بے حال لینن کے ہلکے پھلکے ملگجے کپڑوں اور الجھے بالوں کی چوٹی میں دیکھ کر بلبلائی تھی۔ بڑے خوشامد سے کہہ رہی تھی۔

"زہراں بی بی نے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔ صبح کے کپڑے دو بجے پہن لو بی بی۔"

"چائے نہیں بنی؟ ہلو وال سے کچھ مہمان آ بیٹھے ہیں۔"

اسی لمحے امتیاز مصروف سے انداز میں رسوئی میں داخل ہوئے تھے۔

"ہم بھی ابھی بھجوائی ہے فادی اور طیب لے کر گئے ہیں۔"

گل نور نے چائے کے لیے مزید پانی رکھنے کے بعد مٹھائی کے ڈبے لکڑی کی دیوار گیر الماری میں محفوظ کرتے ہوئے بتایا۔

الماری بند کر کے ان کی جانب مڑی تو وہ جانے کے لیے پر تولتے ہوئے ایک لمحے کو رک گئے۔ غور سے

اسے دیکھنے کے بعد بولے۔

"تمہارا تو برا حشر ہو گیا ہے کام کر کے 'یا سرو اور بھابھی لوگ کدھر ہیں اور کنیز تم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے کیوں کھڑی ہو۔" انہوں نے تیکھی نگاہ کنیز پر ڈالی۔

"خیر ہے بھائی۔" وہ بشاشت سے مسکرائی۔ "اپنا ہی گھر ہے۔ مجھے بالکل بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی۔"

اس کی بات پر انہوں نے ایک تجزیاتی نگاہ اس پر ڈال کر ہٹالی۔ کنیز دانت نکال رہی تھی۔

"وہ تو آپ کا ہی گھر ہے۔ اللہ رکھے۔ پر دیکھو ناں مہندی شروع ہونے والی ہے۔ ساری لڑکیاں بج سنور کے تیار شیار ہو چکی ہیں۔ آپ بھی کام چھوڑ دو ناں بہن۔"

"ہاں۔ بس اب نکل ہی رہی تھی۔" وہ چوٹی سے نکلی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ "وہ امتیاز بھائی؟ پلیز کہیں سے استری کا بندوبست کر دیجیے گا۔ مجھے یاد آیا۔ کپڑے بغیر استری کے بیگ میں بند ہوں گے۔"

وہ یاد آجانے پر بعجلت بولی تھی۔ کنیز کی ذو معنی بات کو دونوں نے اہمیت نہیں دی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ باہر نکل گئے تھے۔

"بڑا خیال رکھتے ہیں جی امتیاز بھاؤ آپ کا۔" کنیز شوخی سے آنکھیں نچاتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"وہ سب کا ہی رکھتے ہیں۔" وہ جھلا کر بولی۔ اور باہر نکل گئی۔

"یہ مہندی کے تھال کس نے سجائے ہیں۔" مہمانوں میں سے کسی نے اشتیاق سے دریافت کیا تھا۔ مٹی کے بڑے بڑے تھالوں میں چمکدار پنیاں بچھا کر مہندی کی تہیں جمانے کے بعد خوب صورتی سے موم بتیاں لگائی گئی تھیں۔

"میں صدقے جاواں۔ میری بھتیجی اور بھانجی گل نے کیا ہے سارا انتظام۔" زہراں خوشی خوشی بتا رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ بڑی گنوں والی ہے۔ صبح سے پھر کی کی طرح ادھر اُدھر گھومتے دیکھ رہے ہیں ہم۔" کسی بزرگ خاتون نے داد دی تھی۔

ایک موڑھا بڑی خوب صورتی سے سجا سنوار کے اس پر پیلے کپڑوں اور سرخ دوپٹے میں لجاتی، شرماتی شانو کو بٹھا دیا گیا تھا۔ سات سہاگنوں نے شانو کے ہاتھ پہ پتا رکھ کے مہندی لگائی۔ پھر گانوں اور ٹپوں کا مقابلہ ہوا۔ گاؤں سے آنے والے مہمانوں کو مٹھائی اور چائے پلا کر رخصت کیا گیا اور پھر رات ٹھہرنے والے مہمانوں کے لیے کھانے کے انتظامات شروع کر دیے گئے تھے۔

شادی کے روز دلہن کو سجانے سنوارنے میں گل نور کا بیوٹیشن کا کورس خوب کام آیا کیونکہ گاؤں میں پارلر سے دلہن تجوانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔

رخصتی کے بعد بھی گھر میں اک ہنگامہ بپا تھا۔ مہمان حضرات اور خواتین کا رات قیام کے بعد روانگی کا ارادہ تھا۔

ایک بیٹی کو رخصت کر دینے کے فوراً بعد جانے تدبیر صاحب کے دل میں کیا سمائی کہ یاسرہ کے لیے بے تاب سے ہو گئے۔ ایک خیال اچانک ذہن میں آیا اور جب محمود صاحب مع فیملی واپس پنڈی روانہ ہونے کی تیاریوں میں تھے تو ایک دن پہلے انہوں نے زہراں کو اپنا ہم خیال بنانے کے بعد سائرہ سے بات شروع کی۔

انہوں نے پوری بات سنی تو ہکا بکا رہ گئیں۔ اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"دیکھو سائرہ! تم مجھ سے چھوٹی ہو۔ پھر میری سگی بہن ہو۔ تم سے میرا کچھ پردہ نہیں۔ اس لیے براہ راست کہہ رہا ہوں۔ تاکہ محمود کے کان میں یہ بات ڈالو۔ میں دمے کا مریض ہوں جانے کب اوپر سے بلاوا آجائے اس سے پہلے بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ گو مجھے نسرین کی بھی فکر ہے مگر وہ ابھی کمسن ہے۔ تیرہ چودہ برس کی ہے۔ سب سے زیادہ فکر یاسرہ کی ہے۔ اس کی عمر نکلی جا رہی ہے خاندان میں دور پار کہیں کوئی جوڑ نہیں اور غیروں میں دینے کا جگرا نہیں ہے مجھ میں۔ جانے کیسے نکلیں... اس لیے سوچنے کے بعد تمہارا در نظر آیا ہے۔ کوئی حرج نہیں

"قدیر بھائی صاحب! آپ سوچیے تو فادی اور یاسرہ کی عمروں میں بڑا واضح فرق ہے۔" وہ صدمے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھیں کہ انہوں نے ایسا بے جوڑ رشتہ باندھنے کا سوچا بھی کیوں! یاسرہ تو گل نور سے بھی ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی جبکہ گل نور فادی سے پورے پانچ سال بڑی تھی۔ اس لحاظ سے یاسرہ کم از کم چھ سال بڑی تھی فادی سے۔

"عمروں سے کیا ہوتا ہے سائرہ! اس سے پہلے بھی تو ہمارے خاندان میں ایسی شادیاں ہوتی رہی ہیں۔ خود تم محمود سے دو سال بڑی ہو۔ تمہاری بھابی زہراں مجھ سے ڈھائی سال بڑی ہیں۔" وہ عمروں کے فرق کو چنداں اہمیت نہیں دے رہے تھے۔

"وہ زمانے اور تھے بھائی صاحب بس نبھ گئی جیسے تیسے۔ آج کل کے زمانے میں ایسے رشتے زیادہ دیر تک نہیں چلتے۔ پھر ماحول کا فرق ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فادی نے ابھی کیریر بنانا ہے۔ وہ انڈر میٹرک ہے۔ ابھی کم از کم چھ سال پڑے ہیں اس کی تعلیم مکمل ہونے میں۔ اس کے بعد جاب ڈھونڈے گا پھر کہیں عملی زندگی اسٹارٹ کرے گا۔"

"اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دے رکھا ہے۔ شہر میں بنگلہ ہے۔ پھر باپ آرمی آفیسر ہے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ فادی شادی کے بعد آرام سے پڑھتا رہے گا۔ یاسرہ تو ویسے بھی بڑی صابر و شاکر بچی ہے۔ اس کے کسی معاملے میں دخل نہیں دے گی۔ دیکھو بھئی اپنے ہی وقت آنے پہ اپنوں کو ڈھانپتے ہیں۔ بیٹیوں کی فکر نے میری نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ بھلے سے شادی دو تین سال بعد ہو جائے مگر منگنی وغیرہ کی رسم ابھی ادا ہو جائے بلکہ میں تو تجویز دیتا ہوں کہ نکاح کر دیتے ہیں۔"

وہ اس قدر عجلت کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ سائرہ کے تحمل جواب مناسب جوابی کاروائی کرنے کے لیے ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"میں نے ایاز کے علاوہ امتیاز سے بھی بات کی ہے وہ بھی اس رشتے کا حامی ہے۔"

انہوں نے بطور خاص کہتے ہوئے سائرہ کے اعصاب پر گویا دو سرا دھماکہ کیا تھا۔ "میں جواب لیے جلدی ہی پنڈی آؤں گا تم محمود سے بات کر لینا۔"

پنڈی واپس آ کر کتنا ہی عرصہ وہ بے کل رہی تھیں۔ کس منہ سے محمود سے بات کریں۔ مگر کرنا بھی ضروری تھی۔ قدیر بھائی نے ایک ماہ بعد آنے کا کہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔

بالآخر یہ عجیب و غریب تجویز انہوں نے محمود صاحب کے سامنے رکھ دی۔ وہ سن کر کتنی ہی دیر بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتے رہے۔ پھر غصہ کرنے لگے سائرہ پریشان سی ہو کر ان کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

"کس درجہ خود غرض ہیں قدیر بھائی۔ اپنی بیٹیاں تو نظر آ گئیں اور دوسروں کی دکھائی نہیں دیتیں کوئی ان سے پوچھے فادی بڑا ہے کہ گل نور؟ انہیں یاسرہ کی جلدی ہے تو ہمیں بھی اپنی جوان بیٹی کی فکر ہو سکتی ہے۔ وہ اگر شانو اور یاسرہ کی شادیوں کے بعد اعجاز کا سوچ رہے ہیں تو کیا ہم گل نور سے پہلے فادی کی شادی کا سوچ سکتے ہیں؟ اور وہ بھی اس قدر بے جوڑ شادی۔"

محمود صاحب کی برہمی بالکل صحیح تھی۔

"یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں ہے نال۔ اب وہ آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ ہم ابھی اپنے بچوں کو ان ذمہ داریوں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پڑھ لکھ جائیں۔ پھر سوچیں گے۔ ہمیں بیٹی یا بیٹے کسی کی شادی کی جلدی نہیں ہے۔ اور مجھے بالکل پسند نہیں کہ بچوں کے کان میں ایسی بات پڑے۔"

قدیر صاحب آئے تو پشیمان سی سائرہ نے ڈھکے چھپے انداز میں محمود کا پیغام ان تک پہنچایا۔

"بھئی کیا مسئلہ ہے۔" وہ قدرے ناگواری سے بولے۔

"اگر تم لوگ یہ سوچ رہے ہو کہ وٹہ سٹہ ہو جائے تو ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمارا تمہارا کیس ہمارے ... بات ہے۔ تمہاری اور زہراں کی اس طرح شادیاں ہوئی ہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ امتیاز نے ... بات کی گارنٹی دی ہے۔ انشاء اللہ ہماری دونوں ... یاسرہ اور گل نور خوش رہیں گی اپنے اپنے گھر ...

میں۔"

"یہ بات نہیں ہے بھائی صاحب۔۔۔یاسرہ بھی میری بیٹی ہے۔ مجھے گل اور ماہی کی طرح عزیز ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس کا نصیب اچھا کرے۔ ہم خود تلاش کریں گے اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ۔"

سائرہ نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا بھائی کو انکار کرتے ہوئے بھی شرمساری ہو رہی تھی مگر کیا کرتیں۔ اولاد کا معاملہ تھا۔

"اگر ایک دو سال کے فرق کی بات ہوتی تو بھی میں کبھی نہ سوچتی مگر اب۔"

"بھئی عمروں کا فرق تو محض بہانا ہے۔" قدیر صاحب خفا ہونے کے موڈ میں نظر آرہے تھے "مجھے واضح جواب دو۔ یہ تو صاف گھر بلا کر ذلیل کرنے والی بات ہے۔"

بالآخر محمود صاحب کو براہ راست بات کرنا پڑی۔ ان کا دوٹوک لہجہ سن کر قدیر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ بگڑے تیور لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم لوگوں کا انداز تو قطع تعلقی والا ہے۔ گویا یہ اشارہ دے رہے ہو کہ آئندہ کے لیے تم سے مزید رشتے داری بڑھانے کا نہ سوچا جائے۔" ان کا اشارہ گل نور کی طرف تھا۔

"بھائی صاحب! آپ بات کو سمجھیں۔ یوں ناراض ہو کر نہ جائیں۔" سائرہ ان کے سرد لب و لہجے کا پس منظر سمجھ کر نرمی سے انہیں سمجھانے لگیں۔ گل نور کے لیے وہ ہمیشہ سے امتیاز کو چشم تصور میں داماد کے روپ میں دیکھا کرتی تھیں۔ خود زہراں بارہا اشارۃً اپنا ارادہ بتا چکی تھیں۔

"دیکھیے قدیر بھائی! یہ کسی حدیث میں نہیں لکھا کہ صرف خاندان میں ہی رشتے کیے جائیں۔ اگر خاندان سے باہر کوئی اچھا رشتہ مل جاتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ کیا ضروری ہے محض خاندان میں کسانے کے چکروں میں بے جوڑ شادیاں کی جائیں۔ انشاء اللہ خاندان سے باہر یاسرہ کے لیے بڑا اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

محمود صاحب نے نرم لہجے میں کہا تھا۔ قدیر صاحب جواب میں کچھ نہیں بولے۔ بگڑے تیور لیے سنکھوال واپس لوٹ گئے۔ جہاں بیوی اور دونوں جوان بیٹے ایاز اور امتیاز پوری کارروائی سننے کے لیے بری طرح بے تاب تھے۔

انہوں نے سب کہہ سنایا۔

پھر جانے کیا سوچ کر امتیاز اور قدیر صاحب یاسرہ کے رشتے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ دو ماہ بعد جان پہچان کے لوگوں میں ایک رشتہ مل گیا۔ اور ٹھیک چار ماہ بعد شادی رکھ دی گئی۔

۔۔*

"ارے۔۔۔ یاسرہ کی شادی کا کارڈ ہے! ابھی تو شاہو کی شادی کو بمشکل سات آٹھ ماہ ہوئے ہوں گے۔ واؤ زبردست۔ خوب مزہ آئے گا ہم لوگ چلیں گے ناں امی۔"

گل نور حد درجہ اشتیاق سے گم صم بیٹھی امی سے پوچھ رہی تھی۔ بی اے کے فائنل پیپرز کے بعد وہ بالکل فارغ تھی۔ آج کل میں رزلٹ آنے والا تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ ماسٹرز میں ایڈمیشن لینے کا تھا۔

"خبر نہیں جاتے ہیں کہ نہیں۔" امی نے پھیکے سے انداز میں کہہ کر ٹالا۔

وہ ٹکر ٹکر ماں کی شکل دیکھنے لگی انہوں نے جو کچھ کہا تھا ناممکن ہی تو لگ رہا تھا۔ بھلا قریبی رشتے دار کی شادی ہو اور ہم نہ جائیں۔ وہ ہماری ماسی بھی ہیں اور پھوپھو بھی۔

"امی! کیا بات ہے۔ آپ بہت اداس بلکہ مایوس نظر آرہی ہیں۔"

وہ لمحوں میں ان کا متغیر چہرہ بھانپ کر ان کے موڈ کا اندازہ لگانے لگی تھی۔

"کیا بتاؤں۔ بس زمانے کے پھیر پر حیران ہوں۔ خدا کی شان ہے۔ کل جو دل و جان نچھاور کرکے قدموں تلے بچھ بچھ کر یہ رشتہ مانگنے کی جرائتیں باندھا کرتے تھے۔ آج اس بے مروتی سے انکاری ہو رہے ہیں۔"

"ہوا کیا ہے امی۔" وہ واضح طور پر ہراساں ہو گئی۔

لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی۔

"تمہارے ماموں یہاں سے لوٹے تو خاصے خفا تھے کہ میں خود بیٹی کا رشتہ لے کے اتنی امید سے آیا اور مجھے ذلیل کیا گیا۔ مذاق اڑایا گیا کہ باہر سے ڈھونڈ لو بیٹی کے لیے 'یہ زمانہ آگیا ہے۔ یہ عزت ہے میری۔ جا کر پھر بیٹوں کو سنایا۔ امتیاز نے کہا۔

"ٹھیک ہے جب ہماری بیٹیاں غیروں میں جا سکتی ہیں تو پھر اب ہم بھی باہر سے ہی لائیں گے۔" ثروت نے بتایا ہے مجھے۔ وہ اس وقت وہیں موجود تھی جب یہ ساری بات ہوئی۔ سائرہ بڑی آزردہ تھیں۔

"تمہارے بابا جان تو شروع سے ہی تمہارے لیے کچھ اور سوچے ہوئے تھے۔ وہ تو میں نے بھائی صاحب اور خاص طور پر زہراں بھابھی کے بار بار اصرار کے بعد محمود سے امتیاز کے بارے میں بات کی تھی۔ پہلے تو وہ راضی ہی نہ تھے پھر میرے گاہے بگاہے اصرار پر اور تمہارے رحجان کو دیکھتے ہوئے تقریباً" رضامند ہو گئے تھے کہ قدیر بھائی اور امتیاز کی طرف سے یہ رویہ دیکھنے کو مل گیا۔"

گل نور کو جیسے بجلی کا شاک لگا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ کانوں کے پاس سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑنے لگا۔ اس قدر تذلیل و تحقیر!

"امی۔ کس قدر غلط سمجھا ہے انہوں نے ہمیں اور خاص طور پر امتیاز بھائی نے۔ ایک کزن کے رشتے سے 'بڑے بھائی کی حیثیت سے ہم ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں یا احترام اور اپنائیت سے پیش آئے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ....."

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے انہیں دیکھا 'ان سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ دوہرا تعلق ہے۔ وہ اگر ان باتوں کو ہماری خواہش یا رضامندی سمجھ بیٹھے ہیں تو ان کی غلط فہمی ہے۔ میں نے کبھی اس نظریے سے ان کی پذیرائی نہیں کی اور ان کا کیا خیال ہے ہم ان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں!

ہمیں خدا کے فضل سے کچھ کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزاروں مل جائیں گے۔"

غم و غصے 'احساس توہین اور عزت نفس مجروح ہونے کے احساس سے وہ لال ہو رہی تھی۔ گو اس نے امتیاز کے بارے میں ابھی ایسا سوچا نہیں تھا۔ مگر اس کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ ان کی نفیس عادات اور دھیمے سلجھے ہوئے متین انداز کو پسند کرتی تھی۔ کچھ یہ بھی تھا کہ امی نے کبھی واضح انداز میں اس متوقع بندھن کا ذکر بھی نہیں کیا تھا (بابا جان کے حکم کی وجہ سے) وگرنہ وہ شاید مثبت انداز میں ان کے بارے میں سوچ چکی ہوتی اور اچھا ہی ہوا وابستگی کا وہ لمحہ آنے سے پہلے ہی موصوف کی گھٹیا سوچ اور انتہا پسندانہ طرز عمل سامنے آگیا تھا۔

"خیر..... ہمیں کیا فرق پڑتا ہے بھلے سے لے آئیں کہا باہر سے۔ شوق پورا کر لیں اپنا۔" سائرہ اپنی رنجیدگی مٹانے کو خود کو بہلا رہی تھیں۔

"شکر ہے نہ منگنی ہوئی تھی اور نہ ابھی بات باہر نکلی تھی وگرنہ کتنی بدنامی ہوتی۔ مجھے خبر ہے زہراں کو باپ بیٹے کی اس انتقامی سوچ سے تکلیف پہنچی ہوگی وہ تو شروع سے اس بندھن کی دلی خواہاں رہی ہے۔ خیر اب کسی کو کیا دوش دیا جائے۔ آج کل کی نئی نسل کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں۔"

"ان کی سوچ ہو گی کہ جس طرح ہم لاچاری اور بے بسی کے عالم میں ان کے پاس بیٹی کے لیے گئے تھے 'اسی طرح یہ لوگ بھی ایک دن خود ہمارے بیٹے کے رشتے کے لیے آئیں گے۔ ہونہہ ماموں اور ان کے صاحبزادے کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو گی۔ اور امی! اب آپ سن لیں 'مجھے وہ شخص مر کر بھی قبول نہ ہو گا چاہے اب وہ سونے کا بن کر ہی کیوں نہ آجائے۔ اتنی سستی نہیں ہوئی ابھی گل نور محمود خان 'بھلے اس دہلیز پہ کنواری بیٹھی رہ جاؤں مگر ادھر کے لیے نہیں سوچوں گی۔

یاسرہ کی شادی پر رسم پوری کرنے کے لیے صرف بابا جان اور ماہ نور گئے تھے سنکھوال پھر مسلسل دو سال تک نہ ادھر سے کوئی آیا نہ گیا۔

امتیاز کو انجینیئرنگ کمپنی میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔ اب وہ عملی زندگی میں آگیا تھا۔

اس دوران میں گل نور نے ایم اے کر لیا۔ پھر یونہی وقت گزاری کے لیے ٹیچنگ کرنے لگی۔ امی اور بابا جان اب اس کی شادی کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہے تھے قسمت کی بات تھی کہ اس دوران میں اس کا کوئی خاص ڈھنگ کا پرو پوزل بھی نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ پریشان تھے۔ بیٹی کی عمر ڈھلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ یاسرہ اس دوران ایک بچے کی ماں بھی بن چکی تھی۔

اس روز بابا جان آرمی یونیفارم میں اپنے ایک دوست کا استقبال کرنے کے لیے ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوئے تو واپسی میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اتنا خطرناک کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سانحہ اس قدر دل شکن تھا کہ ہفتوں ان کو اپنے گردوپیش کا ہوش نہیں رہا تھا۔

بے سائبانی اور ویرانی کا عجب عالم تھا۔

وہ لوگ ابھی تک تو آرمی کی طرف سے ملنے والے گھر میں رہتے تھے۔ مگر اچھے وقتوں میں محمود صاحب نے پنڈی میں گھر بنا لیا تھا۔ نیچے کا پورشن تو مکمل تھا اوپر ان دنوں کام شروع کرایا ہوا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ چالیسویں کے بعد وہ لوگ آرمی کالونی چھوڑ کر پنڈی چلے آئے غنیمت تھا جو محمود صاحب نے رہائش کے لیے یہ انتظام کر دیا تھا ورنہ اس کڑے وقت میں کہاں جاتے۔ ہرچند کہ دادو اور اجمل چاچا نے بہت زور لگایا تھا گاؤں چلنے کے لیے، مگر بچے اس حق میں نہیں تھے اور ان حالات میں ایسا ممکن بھی نہیں تھا۔ فادی بی ایس سی میں تھا۔ راولپنڈی کے کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ماہ نور میٹرک میں تھی۔ پھر گل نور کی جاب بھی ادھر ہی تھی۔ ایسے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں مقیم ہونا گویا بچوں کا مستقبل تاریک کرنے کے مترادف تھا اسی لیے سائرہ نے بچوں کا ساتھ دیا تھا۔

"جوان اولاد ہے۔ خصوصاً" بچیاں، "شہر میں عجب لوٹ پڑی ہوئی ہے۔ پہلے کی بات اور تھی اب تنہا عورت۔"

قدیر صاحب پریشانی کے عالم میں بس کو وقت کی نزاکت کا احساس دلا رہے تھے۔ اجمل چاچا بھی ان کے ہم خیال تھے مگر سائرہ اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور تھیں۔

"سب سے زیادہ فکر گل نور کی ہے۔ جوان جہان لڑکی ہے۔ شادی کی عمر ہے اس کا فرض ادا کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یوں کب تک گھر بٹھائے رکھیں گے۔ اور خصوصاً" ایسی صورت حال میں جبکہ باپ بھی سر پر نہیں رہا یہ اور بھی سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔" اجمل چاچا سرپرست ہونے کے ناتے اپنی فکرمندی کا اظہار کرنے میں حق بجانب تھے۔

"گل نور کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ اپنے ہی اپنوں کا ہوتے ہیں۔ ہمارا خیال تو نہیں کیا گیا مگر ہم اس نازک وقت میں طوطا چشمی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ میں جا کر امتیاز سے بات کروں گا۔ پھر میں اور زہراں آئیں گے بات پکی کرنے میرا خیال ہے زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ امتیاز کی رضامندی لے کر سادگی سے نکاح کر کے بچی کو گھر لے آئیں گے۔"

قدیر صاحب نے اپنی طرف سے اعلیٰ ظرفی اور معاملہ فہمی کی مثال قائم کی تھی۔ سائرہ سر جھکائے لب بستہ بیٹھی رہ گئیں۔

کیا کہتیں، مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ سر کا سائیں سلامت ہوتا تو بھائی کے اس احسان کو خندہ پیشانی سے واپس لوٹا دیتیں۔

مگر اب مجبور تھیں۔ ورنہ ان کی بیٹی اتنی ارزاں بھی نہیں تھی اب کہ کوئی ہزار احسان کے بعد قبولنے پر آمادہ ہو، انہیں امتیاز کے وہ الفاظ نہیں بھولتے تھے۔

"ٹھیک ہے، اگر ہماری غیروں میں جا رہی ہے تو پھر ہم بھی اب غیروں کی ہی بہو لائیں گے۔"

محمود صاحب کو جب یہ خیالات اور قدیر صاحب کے ارادوں کے بارے میں خبر ہوئی تھی تو انہوں نے غصے کی انتہائی حدود چھوتے ہوئے آئندہ سے قدیر صاحب کی فیملی سے میل ملاپ کے دروازے ہی بند کر لیے تھے۔ ان کی یہ جرات کہ وہ ان کی راج دلاری، شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی، لائق فائق بیٹی کی

اس طرح تذلیل کریں۔"

سرخ زرتار جوڑے میں وہ دلہن بنی پھولدار بیڈ شیٹ سے مزین سادہ سی مسہری پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مسہری کے مقابل دو آبنوسی کرسیاں اور میز رکھی ہوئی تھی۔ دائیں جانب لکڑی کی دیوار گیر الماری تھی۔ آمنے سامنے دو ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ سائیڈ پر باتھ روم تھا۔ اور بس۔

کمرے کی سادگی اور خاموشی اس کے مکین کے غیر رومانی اور گپ چپ مزاج کی عکاسی کر رہی تھی۔

امتیاز ابھی کمرے میں نہیں آئے تھے۔ باہر دروازے پر نیگ لینے والیوں کا شور اندر تک آ رہا تھا۔

"میرا نیگ سب سے زیادہ بنتا ہے امتیاز بھائی! میں شروع سے پیش گوئیاں کرتی آ رہی ہوں کہ گل ہی ہماری بھابھی بنے گی۔ لاکھ ادھر ادھر دیکھ لیں۔"

یاسرہ کی خوشیوں سے چور کھلکھلاتی آواز گواہ تھی کہ اس نے وادی والے معاملے کو دل پر نہیں لیا تھا اور راضی برضا تھی۔

"ایسے تو نہیں جا سکتے ویرے! پہلے جیب ہلکی کرو، اتنی پیاری شہرن ووہٹی بیاہ کے لائے ہو۔"

نجمہ بھابھی اپنے مخصوص مہربان ٹھنڈے میٹھے لہجے میں امتیاز سے مخاطب تھیں۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ یقین کریں۔ مجھے آرام کرنا ہے۔"

امتیاز کے لہجے کی بیزاری اور جھنجلاہٹ گل نور یہاں بیٹھے محسوس کر سکتی تھی۔

"اوہو، آرام واہ بھرا جی ہمیں غچہ دیتے ہو۔"

بے شمار شوخ و شریر آوازیں اور سیٹیاں اس جملے کے پیچھے آئی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں دوپٹوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنس رہی تھیں۔

"اے۔ کیوں تم لوگ دہلیز پہ کھڑی ہی ہی ہاہا کر رہی ہو۔ دلہن غریب تھکی ہوئی ہے اتنے لمبے سفر کے بعد دو پل کو بیٹھنا نصیب ہوا ہے ہٹو میرے بچے کو اندر جانے دو۔"

زہراں اب میدان میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے جھڑک کر سب کو ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"لے ماسی۔ ہم تو اپنا حق وصول کر کے جائیں گے، اتنی اچھی ووہٹی ملی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" "تو دینا ہی پڑے گا امتیاز بھائی کو۔"

ایک چلبلی مٹیار نے پراندہ ہلاتے ہوئے اعلان کیا تھا۔

"ہاں ہاں۔ میں کون سا منع کر رہی ہوں۔ جو جائز حق بنتا ہے ضرور لو مگر ذرا جلدی۔ بچارا امتیاز بے آرام ہو رہے ہیں۔ اے نجمہ! آگل کو پانی شانی پلایا تھا؟؟ روٹی تو مجھے پتا ہے نہیں کھائے گی۔ شہری لوگ کھانے پینے کے ٹائم کا بڑا دھیان رکھتے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے تو بارات گاؤں پہنچی ہے۔"

زہراں کو اپنی لاڈلی بہو پہ ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔ برسوں کا ارمان پورا ہوا تھا۔ قدیر صاحب اور ان کے ارادے کچھ بھی رہے ہوں مگر وہ گل کو بہو بنانے کے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں سرکی تھیں۔

"جی ماسی! دودھ پلایا تھا۔ اور کھانے کا پوچھا تو اس نے فوراً" ناں کر دی تھی۔" نجمہ نے ساس کی تسلی کرائی۔

پھر شور تھمنے لگا۔ امتیاز ماں، بہنوں اور بھابھی کے سامنے اندر جاتے ہوئے جھینپ رہے تھے۔ بہت سے ادھر ادھر ہو گئے اور جب بھیڑ چھٹ گئی تو پیچھے سے اندر چلے آئے۔

دروازے کی کنڈی چڑھا کر مسہری کی طرف مڑے تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

وہ لباس وغیرہ بدلنے کا بہت دیر سے سوچ رہی تھی مگر اس اندیشے سے اب تک مسہری پہ بیٹھی رہی کہ کزنز یا گھر والوں میں سے کوئی اندر نہ چلا آئے۔ جب یقین ہو گیا کہ سوائے امتیاز کے کسی کا انتظار نہیں تو اطمینان سے شیشے کے آگے کھڑے ہو کر زیور اتارنے لگی تھی۔ امتیاز کے اندر داخل ہونے اور کنڈی چڑھانے کے عمل کا بظاہر کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان کی طرف اس کی پشت تھی۔ اور وہ اطمینان سے زیور اتار رہی تھی۔

آئینے میں اس کا عروسی روپ سروپ جگمگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے دیکھتے رہے۔

اس طرح تذلیل کریں۔"

سرخ زرتار جوڑے میں وہ دلہن بنی پھولدار بیڈ شیٹ سے مزین سادہ سی مسہری پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مسہری کے مقابل دو آبنوسی کرسیاں اور میز رکھی ہوئی تھی۔ دائیں جانب لکڑی کی دیوار گیر الماری تھی۔ آئینے سامنے دو ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ سائیڈ پر باتھ روم تھا۔ اور بس۔

کمرے کی سادگی اور خاموشی اس کے مکین کے غیر رومانی اور کم گو مزاج کی عکاسی کر رہی تھی۔

امتیاز ابھی کمرے میں نہیں آئے تھے۔ باہر دروازے پر نیگ لینے والیوں کا شور اندر تک آرہا تھا۔

"میرا نیگ سب سے زیادہ بنتا ہے امتیاز بھائی! میں شروع سے پیش گوئیاں کرتی آرہی ہوں کہ گل ہی ہماری بھابھی بنے گی۔ لاکھ ادھر ادھر دیکھ لیں۔"

یاسرو کی خوشیوں سے چور کھلکھلاتی آواز گواہ تھی کہ اس نے فادی والے معاملے کو دل پر نہیں لیا تھا اور راضی برضا تھی۔

"ایسے تو نہیں جاسکتے ویرے! پہلے جیب ہلکی کرو، اتنی پیاری شہرن ووہٹی بیاہ کے لائے ہو۔"

نجمہ بھابھی اپنے مخصوص مہربان ٹھنڈے میٹھے لہجے میں امتیاز سے مخاطب تھیں۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ یقین کریں۔ مجھے آرام کرنا ہے۔"

امتیاز کے لہجے کی بیزاری اور جھنجلاہٹ گل نور یہاں بیٹھے محسوس کر سکتی تھی۔

"اوہو" آرام واہ بھراجی ہمیں غچہ دیتے ہو۔"

بے شمار شوخ و شریر آوازیں اور سیٹیاں اس جملے کے پیچھے آئی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں دوپٹوں میں منہ چھپا چھپا کر ہنس رہی تھیں۔

"اے۔ کیوں تم لوگ دہلیز پہ کھڑی ہی ہی ہاہا کر رہی ہو۔ دلہن غریب تھکی ہوئی ہے اتنے لمبے سفر کے بعد دولہا کو بیٹھنا نصیب ہوا ہے ہٹو میرے بچے کو اندر جانے دو۔"

زہراں اب میدان میں آگئی تھیں۔ انہوں نے جھڑک کر سب کو ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

"لے ماسی۔ ہم تو اپنا حق وصول کر رہے ہیں۔ اتنی اچھی ووہٹی ملی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ "تو دینا ہی پڑے گا امتیاز بھائی کو۔"

ایک چلبلی شیار نے پراندہ ہلاتے ہوئے اترا کر کہا تھا۔

"ہاں ہاں۔ میں کون سا منع کر رہی ہوں۔ جو جائز حق بنتا ہے ضرور لو مگر ذرا جلدی۔ یہ جھگڑا مکاؤ۔ بچے بے آرام ہو رہے ہیں۔ اے نجمہ! گل کو پانی شانی پلایا تھا؟؟ روٹی تو مجھے پتا ہے نہیں کھائے گی۔ شہری لوگ کھانے پینے کے ٹائم کا بڑا دھیان رکھتے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے تو بارات گاؤں پہنچی ہے۔"

زہراں کو اپنی لاڈلی بہو پہ ٹوٹ کے پیار آرہا تھا۔ ان کا برسوں کا ارمان پورا ہوا تھا۔ قدیر صاحب اور امتیاز کے ارادے کچھ بھی رہے ہوں مگر وہ گل کو بہو بنانے کے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں سرکی تھیں۔

"جی ماسی! دودھ پلایا تھا۔ اور کھانے کا نام سنتے ہی اس نے فوراً" ناں کر دی تھی۔" نجمہ نے ساس کی تسلی کرائی۔

پھر شور تھمنے لگا۔ امتیاز ماں، بہنوں اور بھابھی کے سامنے اندر جاتے ہوئے جھینپ رہے تھے۔ بہانے سے ادھر ادھر ہو گئے اور جب بھیڑ چھٹ گئی تو چپکے سے اندر چلے آئے۔

دروازے کی کنڈی چڑھا کر مسہری کی طرف مڑے تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

وہ لباس وغیرہ بدلنے کا بہت دیر سے سوچ رہی تھی مگر اس اندیشے سے اب تک مسہری پہ بیٹھی تھی کہ کزنز یا گھر والوں میں سے کوئی اندر نہ چلا آئے۔ اب جب یقین ہو گیا کہ سوائے امتیاز کے کسی کا امکان نہیں تو اطمینان سے شیشے کے آگے کھڑے ہو کر زیور اتارنے لگی تھی۔ امتیاز کے اندر داخل ہونے اور کنڈی چڑھانے کے عمل کا بظاہر کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان کی طرف اس کی پشت تھی۔ اور وہ اطمینان سے زیور اتار رہی تھی۔

آئینے میں اس کا عروسی روپ سروپ جگمگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"السلام علیکم۔" بالآخر وہ بولے اور مسہری کے نزدیک چلے آئے۔

"وعلیکم اسلام۔" نہایت آہستگی سے جواب دیتے ہوئے وہ بدستور اپنے کام میں مصروف تھی۔ چہرے پر کسی بھی جذبے کی رمق نہیں تھی۔ زیور کے بعد اب وہ ٹشو پیپر سے میک اپ اتارنے کا کام شروع کر چکی تھی۔

وہ کچھ دیر الجھی ہوئی نظروں سے اس کی حرکات نوٹ کرتے رہے پھر شیروانی اتار کر الماری میں لٹکانے کے ارادے سے بڑھے' اسی اثناء میں گل نور سوٹ کیس سے ہلکا پھلکا نیلا کاٹن کا سوٹ نکال کر تبدیل کرنے کے ارادے سے باتھ روم میں بند ہو چکی تھی۔

وہ باہر آئی تو امتیاز کپڑے تبدیل کرنے کے لیے چلے گئے۔

جب وہ باتھ روم سے باہر آئے تو اسے مسہری کے ایک کونے پر رضائی میں لیٹے دیکھ کر قدرے چونکے اور پھر اس سے مخاطب ہوئے۔

"کیا بات ہے گل نور! طبیعت تو ٹھیک ہے خدا نخواستہ۔" ان کے لہجے میں وہی پرانی اپنائیت آمیز فکر مندی تھی۔

گل نور نے چونک کر آنکھوں سے بازو اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ جانے کیا ہوا۔ ان سے نظریں نہ ملا پائی۔ دوسرے ہی لمحے نگاہ چرالی تھی۔

شاید یہ اس بندھن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جھجھک تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے دوسری سائیڈ کروٹ بدل لی تھی۔

"کیا سفر کی تھکن ہو رہی ہے۔" وہ مسہری کے دوسرے کونے پر آکر اپنی رضائی سیٹ کر رہے تھے۔

"میں سونا چاہتی ہوں۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے بھرائے ہوئے سرد مہر انداز میں کہا تھا۔

انہوں نے ایک لمحے کو مڑ کر اس کے کترائے بے مروت انداز ملاحظہ کیے' پھر یکلخت بے گانہ سے انداز میں رضائی تان کر سو گئے۔

"اوکے اینڈ یو وش۔" دوسرے لمحے وہ لائٹ بجھا کر سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ سامنے والی اکلوتی کھڑکی کے لکڑی کے پٹ سردی سے بچنے کے لیے مضبوطی سے بند کر دیئے گئے تھے۔ روشنی کا کوئی روزن نہیں تھا۔

وہ موصوف تو جانے کب کے سو چکے تھے مگر گل نور کی آنکھوں سے بہتا پانی اسی رفتار سے اس کے تکیہ بھگو رہا تھا۔

اس کا دماغ لامتناہی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سوچیں جو دل چیر دینے والے روح فرسا حقائق پر مشتمل تھیں' دل و دماغ احساس ذلت سے پھٹے جا رہے تھے۔ تذلیل نسائیت کا احساس دل میں چٹکیاں کاٹ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ میں بھانبھڑ جل رہے ہوں۔ دہکتے الاؤ کی تپش سے اس کے جسم و جان پگھلتے محسوس ہو رہے تھے۔ اتنا روئی تھی' اتنا سوچا تھا کہ اب سر پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔

جب سائرہ نے یہ فیصلہ سنایا تو وہ کتنا تڑپی تھی۔ کتنا مچلی تھی۔

"امی خدا کے واسطے میرا تماشہ نہ بنائیں اتنی توہین نہ کریں میری عزت نفس کی کہ مجھے موت آسان لگنے لگے' آپ کا یہ فیصلہ میری روح کی موت کے مترادف ہو گا مجھے میری اپنی نگاہوں سے نہ گرائیے' کیا بیٹیاں اتنا بوجھ ہوتی ہیں والدین کے لئے کہ زبردستی منت و سماجت سے کسی غرور کی انتہا پر کھڑے شخص کو دان کر دی جائیں ابھی وقت اتنا تو نہیں بیتا کہ آپ سرے سے مایوس ہو جائیں۔ امی خدا کے لئے کچھ انتظار کر لیں۔ یہ انتہائی قدم نہ اٹھائیں ورنہ ساری زندگی کے لئے ہم لوگ سر اٹھا کر جینے کا انداز بھول جائیں گے۔ جن لوگوں نے ہماری اتنی تحقیر کی ہم ان کا احسان کیوں لیں پھر ایسا بھی کیا اندھیر ہے۔"

"میں تمہارے جذبات سمجھتی ہوں میری بچی۔" سائرہ کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے بکھرے الجھے بالوں پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

یہ سب تو قسمت کے کھیل ہوتے ہیں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ اور پھر تمہارے معاملے میں تو ایسی دیر بھی نہیں ہوئی۔ مگر میری جان۔ میری چندا! مسئلہ سارا یہ ہے کہ ہماری کوئی ڈھال نہیں رہی ہے۔ ہمارا مضبوط سہارا چھن گیا ہے۔ وہ ہوتا تو میں کبھی اپنے بھائی کی فاتحانہ اور احسان جتاتی نظروں کا بوجھ دل پر نہ لیتی کہ تمہارے باپ نے ساری عمر آن اور انا کے لیے کسی مفاد کی پروا نہیں کی اور اپنی اولاد کو بھی یہی سبق سکھایا ہے مگر میں کیا کروں بچی ہم پر بہت معاشرتی دباؤ ہوتے ہیں۔"

"امی! زندگی ہماری ہے ہم معاشرے کی پروا کیوں کریں۔" اس کے انداز میں سرکشی تھی۔

"کرنی پڑتی ہے میری بچی۔" سائرہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جن لوگوں کے درمیان ہمیں رہنا ہوتا ہے ان کی پروا کرنا لازم ہو جاتا ہے ورنہ گزارا ممکن نہیں ہوتا ہمیں اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہے ان سے بگاڑ رکھیں گے تو خود ہی کا نقصان ہوگا' دنیا سے کٹ کے رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر آج ہم انہیں منہ توڑ جواب دے کر لاپروا ہو جائیں تو وہ ہمارے سامنے کہنے کی بجائے پیٹھ پیچھے فسانے چھیڑا کریں گے ایویں تو نہیں کہتے کہ آدمی کے ایک طرف اور دنیا کے دونوں طرف دندانے ہوتے ہیں۔ فی الحال میری نظر میں کوئی معقول رشتہ نہیں ہے اور تمہارے باپ کی وفات کے بعد اب میں زیادہ دیر تک تمہیں گھر نہیں بٹھا سکتی' اب تو یوں بھی مجھے زندگی کا بھروسہ نہیں رہا۔ تمہارے بعد ماہ نور کا بھی کچھ دیکھنا سوچنا ہے امتیاز میں بذات خود ایسی کوئی خامی یا کجی نہیں' بڑا نیک فطرت شریف اور قابل بچہ ہے' جانے وہ بات کیونکر منہ سے نکال بیٹھا تھا مگر چندا! مصلحتاً بہت ساری باتیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں۔ تم دل سے غبار نکال دو۔ بدگمانی جب تک دل میں موجود رہتی ہے' مثبت سوچ کا داخلہ روکے رکھتی ہے۔ یوں سمجھو ایسی کوئی بات تم نے سنی ہی نہیں۔ میری پریشانیاں اور مسائل سمجھو میری بچی! یقین کرو تمہاری ماں بڑی مجبور ہو کر تمہارے پاس آئی ہے۔"

اور وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی' سسکیاں اس کی شکست کا واضح اظہار تھیں' سائرہ بیگم اپنے آنسو قابو میں نہیں رہے تھے۔

"تم کو کہ میں نے بھی بھائی صاحب کی تلخ باتوں کے بعد بڑی مجبوری کے عالم میں یہ رشتہ قبول کیا ہے مگر ایک بات کا اطمینان ضرور ہے کہ امتیاز کے روپ میں تمہارے لیے بڑے مناسب اور سمجھدار جیون ساتھی کا انتخاب کیا ہے' وہ لڑکا ہر لحاظ سے تمہارے لیے بہت اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ بس تم پچھلی باتوں کا ملال دل سے نکال دو۔"

مگر وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ کہنا بہت آسان تھا اور کرنا نہایت کٹھن

ماں نے تو اپنا فرض پورا کر دیا تھا بیاہ کر مگر ہر مرحلہ ذہنی اذیت کا شکار تو اسے ہی ہونا تھا۔

لڑکیاں یوں بھی ایسے معاملات میں بہت حساس ہوا کرتی ہیں۔ ہر لڑکی کا یہ خواب ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بیاہ کر جائے جہاں اسے دل و جان سے "قبولا" جائے والہانہ پذیرائی اور گرمجوشی نصیب ہو' بڑی چاہ' خواہش اور دل کی تمام تر آمادگی کے ساتھ اس کو والدین سے مانگا جائے۔ بڑے اصرار اور شوق سے اپنے آنگن میں بسایا جائے۔

مگر یہاں تو زور و زبردستی اور مجبوری والا معاملہ تھا۔ بہت شروع میں ہی واضح طور پر جتا دیا گیا تھا کہ گل نور کے مقابلے میں خاندان سے باہر کی لڑکی ان کے لیے قابل قبول ہوگی۔

امتیاز دو ٹوک انداز میں اظہار ناپسندیدگی کر چکے تھے اور خود قدیر ماموں بھی فادی والے معاملے کے بعد بابا جان سے میل جول ترک کر چکے تھے۔

وہ کسی طور پر بھی من چاہی نہیں تھی۔

خاندانی عزت کا حوالہ دے کر قدیر ماموں نے احسان کے طور پر اس کا رشتہ مانگا تھا اور امتیاز نے محض باپ کے اصرار اور خاندانی وقار کے لیے اس کا ساتھ قبول کیا تھا۔

اس کے پس پردہ کوئی دلی جذبہ' کوئی وابستگی نہیں تھی

جاتی تھی اور انہوں نے اپنے انداز سے ثابت بھی کر دیا تھا جب ہی تو اتنے آرام سے کروٹ لے کر سو چکے تھے۔ اپنا کوئی بھی حق استعمال کیے بغیر حتیٰ کہ رونمائی دینا تک گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ کون سا ان کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کی قبولیت کے نتیجے میں ان کے آنگن میں اتری تھی۔

وہ جانتی تھی یہی ہو گا کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کی انا اور خودداری نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اسے عروسی روپ میں محو انتظار دیکھ کر اس پر نظر اندازی کے پتھر برساتے ہوئے اس کی بلبلاتی انا کو مزید پاؤں تلے روندیں اسی لئے ان کے آنے سے پہلے ہی لباس و آرائش سے نجات پانے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے ان سے ایسے ہی رویے کی توقع تھی۔

"یہ میرا خود سے عہد ہے امتیاز ذوالقدر خان جب تک آپ مجھے بحیثیت ایک انسان کے پوری عزت و تکریم اور اعزاز کے ساتھ تسلیم نہیں کریں گے۔ میں آپ کی پیش قدمی کے جواب میں سپردگی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ میں بھی آن کے پیچھے جان دینے والے باپ کی بیٹی ہوں۔"

وہ شب عروسی کے گزرتے ہر لمحے میں خود سے عہد باندھتی رہی تھی یونہی آنکھوں میں رات کٹ رہی تھی۔

مرغے کی بانگ کے ساتھ اس نے یونہی بے خواب وجود لیے بستر چھوڑ دیا تھا۔

--*

زندگی کی ڈگر بدلی تو روٹین بھی بدل گئی تھی۔ شادی کے دس پندرہ دن بعد جب تکلفات کا دور ختم ہوا تو اس نے نہایت خاموشی سے اپنے حصے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں ہرچند کہ زہراں نے بہت خفگی سے منع کیا بھابھی نے پیار سے سمجھایا۔

"چندا! ساری عمر کام ہی کرنا ہے ابھی سے کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو پھر تم عادی بھی نہیں ہو۔ شہروں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں اس کے مقابلے میں یہاں کی زندگی تمہیں بہت مشکل اور محنت مشقت والی لگے گی۔ اب ایسی بھی قیامت نہیں آئی کہ ہم تم پر اتنی مصیبت ڈالیں۔ تم اتنی نازک سی ہو بس آرام سے بیٹھو ایک طرف۔ ہم تمہیں کام کروانے کے لئے تھوڑی لائے ہیں۔"

بھابی پیار سے اس کا نرم چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

"بس تمہارا کام اتنا ہے کہ ہمارے شہزادے ویرے امتیاز کا دل بہلاؤ اس کے دل پر راج کرو۔"

ان کی چھیڑ خانی ایک لمحے کو اسے محجوب کر گئی تھی۔

"جب ساتھ رہنا ہے تو پھر مل جل کر ذمہ داریاں سنبھالیں گے سب۔" وہ ٹالنے کو دوبارہ پرانا موضوع لے بیٹھی تھی۔

"زہراں لاکھ منع کرتیں رہیں۔ مگر اس نے دنوں میں کام سنبھال لیا کھانا بنانے میں بھابی کی مدد کرتی، برتن دھوتی، کپڑے دھونے میں مدد کرتی کمروں کی صفائی ستھرائی کرتی بھی کام کرنا جانتی تھی اور کرنے میں کوئی نخرا بھی نہ تھا، ملنے جلنے والا جو بھی دیکھتا زہراں کی قسمت پر رشک کرتا جسے اتنی مہذب، پڑھی لکھی خوبصورت فرمانبردار اور سادہ مزاج بہو ملی تھی۔"

جو بھی گاؤں سے آتا، اس پر تعریفوں کے ڈونگرے برساتا۔ وہ سر جھکا کر سنتی رہتی مگر کسی احساس نے دل کو نہ چھوا تھا، وہ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ زیادہ تر چپ ہی رہتی تھی۔ خوشی تو اندر سے ابھرنے والے بے ساختہ خوشگوار جذبے کا نام ہوتی ہے اور اس نے باپ کی موت کے بعد دھنک کا کوئی رنگ نہیں دیکھا تھا۔

اب تو اک عرصہ ہی بیت چلا تھا بغیر کسی خوش کن خیال کے۔ اور خواب دیکھنے کی وہ بھی عادی نہیں رہی تھی۔

"تم اتنی خاموش اور گم صم کیوں ہو گئی ہو گل! لڑکیاں تو شادی کے بعد پھول کی طرح کھل جاتی ہیں۔"

"یاسرہ کا سسرال پاس کے گاؤں میں تھا ہفتے میں ایک آدھی بار چکر ضرور لگا لیتی تھی اس بار آئی تو اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور سپاٹ رویے کو دیکھ کر کہے بنا نہ رہ سکی تھی۔

"ہاں اور اس کے ہاں تو کھل بھی چکا بلکہ دوسرا

کھلنے والا ہے۔" شانو بھی آج کل میکے آئی ہوئی تھی، اس نے یاسرہ کے پھیلے ہوئے وجود پر چوٹ کی تو یاسرہ جھینپ کر رہ گئی پھر بولی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس قدر اداس خاموش بلکہ بیزار بیزار سی کیوں رہتی ہو تم۔" یاسرہ نے اس کے احساسات کا درست تجزیہ کیا تھا۔

"تمہارا وہم ہے۔" وہ صاف ٹال گئی مگر یاسرہ مطمئن نہیں ہوئی۔

"وہم نہیں ہے۔" وہ شدومد سے سر ہلا کر بولی "پہلے میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ محمود ماموں کے انتقال کی وجہ سے قدرتی سنجیدگی آگئی ہے تم میں، مگر اب تو تمہاری شادی کو بھی تیسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ کہیں امتیاز بھائی سے کھٹ پٹ تو نہیں ہو گئی۔" یاسرہ کے سنجیدہ تیور دیکھ کر گل نور کو سنبھلنا پڑا مصنوعی خوشدلی سے اس کی چوٹی کھینچ کر بولی۔

"دماغ تو نہیں خراب۔ وہ بچارے تو لاہور بیٹھے ہیں۔ بھلا ان سے کیا ان بن ہو سکتی ہے؟"

"او ہو اب سمجھی کہ اسی دوری کا اضمحلال میں دکھ ہے۔" شانو نے شوخی سے اسے ٹھوکا مارا۔

"ہاں بھئی ہے تو یہ سراسر ظلم نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر وہ ہفتہ ہفتہ بھر غائب رہتے ہیں۔" یاسرہ نے سخت مسکینی خود پہ طاری کر کے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"پھر آکر مداوا بھی تو کر دیتے ہوں گے کڑیو!" بھابی کے معنی خیز فقرے پر وہ فطری حیا سے سرخ پڑ گئی، نندوں نے چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔

"میرا خیال ہے، بھائی کو سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا چاہیے ایسا کب تک چلے گا۔"

یاسرہ اب سنجیدہ تھی گو کہ نجمہ بھابی کے ساتھ بھی یہی سلسلہ چلا آرہا تھا۔ گزشتہ دس سال سے۔ ان کے میاں آرمی میں تھے۔ کبھی چھٹی پر آتے تو بھابی کے بجنے سنورنے کے دن لوٹتے تھے ورنہ وہی طویل انتظار مگر گل نور کی بات دوسری تھی۔ وہ شہری لڑکی تھی پھر امتیاز بھائی ایک اچھی پوسٹ پر تھے لاہور میں گھر کرائے پر لینا افورڈ کر سکتے تھے۔ دوسرے سب گھر والے ذہنی طور پر شادی سے پہلے ہی اپنی طرف سے سوچ چکے تھے کہ امتیاز شادی کے بعد دلہن کو اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔

مگر تین ماہ گزر جانے کے باوجود ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ زہراں نے ایک بار دریافت کیا تو انہوں نے بے نیازی سے بتایا تھا کہ کم از کم آٹھ دس ماہ بعد وہ گھر لینے کی پوزیشن میں ہوں گے فی الحال تو ان کا معمول تھا کہ ہفتے کی شام کو آتے تھے اور اتوار کی شام کو روانہ ہو جاتے تھے۔ کبھی زہراں بہت اصرار کرتیں تو جمعرات کی شام کو دوبارہ واپس لوٹتے تھے۔ زہراں کو یہ قلق تھا کہ ان کی نازک سی شہزادی بہو کو شادی کے ابتدائی رنگین عرصے میں ہی دوریوں کے عذاب سہنے پڑ رہے تھے۔

انہیں کیا خبر یہ عذاب اس کے لئے کتنا سکون تھا وہ گھر سے دور ہوتے تھے تو گل نور کی زخمی انا کو آرام مل جاتا تھا، ان کا سامنا کرنا ان کی موجودگی میں کمرے میں بیٹھنا اس کے لئے اک عذاب سے کم نہیں ہوتا تھا۔

ان کے آپس کے تعلقات میں روز اول کی سی دوری تھی۔ اور اس دوری کو پاٹنے کی امتیاز نے بھول کر بھی کوشش نہیں کی تھی۔ اور یہ بات اس کو مزید تذلیل کا احساس دلا گئی تھی۔ اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو خول میں بند کر لیا تھا۔

شادی کے دو ہفتے بعد ایک دن قدیر صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"گل بیٹی! اپنے آپ کو کبھی بھی کسی لحاظ سے کم تر مت سمجھنا، پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ بڑوں میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچوں سے اس کا بدلہ لیا جائے۔ تم مجھے اپنی بچیوں کی طرح ہی عزیز رہی ہو، تمہارے امی ابو سے جو بھی بات رہی ہو مگر باپ بیٹی کے پیار کا جو رشتہ تھا سو ہے، اس پیار میں تو کمی نہیں آئی اور نہ آئے گی۔ یہ اب تمہارا اپنا گھر ہے اور اس گھر کے سب لوگ بھی تمہارے اپنے ہیں۔ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان سب کو تم بھی دل سے پسند رہی ہو، ہمیں امید ہے تم پچھلی باتوں کو بھلا کر ہم سب کو اپنا سمجھ کر قبول کرو گی۔ بیٹی

ہمارے ساتھ رہو گی۔"

اور اس کے دل سے قدیر ماموں کے خلاف میل جاتا رہا تھا۔

ناراض تو وہ اس محبت بھرے ماحول میں سے کسی سے بھی نہیں تھی۔

ہاں مگر' وہ ایک شخص جو سب سے قریبی تعلق کا دعویدار تھا وہ اس کا بال بال مقروض تھا' زہراں' اور قدیر ماموں کے شفقت بھرے انداز اور بچوں بڑوں کے والہانہ انداز پذیرائی نے اس کو پرسکون اور پراعتماد تو بنا دیا تھا مگر خوشی کا تصور ابھی تک اس کے لئے اجنبی تھا کہ وہ جس رشتے سے بندھا تھا وہاں اس توہین انسانیت اور تذلیل و تحقیر کے سوا کچھ توقع نہ تھی ملنے کی۔

--*

رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا تھا آخری عشرہ چل رہا تھا ان دنوں دادو کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی۔ گل نور زہراں کی رضامندی سے دادو کے ہاں چلی آئی تھی۔ شام کے بعد ادھر ہی آجاتی تھی۔ رات کو دادو کو وضو کے لئے پانی گرم کر کے دیتی۔ وضو کروانے میں مدد دیتی اور ان کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔

اس رات بھی وہ دادو کے پاس ہی تھی۔ زوروں کا مینہ برس رہا تھا۔ اسے کچھ سال قبل کے ایام یاد آگئے جب وہ لوگ عید منانے کے لئے گاؤں آئے تھے۔ ان دنوں بھی ایسی ہی جھڑی لگی تھی۔

وہ دادو کے ساتھ بیتی یادیں دہرا رہی تھی جب پچھلے کمرے کی کھڑکی بجنے لگی۔

اس نے بڑھ کر پٹ کھولے تو بھابی کا کھلکھلاتا چہرہ سامنے تھا۔

"یہاں کیا پکا ہے بھئی' سالن بچا ہو تو دے دو۔ ہمارے ہاں کو بھی پکی ہے اور امتیاز کو پسند نہیں ہے کو بھی۔"

اوہ اس کا مطلب ہے وہ آگئے ہیں۔ اس نے گہری سانس لی۔ کام کی زیادتی کے باعث وہ گزشتہ بیس روز سے گھر نہیں آئے تھے پہلے ہی بتا چکے تھے۔

"اور بنو! تم بھی چلی آؤ کہ تمہارے ساجن آگئے ہیں۔ ان کی نظروں نے آتے ہی تمہیں ڈھونڈا تھا۔ اتنے دن کی جدائی بھی تو بیچ میں آگئی تھی نا۔"

وہ اسے شوخ شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ گل نور کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔ انہیں اتنی ہی چاہت تھی نا۔ ہو آکر اسے ڈھونڈتے۔ شکر کر رہے ہوں گے کہ ناپسندیدہ چہرہ سامنے نہیں ہے۔

"باہر تیز بارش ہو رہی ہے۔ اب صبح ہی آؤں گی۔ اتنی رات بھی ہو چکی ہے۔" اس نے سالن کا ڈونگا کھڑکی کے ذریعے انہیں تھماتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔

"صبح۔۔۔؟" بھابی نے مصنوعی تحیر سے آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔

"بھئی ان کی رات کیسے کٹے گی تم بن کیوں ستاتی ہو انہیں' سیدھی طرح چلی آؤ۔ اب تم سے بھی تو سویا نہیں جائے گا۔"

بھابی کی تجربہ کار باتیں اسے جھینپنے پر مجبور کر گئی تھیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر بیٹے اور بہو کی دیوانی زہراں کے لئے پھر ایسی ہی بات تھی وہ دور دیس سے لوٹے بیٹے اور انتظار میں راتیں کاٹتی بہو کے جذبات مد نظر رکھتے ہوئے پرانا سا چھاتا لیے برستی بارش میں کیچڑ سے بچتی بچاتی آن پہنچی تھیں۔

مجبوراً" گل نور کو ان کے ہمراہ جانا پڑا۔

بوچھاڑ اتنی شدید تھی کہ احتیاط کے باوجود بھی کپڑے بھیگ گئے تھے' وہ عجلت میں بغیر سویٹر جرسی کے لیلن کے سرخ اور سبز پرنٹ کے کپڑوں میں یونہی بستر سے نکل کر زہراں کے ہمراہ چلی آئی تھی۔

زہراں اسے اس کے کمرے کی دہلیز پر چھوڑ کر ہال کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ وہ سردی سے بازو سکیڑتے ہوئے کانپتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا گویا انتظار اور آمد کی علامت تھا غالباً" زہراں انہیں بتا کر اسے لینے گئی تھیں۔

وہ مسہری پر نیم دراز اپنی رضائی لپیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر چونک پڑے۔ اس نے سلام

کی رسم ادا کرنے کے بعد دروازہ بند کیا تھا۔

"تم اتنی شدید بارش میں کیوں چلی آئیں۔ صبح آجاتیں۔"

ان کے سادہ سے جملے میں جانے کون سے نادیدہ انگارے تھے جنہوں نے گل نور کا وجود راکھ بنا ڈالا' جی چاہا زندہ زمین میں دفن ہو جائے۔ وہ گڑ کر رہ گئی تھی۔

"میں خود سے نہیں آئی' ماں نے زور دیا تھا' وہ لینے آئی تھیں مجبوراً" آنا پڑا۔" اس نے احساس توہین سے سرخ ہوتے ہوئے بمشکل تمام اندر بھڑکتے الاؤ کو ٹھنڈا کیا تھا' لہجے کی برف اور رویے کا چبھتا ہوا انداز امتیاز کو چونکانے پر مجبور کر گیا۔

انہوں نے کتاب سے نگاہ اٹھا کر ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر کچھ بے چین سے ہو گئے۔ ہلکے پھلکے کپڑے بھیگ کر جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ خود سے بے نیاز ماتھے پر ہلکی ہلکی تیوریاں لیے مسہری سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ بیڈ کے سرہانے اور مقابل میں لگی ٹیوب لائٹوں کی روشنی براہ راست اس کے وجود پر پڑ رہی تھی۔ اس کا اک اک نقش اور خدوخال اجاگر کر رہی تھی۔

وہ کوشش کے باوجود نگاہ نہ بچا پائے تھے ششدر سے اسے دیکھتے رہ گئے ان کی آنکھوں میں اترتی مردانگی کی چمک گل نور کو یک بیک خطرے کا احساس دلا گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ حواس ساتھ چھوڑتے محسوس ہونے لگے تھے۔ یوں لگا جیسے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

بوکھلا کر خود پر نگاہ ڈالی اور پھر جیسے پانی پانی ہو گئی۔ ان استحقاقانہ نظروں کی سرکشی اور گستاخی کا مفہوم سمجھ میں آگیا تھا۔

"اف خدایا۔" شرم سے مرنے والی کیفیت ہو گئی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے الماری سے دوسرے کپڑے نکال کر وہ باتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد برآمد ہوئی تو وہ ہنوز کتاب میں مگن پائے گئے تھے۔

وہ جھجکتی ہوئی مسہری کی جانب بڑھی اسی لمحے اچانک بجلی چلی گئی۔

اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا' انجان سے اندیشے اسے ستانے لگے تھے۔ اندازے سے ٹٹولتی ہوئی اپنی جگہ پہنچی' اپنی رضائی درست کر کے جو نہی لیٹی۔ سر حرارت مضبوط بازو سے جا لگا۔ وہ اندھیرے میں اپنی جگہ کا تعین نہیں کر پائی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی پھیل گئی۔ تیزی سے اٹھنا چاہا مگر اسی لمحے دوسرا توانا گرم بازو اس کے وجود پر دراز ہو گیا۔ گویا اس کی حرکت سے روکنا چاہا ہو۔

"اٹ از او کے۔ ٹیک اٹ ایزی۔" ان کے گمبھیر لہجے میں بلا کی نرمی اور خمار تھا۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ جسم و جان میں عجیب پھریری سی دوڑنے لگی تھی۔ اسے لگا زیادہ دیر تک یہی صورتحال رہی تو اس کی سانسیں جسم کا ساتھ چھوڑ جائیں گی اور دھڑکنیں رک جائیں گی۔

"پلیز ہاتھ ہٹا لیں۔" بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے مزاحمت کرتے ہوئے ان کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا تو انہوں نے چنداں اعتراض نہیں کیا۔ فوراً" بازو سمیٹ کر دوسری طرف ہو گئے تھے۔ وہ اپنی رضائی میں دبک کر بے آواز سسکنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا دل جیسے پھٹ جائے گا۔ اس کی بلکتی انا اسے خوشی کا کوئی لمحہ انجوائے نہیں کرنے دیتی تھی۔ اور پھر یہ اعتماد ہو بھی تو اس کا کوئی وجود تو ہو کہ بڑھتے ہوئے ان ہاتھوں میں محبت چاہت اور دلی خواہش ہمک رہی ہے۔

وہ اسے اس کی رضا سے مانگیں یا پھر اپنی محبت کا یقین دلا دیں کہ وہ ان کی گستاخیوں کو پیار کی ادا سمجھ کر سہہ لے دے ڈالے یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا محض لمحاتی قربت تھا اور بس۔

وہ ساری رات نہیں سو پائی تھی۔

اس بات سے بے خبر کہ اس سے کچھ فاصلے پر لحاف میں لیٹے ہوئے وجود نے بھی اس کی طرح رات آنکھوں میں بسر کی تھی۔

وہ اس کے انداز دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ اس کی گانگی' بے نیازی' گریز اور واضح رد بھی کچھ نظروں کے سامنے تھا' اور وہ سب کچھ سمجھ

شاید وہ دل سے رضامند نہیں تھی۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ شادی کی تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی پسند رہا ہو اتنے لوگوں سے روزانہ ملنا ملانا ہوتا تھا۔ اگر وہ دل سے رضامندی دیتی تو اولین شب اس طرح اپنا روپ سنگھار نہ اجاڑتی۔ ان کا انتظار کرتی۔ اس کے بے گانہ اور گریزپا انداز دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہٹ گئے کہ زبردستی کے تو کسی صورت قائل نہیں تھے۔

*_*_*

اگلی صبح ہمیشہ سے زیادہ اداس تھی کم از کم گل نور کے لیے۔

ہر آنے والا دن بے چینی اضطراب اور ذہنی اذیت لے کر نمودار ہوتا تھا۔ کتنا عرصہ بیت گیا تھا اسے دلہن بنے ہوئے۔ کسی چیز میں کوئی دلچسپی، کشش یا تازگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی اتنی افسردہ کیوں ہو رہی ہو۔"

زہراں بہو کے اکھڑے اکھڑے انداز بڑے دنوں سے دیکھ رہی تھیں۔ مگر یہ سوچ کے چپ سادھ لیتیں کہ خاوند کی جدائی کے باعث جی اچاٹ ہو گیا ہو گا مگر اب تو امتیاز دو تین دن سے گھر پر تھے۔ عید کی چھٹیاں لے کر آئے تھے وہ پھر بھی اتنی ہی آدم بیزار، اکتائی جھنجلائی پھر رہی تھی۔ یوں جیسے خوشی کا منہ دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔

"بس امی! یونہی دل اداس ہو رہا ہے۔" وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پا کر آہستگی سے بولی تھی۔

زہراں اون سلائیاں چھوڑ کر تشویش سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"میں صدقے میری بچی بھرا پرا گھر ہے۔ تمہارا گھر والا تمہارے پاس ہے پھر دل کیوں اداس ہو رہا ہے کیا امتیاز نے کچھ کہہ دیا ہے۔" وہ بہت پریشان ہو گئی تھیں۔

"انہوں نے کیا کہنا سننا۔" وہ حلق تک بیزار نظر آتی تھی۔ جی جلانا اتنا مائدہ تھا کہ "مروتاً" بھی اپنی پژمردگی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کب تک خود پہ بشاشی کی نقابیں ڈالے رہے بندہ،

"خدانخواستہ۔" اس کے لب و لہجہ انداز ان کے اوسان خطا کرنے لگے۔

"مجھے بتاؤ میری جان، تم اکیلی نہیں ماں کی جگہ ہوں میں، پھوپھو کا رشتہ بھی ہے اور ماں کا بھی مگر ان سے بھی پہلے تم میری بیٹی ہو۔"

وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں اور اس کا سر سہلانے لگیں۔

"اس نے تمہیں کچھ کہا ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس سے پہلے تمہاری ماں ہوں۔ دیکھنا ابھی اس کے مزاج درست کر کے رکھ دوں گی مجھے تو پہلے بھی کافی عرصے سے الٹے سیدھے وہم آ رہے تھے۔ دیکھ دیکھ کے حیران ہوتی تھی کہ یا الٰہی یہ انوکھے میاں بیوی ہیں نہ تمہارے مان اور ناز و انداز نظر آتے تھے نہ امتیاز کی بے قراریاں اور دل کی خوشی۔ بولو بتاؤ مجھے کیا بات ہے میری بچی اور اگر امتیاز کا قصور ہوا تو بے فکر رہو جب تک تم سے معافی نہیں مانگے گا اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔"

جانے کیا ہوا۔ کب کا رکا ہوا طوفان آن کی آن میں پھٹ پڑا، آنسوؤں سسکیوں ہچکیوں کسی پہ اختیار نہ رہا، وہ شدتوں سے ان کی آغوش میں بکھر کر بلک بلک پڑی۔

زہراں کے جیسے کلیجے میں ہاتھ پڑا تھا۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے سنبھالتے ہوئے ان کی بوڑھی بانہوں میں تھرتھری دوڑنے لگی تھی۔

"میری بچی! میری جان، جاؤ نجمہ اس ناخلف کو ابھی اور اسی وقت میرے سامنے بلاؤ۔" انہوں نے غم و غصے کی شدت سے لرزتے ہوئے دم بخود بیٹھی نجمہ بھابی کو انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ وہ لوگ بیٹھک میں تھے بھابی جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئیں کہ کوئی ادھر نہ آن نکلے۔

"کیا ہوا امی! آپ نے بلایا تھا۔"

امتیاز اپنی دھن میں لاپروائی سے اندر آئے تھے مگر اندر کا سین دیکھ کر ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ گنگ، روتی بلکتی گل نور اور اسے سنبھالتی غضب ناکی کی حدود چھوتی ہوئی ماں کو دیکھ رہے تھے۔

"اچھا، شاباش ہے میرے بچے بڑا نام روشن کیا ہے ماں باپ کا۔ بڑا کارنامہ کیا ہے تم نے، میں نے بلایا ہے تمہیں ہار سنانے کے لیے۔"

"امی! بات کیا ہوئی ہے۔" وہ ماں کے اس درجہ اکھڑے ہوئے بلکہ بگڑے ہوئے تیوروں پر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ تشویش سے کبھی اسے اور کبھی ماں کے برہم چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

"تم مجھ سے پوچھ رہے ہو تم؟" وہ ان پر الٹ پڑیں۔ "کیسا دیدہ دلیری ہے۔ کن حالوں میں پہنچا دیا ہے میری بچی کو۔ بتاؤ بھلا قیامت کے روز میرے بھائی نے پوچھا تو کیا جواب دوں گی کہ ان کی لاڈلی شہزادی رانی بیٹی کو کتنا سکھ دیا۔"

وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر پھپھک کر رو دیں۔ الجھن، پریشانی اور اضطراب ایک ساتھ امتیاز پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ایسی کیا بات ہو گئی۔ سسکیاں دباتی نڈھال سی گل نور پہ نگاہ ڈالتے ہوئے وہ الگ امتحان میں پڑے ہوئے تھے اور اب ماں کا رونا اس کے اعصاب ماؤف ہونے لگے تھے۔

"بتاؤ میری بچی! تمہارا مجرم سامنے ہے بالکل بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، کھل کر بتاؤ کیسا سلوک کرتا ہے یہ تمہارے ساتھ، کیا شکایت ہے تمہیں اس سے۔"

گل نور جو شدت جذبات میں دنیا و مافیہا کو بھلا کر جی ہلکا کرنے کو گھٹا کی طرح برس پڑی تھی۔ اب ہوش میں آتے ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی معاملہ اتنا سیریس ہو جائے گا کمرے میں صرف وہ زہراں امتیاز اور بھابھی تھے۔ اندر سے دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی اور تشویش تھی۔ اس کا جی چاہا، خود کو کہیں دفن کر لے۔ جس راز کو وہ اتنے عرصے سے کامیابی سے چھپاتی آ رہی تھی آج اپنی اندرونی کمزوری کے سبب سرعام فاش ہو گیا تھا۔

"مجھے ان سے کچھ شکایت نہیں مامی ان سے پوچھ لیجئے البتہ۔" وہ گھبرا کر انگلیاں مروڑتے ہوئے کہہ گئی، سر جھکا ہوا تھا اور دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

"تم بتاؤ امتیاز۔" زہراں کڑے تیور لیے بیٹے کی طرف مڑی تھیں۔

"مجھ سے کیا پوچھتی ہیں امی! اسی سے پوچھیے جس نے آپ سے کہا ہے۔ میں تو بالکل بے خبر ہوں۔" وہ ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈال کر قدرے ناراض سے انداز میں وہ گویا ہوئے۔

"اس کا مطلب ہے۔ کوئی بات ہے اور تم دونوں مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔"

زہراں کے حتمی لہجے پر دونوں پریشانی سے انہیں دیکھنے لگے۔ ان کے انداز میں ناراضگی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں امی! آپ پریشان نہ ہوں۔" امتیاز لجاجت سے بولے۔

"مجھے پاگل سمجھا ہے ناں، دونوں مجھ سے چھپا رہے ہو، ٹھیک ہے میں کیا لگتی ہوں تمہاری۔ مجھ سے کوئی بات نہ کرے۔ تم دونوں جا سکتے ہو۔"

وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر کے پلنگ پر لیٹ گئیں اور سر پر کھیس تان لیا۔ بھابی نے ساکت بیٹھے امتیاز اور گل نور کو اشارے سے باہر جانے کو کہا، وہ ساس کی مزاج آشنا تھیں، جانتی تھیں وہ اب کچھ نہیں سنیں گی۔" وہ متذبذب سے باہر چلے گئے۔

شام تک بات سنگین دوراہے پر جا پہنچی تھی۔ ماموں کو بھی پتا چل چکا تھا اور کچھ نہ کچھ کن سن کو بھی لگ گئی تھی۔ اندر کی بات تو پتا نہیں چلی البتہ یہ خبر کنفرم ہو چکی تھی کہ زہراں، امتیاز اور گل سے مشترکہ طور پر خفا ہیں۔

سب دونوں کو طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے۔ امتیاز تو کمرہ بند ہو گئے تھے، البتہ گل نور کمرے میں سب کے درمیان غائب دماغی کے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"مجھے تو خود بارہا محسوس ہوا تھا حتیٰ کہ شادی کے شروع شروع میں بھی مجھے لگا تھا کہ تم دونوں کے درمیان تعلق کی کوئی ڈور نہیں بندھی پھر سوچا پڑھے لکھے ہیں۔ شہری ماحول میں رہے ہیں شاید وہاں اسی طرح ہوتا ہو، شہریوں کی خوشی کی میں فرق بھی تو نہیں ہوتا ہے۔"

بھابی اسے الگ بیٹھے دیکھ کر چپکے چپکے

نصیب۔

"یوں پریشان ہونے سے کیا حاصل کل اکیسواں روزہ ہے۔ دستور کے مطابق پاسرو اور شانو بچوں سمیت اپنی سسرال سے ادھر چلی آئیں گی عید منانے کے لئے پھر اور بھی ملنے ملانے والے آجائیں گے۔ تم لوگوں کو وقت نہیں ملے گا' میری مانو تو افطاری کے بعد بیٹھک میں جا کر دونوں ماسی جی کو منالو' یہ وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ ناراضگی میں وہ رات کا کھانا بھی نہیں کھائیں گی۔ مجھے ان کی طبیعت کا اندازہ ہے۔"

بھابی کام کا مشورہ دے رہی تھیں۔ جا کر دیور کو بھی سمجھایا وہ فطری طور پر بڑی صلح جو' مہربان اور ٹھنڈے مزاج کی تھیں۔ انہی کی کوششوں اور خوشامدوں سے زہراں' امتیاز اور گل نور کی بات سننے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ امتیاز جیسے کچھ ٹھان کے آئے تھے۔

"امی سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ محترمہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ رشتہ ان کی پسند سے طے نہیں ہوا تھا' سو انہوں نے کسی قسم کی خیر سگالی کا ظاہرہ نہیں کیا۔ آج سے نہیں پہلے دن سے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔"

امتیاز کو اچھا تو نہیں لگ رہا تھا اس طرح کی باتیں ماں سے کرنا مگر اب افشائے راز کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ بہت مجبور ہو کے سر جھکا کر بالآخر انہوں نے ہمت سے کہہ ڈالا۔

زہراں یہ سن کر اس طرح بدکی کہ دونوں کو دیکھنے لگیں جیسے یقین نہ آرہا ہو' ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا' گویا تین ماہ سے وہ دونوں سب کی نظروں میں دھول جھونک رہے تھے۔

"جی چاہ رہا ہے۔ ساری عمر تم دونوں کی صورتیں نہ دیکھوں۔" وہ صدمے کی انتہائی کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ "تم لوگ تین ماہ سے ہمیں بے وقوف بناتے رہے ہو۔ جانتے ہو کتنا بڑا گناہ کر رہے ہو؟ اس حکم کی روگردانی کر کے تم دراصل اس مقدس بندھن کی توہین کرتے رہے ہو۔ شادی بیاہ مذاق نہیں ہوتا۔ خدائی فریضہ ہوتا ہے۔ خدا اور اس کے رسول کا حکم ہے' شرع کا ایک بہت اہم پہلو ہے اس کے متعلق کتنے جامع احکامات اترے ہیں قرآن پاک میں کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی کلام الٰہی کھول کر نہیں پڑھا؟ تم لوگوں کو خوف خدا نہیں آیا۔ اتنے پڑھے لکھے ہو گیا۔ تمہارے نصابوں میں نہیں بھی خانگی زندگی کے حقوق و فرائض کا سبق درج نہیں ہے۔؟"

وہ کھری کھری سناتے ہوئے انتہائی برہمی سے دونوں کو گھور رہی تھیں۔

"مامی! یہ اول درجے کے دروغ گو ہیں۔ سارا الزام مجھ پر ڈال دیا' ذرا ان سے پوچھیں ناں خود میرے لیے انہوں نے کیا کیا ہے۔؟" خود پر بات آتے دیکھ کر گل نور کا خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے بلا کم و کاست سارا افسانہ کہہ ڈالا۔

"میں تو ان کے لئے ان چاہی چیز رہی ہوں جسے بحالت مجبوری قبول کیا گیا' ورنہ ان کا ارادہ تو باہر سے بیوی لانے کا تھا۔ آپ لوگوں کے دباؤ میں آکر مجھ سے ناتا جوڑا' گھر میں لا کر خبر تک نہ لی' میرا ہونا نہ ہونا ان کے لئے ایک برابر ہے گویا۔" اس کا "جواب شکوہ" سن کر امتیاز کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔

"امی! یہ محترمہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔ میں نے کبھی بھی اسے رد نہیں کیا بلکہ ہر بار خود سے بلا تا رہا ہوں' مگر جب اگلا بندہ ہی رسپانس نہ دے' بے نیازی برتے' مزاحمت سے کام لے تو پھر' انا اور خودداری تو سب میں ہی ہوتی ہے۔"

"ادھر آؤ گل بیٹی۔" زہراں نے کچھ سوچ کر بڑی سے اسے پاس بلایا' انہیں کچھ کچھ سمجھ آتی جارہی تھی بات کی۔

"تم سے کس نے کہا کہ تم ان چاہی ہو۔" انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مشفق لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں تو ہم بڑے ارمانوں سے بڑی چاہت سے بیاہ کر لائے ہیں میری بچی! شروع سے ہی ہم نے تمہیں اس آنگن میں لانے کے خواب دیکھے تھے صرف میں نے ہی نہیں خود امتیاز کے دل کی بھی یہی تمنا تھی۔ تمہیں شاید خبر نہ ہو مگر میں نے امتیاز کی

خواہش پہچان کر بہت پہلے سے یہ بات تمہاری ماں کے کان میں ڈال دی تھی۔ کوئی "باہر" کی لڑکی بھلا تمہاری جگہ لے سکتی تھی۔

یاں فادی اور یاسر والے معاملے میں شاید ایک بار جذباتی ہو کر امتیاز کچھ کہہ بیٹھا مگر وہ صرف وقتی غصہ تھا تمہارے قدیر ماموں راولپنڈی سے آئے تو بہت غمزدہ اور مضمحل تھے۔ آکر جانے کس انداز میں بیٹوں کو بات بتائی کہ امتیاز غصے میں آکر باہر سے لڑکی لانے والی بات کر گیا۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ بندہ غصے میں نہ جانے کیا کچھ بک جاتا ہے۔ بعد میں بھول بھال جاتا ہے۔ اس وقت کچھ پتا نہیں چلتا کیا منہ سے نکل رہا ہے اسی لیے تو کہتے ہیں کہ غصہ حرام ہے۔"

زہراں سچ سچ ساری بات واضح کر رہی تھیں۔ امتیاز بہت غور سے گل نور کے چہرے کے تاثرات پڑھ رہے تھے۔ ان پر بھی اس کے گریز اور پہلو تہی کا راز کھل گیا تھا۔

"کمال ہے امی! میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اس قدر پرانی اور چھوٹی سی بات کو دل پر لے گی۔" ان کے لہجے میں ہمواری اور سکون غالب تھا۔

"مجھے تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں آرہا کہ ایسا کچھ کب کہا تھا ہو سکتا ہے جذباتیت میں منہ سے نکل گیا ہو۔ مگر میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اتنے سال محمود ماموں اور ابا جی کی صلح کا انتظار کیوں کرتا۔ نوکری ملنے کے بعد "باہر" والی محترمہ بیاہ لاتا، خوامخواہ تین سال تک سولی پر نہ لٹکا رہتا۔" ان کے شگفتہ لب و لہجے نے گل نور کو خود میں ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اتنے عرصے کی دل میں چبھی پھانس نکل گئی تھی۔

وہ اپنی انا و خودداری بچا لائی تھی۔ اس کی عزت نفس محفوظ تھی۔ وہ من چاہی ہونے کا یقین حاصل کر چکی تھی۔ یہ سند پا چکی تھی کہ بڑی خواہش و مناجات کا نتیجہ ہے یہ بندھن۔

"الٹا اس نے میرے ساتھ بے رخی برتی۔ میرے وجود کی نفی کی۔ سرد مہری اور بیزاری کا اظہار کرتی رہی آپ اس کی خبر لیجیے ناں۔" وہ ایک ایک کر کے اس کی شکایتیں گنوا رہے تھے۔

"میرا لاہور سے آنا اس کے لیے عذاب ... نہیں ہوتا، میری آمد سخت ناگوار گزرتی ہے۔"

وہ لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے پوری فہرست سنا رہے تھے اس کے ناروا سلوک کی۔

"یہ غلط ہے امی۔" اس نے کمزور سا احتجاج ... کیا۔ چاہنے کے باوجود وہ ان کی طرف دیکھ نہیں ... تھی۔ البتہ ان کی نگاہوں کی تپش بڑی اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

"غلط ہے تو میری آمد پر چھپی کیوں پھرتی تھیں ... سے کتراتی کیوں تھیں۔ کمرے سے کیوں بھاگ ... تھیں۔" وہ ڈپٹ کر پوچھ رہے تھے۔

"بس اب ان سارے جھگڑوں کا حل یہ ہے کہ ... لاہور میں مکان کرائے پر لو پھر جلد از جلد ... ساتھ لے جاؤ۔"

زہراں نے حکم سنا دیا تھا۔

"شکر ہے معاملہ نپٹا۔ اب جاؤ گل! میرے ... کھانا لا دو اور امتیاز تم کمرے میں چلو، میں تھوڑی ... بعد گل کو تمہارے پاس بھیجتی ہوں۔"

اور گل نور کے حواس کوچ کرنے لگے۔ ... ہمت نہیں پڑ رہی تھی ان کا سامنا کرنے کی ... بے رخی کے ڈر سے۔

اور اب ان کے بہکے بہکے دیوانہ پن کے خوف سے وہ زہراں کو کھانا دے کر فارغ ہوئی تھی کہ ... مچ گیا۔

"مبارک ہو گل بھابی! سائرہ مامی، فادی اور ... آگئے ہیں پنڈی سے۔"

طیب پھولے پھولے سانسوں سے بھاگتا ہوا بتانے آیا تھا۔

"کیا..." وہ خوشیوں کی دھنک میں نہا گئی۔ ... گلاس ہاتھ سے پھسل گیا۔ دیوانہ وار باہر بھاگی کتنی مدت بعد اپنوں کی شکل دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

ساری رات ماں، بہن اور بھائی کے ساتھ باتیں کرتے گزار دی، جوش و خروش کی انتہا پر ... آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے ...

سے بستر چھوڑ کر ہال کمرے میں آگئے تھے۔ امتیاز بھی فادی کے ساتھ مصروف ہو گئے تھے۔

۔۔*

افطاری کے بعد سب چاند دیکھنے کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے۔ جنوری کے اواخر میں عید منانے کا انوکھا ہی تجربہ تھا۔ لڑکیوں نے تو زیادہ تر ویلوٹ اور سنگھائی کے سوٹ سلوائے تھے عید کے لئے۔

"چاند نظر آگیا۔ مبارک ہو مبارک ہو۔"

فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

ہال کمرے میں میلے کا سا سماں تھا۔ یاسرہ ثنا نو اور بھابی کے بچوں نے عجب شور شرابا برپا کر رکھا تھا۔ گل نور سب کے درمیان بیٹھی ہنسی خوشی سب کے مہندی لگا رہی تھی 'بزرگ پارٹی بیٹھک میں محفل جمائے ہوئے تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ کا ٹائم تھا مگر کسی کو احساس نہیں نیند کا احساس نہیں تھا۔

"یہ کیا میلہ لگا رکھا ہے۔ بھئی سونے کا وقت برباد کر رہے ہو۔"

معاً" امتیاز برہم موڈ لیے اندر داخل ہوئے تھے۔ اس کی مصروفیت کو نہایت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کل سے ہاتھ نہیں آئی تھی وہ۔

"واقعی بہت رات ہو گئی ہے۔" بھابی نے دیور کے تیور پہچان کر فوراً "سب سوا" اٹھا دیا۔

"گل! تم جاؤ کل رات بھی پوری جاگ کر گزاری تھی۔ صبح عید ہے اتنا ملنا ملانا 'پہلی پہلی عید ہے تمہاری 'تھکن بڑھ جائے گی جا کر کچھ آرام کر لو۔"

بھابی نے بظاہر سادگی سے کہا تھا مگر ان کی نگاہ کی شوخ معنی خیزی گل نور کو شرم سے شل کر گئی تھی۔

امتیاز واپس پلٹ چکے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے مگر یہ مرحلہ طے تو بہر حال کرنا ہی تھا۔

"مل گئی آپ کو فرصت۔" کہنی کے بل نیم دراز رسالہ کھنگالتے ہوئے محور انتظار امتیاز نے اسے اندر آتے دیکھ کر شکایتاً" کہا تھا۔

"جی وہ آپ کو پتا ہے ناں۔ کل عید ہے چاند نظر آگیا ہے بس وہ اسی کی مصروفیت تھی۔"

وہ اپنی بوکھلاہٹ چھپانے کو خواہ مخواہ بولنے لگی۔ نگاہ جھکی ہوئی تھی اور وہ ان کی سرکش ارادوں کا پتا دیتی نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی کہ

"مگر میرا چاند اور میری عید تو تم ہو..... تمہیں بھی پتا ہے ناں..." انہوں نے شوخی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور سر جھک گیا۔ ان کی جسارتوں پر بند باندھنا اس کے لیے اب ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ دن میں کسی وقت کمرے میں آئی تو بستر کے ایک سائیڈ پر ایک بڑا سا پیکٹ پڑا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ نزدیک جا کر جائزہ لیا۔ خوب صورت گفٹ پیک کے اندر جدید طرز کا سبز مخمل کا سوٹ تھا۔ ساتھ میں سبز کانچ کی چوڑیاں اور ایک عید کارڈ بھی موجود تھا۔ اس نے کھول کر پڑھا۔ اس کے نام تھا اور فقط ایک شعر جگمگا رہا تھا۔

"میری آرزوؤں کی تمہید تم ہو
میرا چاند تم ہو ' میری عید تم ہو"

اس قدر خوب صورت اظہار محبت نے اسے نازاں کر ڈالا تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اب مزید کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ "میری عید تم ہو" کتنا جامع اعتراف تھا۔ وہ اسی حوالے سے اسے چھیڑ رہے تھے۔

"ارے تم نے خود تو مہندی لگائی ہی نہیں....." وہ اس کی صاف شفاف گلابی ہتھیلیاں دیکھ کر حیرت سے بولے۔

"آپ نے موقع کہاں دیا....." اس نے ہنس کر ان کی جلد بازی پر چوٹ کی۔

"اوہو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ اچھا ایسا کرو' جا کر مہندی کا ساز و سامان لے آؤ میں خود تمہاری مہندی لگاؤں گا۔ اپنے نام کی۔" ان کا اشتیاق دیدنی تھا۔

"رہنے دیں۔ صبح صبح اٹھ کر لگا لوں گی۔ آدھے

گھنٹے میں رنگ چڑھ جائے گا۔" وہ مسکرا دی۔

"بھئی میں تمہارے نہیں اپنے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ذو معنی انداز میں مسکرائے۔

پہلے تو وہ خاک بھی نہیں سمجھی اور جونہی ان کی نگاہ اور ہونٹوں پر مچلتے شرارتی تبسم کے معانی سمجھ میں آئے 'حیا سے دوہری ہونے لگی۔ اف کس قدر بے باک ہوئے جا رہے تھے اس نے تو انہیں ہمیشہ سے بڑی سنجیدہ 'بردبار اور لیے دیئے رہنے والے انداز میں دیکھا تھا۔

"جانتی ہو میں نے اتنا عرصہ پہلے اظہار کیوں نہیں کیا۔؟"

وہ اس کی لانبی انگلیوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کی انگلیوں میں پھنسائے ہوئے اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

وہ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"گھر میں میرے علاوہ جوان بہنیں اور لڑکے بھی تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی لحاظ سے ان کے دلوں میں کوئی ایسی ویسی بات بیٹھ جائے۔ یہاں کا ماحول قدرے مختلف ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکی زیادہ جلدی جذباتی منازل طے کر کے جوانی کی حدود تک پہنچتے ہیں۔ کم عمری میں ہی ذہنی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے سے بڑوں میں اس قسم کا "کھلا پن" محسوس کر لیں تو اسے جائز سمجھتے ہوئے نادانی میں جذباتیت کے ہاتھوں کوئی نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ اسی لیے میں ہمیشہ محتاط رہا۔ جب بھی تم یہاں آئیں میں نے پوری کوشش کی کہ تمہارے ساتھ معمول کے نارمل انداز میں پیش آؤں جسے کوئی محسوس نہ کر سکے۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود امی 'یاسرہ اور بھابھی لوگ میرے دل کا راز پا گئے اور جس پر کھلنا چاہیے تھا' وہ محترمہ کل تک انجان رہی ہیں۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ مجھے اپنے اور تمہارے ماحول کے فرق کا اندازہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد برسرروزگار ہو کر تمہارے رہن سہن کے مطابق شہر میں سیٹ ہو کے امی لوگوں کو محمود ماموں کے ہاں بھیجوں تاکہ انکار کا کوئی جواز نہ رہے۔ مگر افسوس فادی والے معاملے کی وجہ سے وقتی طور پر دونوں گھرانوں کے درمیان تلخی ہو گئی۔ پھر محمود ماموں کی ناگہانی موت کے بعد معاملہ مختلف ہو گیا۔ جب تم نے شادی کی اولین رات میری اہمیت و مقام کی نفی کر کے گریز کی راہ اپنائی تو میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ تمہاری رضا کے خلاف ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ تمہیں زبردستی نتھی کر دیا گیا ہے۔ شاید تمہارا انتخاب کوئی اور رہا ہو۔ یہ خبر ہی نہیں تھی کہ.....

اچھا چلو چھوڑو ان پرانے قصوں کو' سنو ایسا کرو وہی عروسی جوڑا پہنو' زیور اور میک اپ سے آراستہ کرو خود کو تاکہ مجھے یقین آ جائے کہ تمہارا ساتھ خواب نہیں حقیقت ہے۔ تصور میں تو بارہا تمہیں اپنی دلہن بنے سیج پہ بیٹھے دیکھ چکا ہوں۔"

"منہ دھو رکھیں۔" وہ جو سرشاری کے عالم میں ان کے اقرار و اعترافات سن رہی تھی۔ ان کی فرمائش پر شرما کر ان سے ہاتھ چھڑا کر اپنے بستر میں گھس گئی اور رضائی ٹھیک کرنے لگی۔

"کل عید پہ پہن لوں گی وعدہ ابھی مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" وہ ان کی بولتی نظروں سے بچنے کے لیے نیند کا سہارا لے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر آگرائی رضائی سیٹ کرنے لگے۔ پھر اس کی جانب دیکھا۔

"اس رقیب کو تو ہٹاؤ یہاں سے۔" دوسرے ہی لمحے وہ اس کی رضائی ہاتھوں میں سمیٹ کر سامنے کرسی پر پھینک چکے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شازیہ چوہدری

زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ ہم گھنا سایا
آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا

گمشدے کے خواب ناک ماحول میں دھیمے سروں میں ریکارڈ بج رہا تھا۔ ہر بول لگتا تھا، دل کے تاروں سے چھو کر گزر رہا ہو۔

اس کے دل میں اک ٹیس سی اٹھی۔ جہازی سائز کے مربع بیڈ کا مخملیں لمس اسے سلگانے لگا تھا۔

وہ لوٹوں سمیت پشت کے بل دراز سوچوں میں گم تھا۔ تخیل کے آسمان پر کتنے ہی چہرے آ آ کر گزرتے جا رہے تھے، پھر ایک چہرہ جیسے اپنی جگہ ثبت ہو کر رہ گیا۔

اس کے اندر بے قراری کی لہر نے یوں جوش مارا جیسے سوتی کے دریا میں طغیانی سی آگئی ہو۔

وہ بے طرح مچل کر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ کر کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگا۔ بے قراری سی بے قراری تھی۔

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا، ہم نے کیا پایا

اس کے اندر پھر بے قراری سر اٹھانے لگی۔

"یا اللہ۔ کیا کروں!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ایزی چیئر پر ڈھے گیا۔ پھر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

"ایک وقت آئے گا ساری دنیا تمہارے پاس ہوگی، یہ دولت، یہ شہرت، یہ نام و نمود جس کے لیے آج تم اخلاق و کردار کا ہر بند توڑتے چلے جا رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو، ایک دن تمہیں ضرور حاصل ہو جائے گی، مگر اس وقت تک تم سر سے پیر تک "دیکھو مجھے تو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" کی مثال بن چکے ہو گے۔"

"یہ آواز۔ یہ آواز۔ اُف یہ لہجہ مجھے ڈس لے گا۔"

وہ تڑپ کر مچل کر اِدھر اُدھر پہلو بدلنے لگا۔

"یہ آوازیں۔ یہ لہجے۔ یہ تیور۔ یہ مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔"

ہم جسے گنگنا نہیں سکتے
وقت نے ایسا گیت کیوں گایا

"یہ باتیں آج تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ ان کے معانی و مفہوم اس وقت تم پر کھلیں گے جب تمہارے پلٹنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔"

کوئی سر سراتا لہجہ اس کے خیالوں کی دنیا تہہ و بالا کرنے لگا تھا۔

"خود سے جتنا دور بھاگنا چاہتے ہو، بھاگ لو۔ جواد احمد تاکہ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہے مگر یاد رکھو۔ ضمیر کی پکڑ سے تم کبھی نہیں بچ سکو گے، اور جب اس کی گرفت میں آ گئے، پھر فرار کے لیے کوئی جائے مفر نہیں بچے گی۔ تم پناہ مانگو اس وقت سے جواد احمد جب تمہارا یہ خوبصورت وجود تمہاری روح کی طرح گل سڑ جائے گا۔ جب تمہاری صورت کی اسیر حسینائیں اور تمہاری شہرت کے پجاری نام نہاد دوست ایک ایک کر کے تمہیں اکیلا چھوڑ جائیں گے۔ سوچو ذرا! اس وقت کو جواد احمد جب سب کچھ حاصل ہوتے ہوئے بھی تم ترس ترس کر، سسک سسک کر زندگی بسر کرو گے، سکون اور سکھ کی ایک ایک بوند کو ترسو گے۔"

"آہ! تم نے کتنا سچ کہا تھا۔ نائلہ! کتنا سچ۔ دیکھو آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ وہ سب کچھ جس کے لیے میں نے ہر حد عبور کر لی۔ تمہاری دکھائی گئی ہر روشنی کی کرن کا منبع ختم کر دیا۔ تمہاری ہر صدا پر کان بند کر لیے۔ آج واقعی دیکھو تو۔ میں سونے چاندی کی دیواروں اور ہیرے موتیوں سے سجے در و دیوار کے اندر کتنا کم قیمت اور بے مایہ لگ رہا ہوں۔"

وہ اپنے خالی ہاتھوں کی سمت جامد نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اسی لمحے موبائل فون کی بیل دھیمے سے کمرے کا سناٹا توڑنے لگی۔

"ہیلو۔!" کچھ دیر ناگوار نظروں سے اپنے قریب پڑے فون کو گھورنے کے بعد بالآخر اس نے بٹن آن کر دیا۔ لہجے میں خود بخود ایک تند سا تحکمانہ پن در آیا تھا جو کہ اس کی بارعب شخصیت کا خاصہ بن چکا تھا۔

"سر! ایک بڑی پارٹی آئی ہے کینیڈا سے۔ آپ سے ملاقات کی خواہاں ہے۔" اُدھر آفس میں پی اے دوسری جانب سے نیاز احمد نے نہایت مؤدب انداز میں بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ انہیں انٹرٹین کرو۔ میں آدھے پونے گھنٹے بعد آؤں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل آف کر کے دوبارہ میز پر پھینک دیا۔ اور صوفے میں دھنس کر دونوں ہاتھوں پر سر گراتے ہوئے سامنے لگے منقش آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اب بھی وہ اسی دلکش شخصیت کا مالک تھا۔

گھنے لہریے دار اسٹائلش بال۔ گالوں پر کھیلتی الجھی لٹیں۔ طلسماتی دنیا میں لے جانے والی چمک دار بھوری آنکھیں۔ غضب کی مردانہ دلکشی کا حامل بھرپور سراپا۔ اس پر دل کھینچ لینے والا دل فریب شاندار لب و لہجہ اور زبردست سوٹنگ۔

اگر اسے سوشل گیدرنگز میں "لیڈی کلر" کہا جاتا تھا تو اس میں ایک فیصد بھی مبالغہ نہیں تھا۔ وہ واقعی حسیناؤں کے دلوں پہ قدم رکھ کر چلتا تھا۔

حتیٰ کہ کیٹی سے شادی کے بعد بھی اس کے "نمبر" کم نہیں ہوئے تھے، وہ ہزاروں دلوں کی دھڑکن تھا۔ کیٹی کے بعد ایک کروڑپتی وفاقی وزیر کی بے انتہا خوبصورت سوشل لڑکی رشنا اس کی زندگی میں آئی۔ مگر سکون۔

سکون۔ کہیں بھی، کسی سے بھی نہ مل سکا۔ دل کا چین کسی سے بھی حاصل نہ ہو سکا تھا۔ گھڑی کی سمت تساہلی سے دیکھتے ہوئے بالآخر وہ اٹھا۔

Aneela Pakistanipoint

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوکر بادو دی ڈرامہ ہو رہی تھی اپنی
سے گرا دیں اب ہوتا کر یہ ڈرامیں بیٹھے تک کے عمل
میں اپنی وانٹ ہوتا کر یہ ڈرامیں بیٹھے تک کے عمل
کے دوران اس کے دل و دماغ جانے کن الجھاووں میں
ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے تھے۔
"یہ جو چنچل شوخ امیر کبیر حسینائیں ہوتی ہیں ناں
جواد احمد! یہ تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں۔ ان کو چھو کر
پکڑ کر چھوڑنے سے فقط ان کے چلبلے رنگ ہاتھوں
پر رہ جاتے ہیں۔ یہ ٹینشن دور کرنے کا ذریعہ نہیں
ہوتیں۔ یہ تو الٹا ٹینشن بڑھانے کا سبب بن جاتی ہیں۔
روزمرہ کے مسائل کے دباؤ سے نجات پانے کے
لیے تم صنف نازک کا سہارا لیتے ہو۔ گویا ان مسائل
سے فرار پانے کے لیے خود کو غلاظت کے ڈھیر
پر پھینک دیتے ہو، اخلاقی اقدار کو بے دردی سے
پامال کرتے ہو۔ تو لو بھلا۔ اس سارے عمل میں کتنا
سکون حاصل کر پاتے ہو؟ کیا اس طرح تمہیں مسائل سے
نجات مل جاتی ہے؟ نہیں ناں۔ وہ مسئلے تو جوں
کے توں رہ جاتے ہیں۔ الٹا تم اپنی وہ ریزرو انرجی
بھی ضائع کر دیتے ہو جس کو استعمال کر کے مسئلے
پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ فرار کبھی بھی کسی مسئلے کا حل
نہیں ہوا کرتا جواد احمد۔"
"میں فرار کہاں لیے پھرتا ہوں؟" وہ جھنجلا کھسیا کر کہتا۔
"یہ فرار ہی تو ہے جواد۔" دونوں ہاتھوں کو
پھیلا کر بڑے سبک سے بڑے رسان سے وہ سمجھایا
کرتی تھی۔ "یہ فرار ہی ہوتا ہے کبھی وجود زن کے
پیچھے فرار کبھی بے ڈھنگے میوزک، ہلے گلے اور ناچ
گانے کے پروگراموں کے پیچھے فرار، کبھی تعیش پسندی
کی عکاس پارٹیز اور فنکشنز کے پیچھے فرار، کبھی انگور
کی بیٹی سے کشید کیے گئے خمار کے پیچھے فرار۔"
"پھر مسئلہ حل کیسے کیا جا سکتا ہے؟" اس کی حرف
بہ حرف سچائی کے رنگوں سے سجی باتیں اسے پسپائی
اختیار کرنے پر مجبور کر دیتیں۔
"دیکھو ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے
لیے لوگ عموماً تین طرح کے لائحہ عمل اختیار کرتے
ہیں۔ حقیقت تسلیم کرنے سے سرے سے انکار کر
دینا۔ نمبر دو حقیقت سے فرار حاصل کرنے کے لیے
پیچھے ہٹ جانا، چھوڑ کر بھاگ جانا۔ یا دوسری چیزوں
کے پیچھے پناہ لے کر مسئلے سے نجات پانے کی کوشش
کرنا۔ اور نمبر تین۔ صورت حال کا بہادری سے سامنا
کرتے ہوئے ان پہلوؤں پر کام کرنا جس کے باعث
اس ناپسندیدہ اور صدماتی صورت حال سے چھٹکارا
مل سکے۔ اور ایک عاقبت اندیش اور مضبوط قوت
ارادی کا حامل باہمت انسان ہمیشہ یہی لائحہ عمل اختیار
کر کے اپنے مسائل حل کرتا ہے۔" جواب میں وہ گہری
سانس چھوڑتے ہوئے اپنی نشست تبدیل کرتے
ہوئے تساہلی سے پاؤں پھیلا کر کہتا۔
"یار۔ تیری باتیں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ اپنی
سمجھ سے باہر کی چیز لگتی ہیں۔"
"حرص، ہوس اور غرض سے بھرے دماغ رکھنے
والوں کی سمجھ سے باہر ضرور ہوتی ہوں گی، اس میں کیا
شک ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید ہوتا تھا۔
وہ ایک دم جیسے کرنٹ کھا کر سیٹ پہ سیدھا
ہو جاتا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا میں ہوس پرست ہوں اور
خود غرض انسان ہوں۔"
"جملے کی تصحیح کر لو۔ تم صرف ہوس پرست اور
خود غرض ہو، انسان نہیں ہو۔ ایک انسان میں
ایسے جوہر نہیں پائے جاتے۔"
اس کا لہجہ اتنا حتمی، اتنا سادہ اور بے نیاز ہوتا
تھا کہ جواد اکثر اتنا الجھ جاتا کہ غصے، خفگی اور اشتعال
کا اظہار کرنے کا مناسب اور فوری طریقہ سجھائی
نہیں دیتا تھا۔ وہ بس دل ہی دل میں پیچ و تاب
کھا کر رہ جاتا، یا پھر بھنا کر موقع پا کر ایک چپت
اس کے سر پر رسید کر دیتا۔
"کیا ہے۔ الو میں لولتی رہتی ہے الو کی پٹھی۔"
"شٹ اپ میرے اگلے پچھلوں تک مت پہنچو۔"
وہ بنا کسی لحاظ کے تڑاخ کر رکھ دیتی۔
"ایک تو مصیبت یہ ہے کہ مجھے تجھ پر غصہ نہیں
آتا۔" وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ورنہ
دل تو یہ چاہتا ہے کہ تجھے اتنی مار لگاؤں۔ ایسی
دھنائی کروں کہ۔"

Aneela Pakistanipoint

www.paksociety.com

جونہی وہ اس کی سیٹ کی پشت پر پہنچا، وہ برق رفتاری سے سیٹ چھوڑ کر دو چار قدم آگے کو بڑھ آتی۔

"دیکھو، بدتمیزی نہیں۔" وہ سر کٹتے ہوئے سختی سے کہتی۔ "جا رہی ہوں اب میں۔ ویسے بھی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

مگر وہ مانندِ دیوار راستے میں آن کھڑا ہوتا۔ اور جراتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے فاصلہ مٹا کر اسے تھام لیتا۔

"کیا ہے، چھوڑو ناں۔" اس کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑاتی ہوئی وہ روہانسی ہو جاتی۔

"تم اتنی بچتی کیوں ہو۔ ہیں؟" وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا متبسم لہجے میں پوچھتا۔ اس کا گریز، احتجاج اور غصہ کس کس طرح اس کی آتشِ شوق کو بڑھا کر الاؤ بنا دیا کرتا تھا۔

جانے کیا تھا اس میں۔ اس کے عام سے سراپے میں وہ کیا خاص بات تھی جو وہ گھنٹوں تخیل کے پردے پر لہرا کر اسے بے چین کیے رکھتا تھا۔ آخر کیا کشش تھی اس کی قربت میں کہ زمانے کی رفتار روک لینے کو دل مچلنے لگتا تھا۔

ایک وقت ۔۔ تھا کہ ہفتوں اس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس ایجنسی کا چکر لگانے کو ٹائم نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ فرصت نکال کر اس کے دفتر آ پاتی تھی۔ پھر اتفاقاً ہی کبھی دونوں کا ٹاکرا ہو جاتا۔ تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کبھی اس سے جدا ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کے آس پاس ہی رہی تھی۔ اس کو سکون اور راحت کی لطافتوں سے ہم آہنگ کرتی رہی تھی۔ کبھی جذبات میں آ کر وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا۔ وہ ہنس پڑتی۔

"اس میں کیا شک ہے، میں واقعی تمہارے آس پاس ہی تو ہوتی ہوں۔ یہ جو لفظ ہوتے ہیں ناں جگنوؤں کی طرح ہوتے ہیں۔ اندھیری تاریک سنسان راتوں میں اجالے کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ قربتیں جسمانی رابطے سے موسوم ہوتیں تو ہیر رانجھا، سسی پنوں، اور شیریں فرہاد کے قصے عالمِ وجود میں ہی نہ آ پاتے۔ جذبات کی گہرائی اور سچائی کا اصل پیمانہ قربت نہیں بلکہ فرقت ہوا کرتی ہے۔ اور پھر میں تو تمہارا آئینہ ہوں۔ تمہارا اپنا آپ میرے لفظوں کی روشنی میں تم اپنے آپ سے ملتے ہو۔ اپنے آپ تک پہنچتے ہو۔ اپنی اصلیت سے آگاہ ہوتے ہو۔ اپنی اس بظاہر شاندار و چمک پرسنالٹی کے بباطن پڑی دراڑیں تمہارے علم میں آتی ہیں۔ اسی لیے تو شاعر کہتا ہے کہ

ے تو میری سمت دیکھ کہ تو خود سے مل سکے،
میں تیری ذات بھی ہوں، تیرا آئینہ بھی ہوں۔"

"تو پھر دیکھوں تمہاری طرف؟" اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بہکی ہوئی بے باک بھرپور نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکا دیتا۔ وہی گہری گستاخ چھیڑتی ہوئی، چٹکیاں لیتی معنی خیز آنکھیں جو پل بھر میں اسے جھنجھلا کر رکھ دیتیں۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں نظر چرا کر مضطربانہ انداز میں ہاتھ مسلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔

"اونہہ! بڑی بنتی ہو ناں فلسفی ۔۔ ذرا نظر ملا کر بتاؤ تو جانیں۔" ذرا سی ڈھیل ملتے ہی اس کی شرارتیں عروج پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔

"تم بہت بدتمیز ہو۔" جھنجھلاتی، بوکھلاتی، نروس سی نائلہ شاہ اس کے اندر تک اتر جاتی تھی۔

وہ رنگ، وہ رویہ، وہ روپ، وہ چہرا اتنا عام سا ہوتے ہوئے بھی اس کے تخیل کے پردے پر ہمیشہ سب سے نمایاں اور چمکتا دمکتا لگتا تھا۔ اس بات کا اس وقت شاید اس کو اتنا احساس نہیں تھا۔ یہ اسرار تو گزرتے وقت کے ایک ایک بے حد حسین لمحے نے اس پر عیاں کیا تھا۔

اسی اثنا میں گاڑی "احمد پلازہ" کے آگے جا رکی۔ یہ پلازہ اسی کا خریدا ہوا تھا۔ ایک زمانہ ۔۔ تھا جب اس پلازہ ۔۔ کے دو کمرے کرائے پر لے کر اپنی کمپنی کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت وہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ کبھی یہ پلازہ پورے کا پورا اس کا ہو گا۔

"ایک وقت آئے گا جب یہ پورا پلازہ تم خریدنے کی استطاعت رکھتے ہو گے، اور تم ایسا کر بھی لو گے۔"

Amjada PakistaniPoint

www.paksociety.com

بھی بہت کچھ تمہارے ہوتے ہوئے بھی تمہارا نہیں ہو چکا۔ یہ زمانہ تمہارا نہیں ہوگا، یہ ہوا تمہاری نہیں ہوگی۔ یہ لوگ تمہارے نہیں ہوں گے، تم اکیلے بہت اکیلے رہ جاؤ گے۔ اپنی شناخت بھکاری کی طرح دردر ڈھونڈتے پھرو گے۔ قرارِ دل کو ترسو گے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے جواد احمد، بہت زیادہ افسوس۔ کاش میں تم کو تمہارا وہ روپ دکھا سکتی، جو اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔"

"نجومی ہے ناں کہیں کی۔" وہ تپ ہی تو جاتا اس کے سرسراتے تیکھے لہجے میں چھپے خدشات اندر سے اسے بہت ہراساں سے کر دیا کرتے تھے۔

بعض اوقات تو وہ سچ مچ اپنے آئندہ انجام سے عبرت پکڑ کر سارے غلط راستے بدل لینے کے متعلق سنجیدگی سے ٹھان لیتا تھا۔ لیکن پھر لذتِ دنیا دامنگیر ہو جاتی۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی استقبالیے پر بیٹھے کیبن میں جدید ترین کمپیوٹرائزڈ ایکسچینج کو آپریٹ کرتا، میسجز نوٹ کرتا آپریٹر الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اک شانِ بے نیازی سے سائیڈ پر بنی لفٹ میں گھس گیا۔ جس کا دروازہ لفٹ مین پہلے ہی مودبانہ انداز میں کھولے تیار کھڑا تھا، ساتھ میں صاحب کا بریف کیس پکڑے باوردی ڈرائیور نے چوتھی منزل کا بٹن دبا دیا۔ گراؤنڈ فلور یا دوسری تیسری منزل کو ترجیح دینے کے بجائے اس نے چوتھے فلور پر اپنا روم بنوانا پسند کیا تھا۔ باقی فلور کام کے لیے سیٹ کیے گئے تھے۔ سب سے آخری یعنی پانچویں منزل اس نے اپنے ایک جاننے والے سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر ایس ایم کاظمی کو کرائے پر دے دی تھی۔ انہوں نے یہاں اپنا مینی ہاسپٹل کھولا ہوا تھا۔

چوتھے فلور پر مین آفس بنانے کی ایک لاشعوری وجہ یہ بھی تھی کہ کاروبار کے آغاز میں اس نے اسی فلور پر تین کمرے کرائے پر لیے تھے۔ ان تین کمروں سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ پہلے تو اس کے استعمال میں ایک روم ہی تھا باقی دو کام کے لیے استعمال ہوتے تھے، مگر اب یہ پورا فلور اس نے اپنی سہولت کے مطابق اپنے لیے سیٹ کر لیا تھا۔ آفیشل میٹنگز اور وزیٹرز سے بات چیت کرنے کے لیے ایک وسیع و عریض، بنا سجا کمرہ تھا۔ اس سے ملحقہ کونے میں ایک انتہائی پُرتعیش بیڈروم اور اٹیچڈ باتھ تھا۔ ایک کمرہ وزیٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا، یہاں عام ملاقاتیوں یا آفس سے منسلک ملازمین کو بٹھایا جاتا تھا۔ جبکہ ایک شاندار سا کمرہ خصوصی مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس اسپیشل گیسٹ روم میں غیر ملکی وفود، اعلیٰ سطح کی سرکاری یا غیر سرکاری شخصیات یا اس کے انتہائی قریبی دوستوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ اور انہیں براہِ راست نیاز خان خود انٹرٹین کرتا تھا۔ کینیڈا سے آئی پارٹی اسی گیسٹ روم میں اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

اس کے اپنی نشست سنبھالتے ہی نیاز خان بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

چند فائلیں کھنگالنے کے بعد کاغذ ایک طرف کرتے ہوئے بالآخر اس نے نیاز خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک پانچ منٹ بعد اندر بھیج دو۔ دس منٹ بعد اچھی سی کافی بھجوا دینا۔ اور اس دوران کوئی کال آئے تو نوٹ کر لینا لیکن ادھر ٹرانسفر مت کرنا۔ رائٹ۔"

"یس سر۔" وہ مزاج شناس تھا، اپنے باس کی ایک ایک جنبش کے مطالب و معانی سے آشنا تھا، کام کے معاملے میں جواد اس پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ کینیڈین پارٹی کے ساتھ خوش اسلوبی سے بزنس ڈیلنگ طے پا گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے فن کا بادشاہ تھا۔ اپنے بزنس میں دھوکا کھانا اس نے نہیں سیکھا تھا۔

کینیڈین پارٹی کو فارغ کر کے وہ بیٹھا ہی تھا کہ انٹرکام پر نیاز خان پوچھنے لگا۔

"سر! دوسرے وزیٹرز کو بھیجوں یا نہیں۔"

"انہیں کل کی ڈیٹ دے دو۔" کرسی پر جھولتے ہوئے اس نے تساہل سے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شام کے پانچ بجنے کو تھے۔

اس نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے ماتھے پر آئے گھنے بالوں کے گچھے کو پیچھے ہٹایا۔ اور پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دھیرے دھیرے کمرے میں پڑی اشیاء اور درودیوار پر نظریں دوڑانے لگا۔

اس کمرے کے کئی گوشوں سے اس کی بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ اسے مختلف زاویوں سے نائلہ شاہ گریزاں ہوتی، بچتی، کتراتی، دوسری سمت لپکتی محسوس ہوتی تھی۔

بعض اوقات جب اس کی نگاہوں سے لپکتے آوارہ شعلوں کی حدت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی تو وہ پیش بندی کے طور پر بہ سرعت سٹپٹا کر دروازے کی سمت لپکا کرتی تھی۔

"لگتا ہے تمہارا میٹر گھومنے والا ہے۔"

کبھی وہ اس کا ارادہ جان کر پھرتی سے نشست چھوڑ کر اس کی راہ میں مزاحم ہو جایا کرتا تھا۔ اور کبھی نائلہ شاہ کا داؤ چل جاتا تو وہ کمرے سے باہر نکل چکی ہوتی تھی۔ کبھی راستے میں دھر لی جاتی، تو وسیع و عریض کمرے کے کسی گوشے میں دبک کر اس سے بچنے کی ناکام کوشش کرتی، خفا خفا کتراتی، بوکھلاتی نائلہ شاہ اس کے دل و نظر کو پاگل سا بنا دیتی تھی۔

"پتا نہیں۔ میں نے تمہیں کھو دیا یا تقدیر نے تمہیں میرا نہیں ہونے دیا۔ یا پھر تم نے مجھ سے میرا اپنا آپ چھین لیا۔ کیا نام دیا جائے اس حادثے کو؟"

وہ منجمد سی نگاہوں سے اپنی سیٹ کے عین دائیں طرف دیوار میں بڑے قد آدم شیشے میں اپنا عکس دیکھتا خود سے سوال کر رہا تھا۔ "وہ دور بھی عجیب تھا، جب تم میرے پاس تھیں۔ تو کبھی احساس تک نہیں ہوا تھا کہ تم ایک دن میرے ساتھ نہیں ہو گی۔ یوں لگتا تھا بیچ میں کوئی آئے گا ہی نہیں۔ کبھی تمہارے ہزار سمجھانے کے باوجود کبھی تمہاری اس بات کو سیریس لیا نہیں تھا۔

"دیکھو کوئی شخص ہمیشہ کے لیے ـــ دوسرے کے ساتھ نہیں رہتا۔ یہ باتیں جو تم چٹکیوں میں اڑا دیتے ہو، یہ تمہیں کبھی یاد آئیں گی، لیکن اس وقت وقت بہت آگے گزر چکا ہو گا [illegible] تمہیں سمجھانے یا بچوں

کی طرح سبق دینے نہیں آیا کروں گی۔ ساری عمر تمہارے ساتھ نہیں رہنا مجھے۔ آج ہوں، کل نہیں ہوں گی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا، لیکن تم اس ساتھ سے کم از کم فائدہ اٹھانا سیکھ لو۔" جواد نے کبھی پرواہ ہی نہ کی تھی۔ ملنے بچھڑنے کی باتوں کو ڈائیلاگ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مگر آج اسے اس بات کی سمجھ آئی تھی۔

"تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے نائلہ شاہ کہ میں آج سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی تہی دست ہوں۔" اپنی دکھتی کنپٹیوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے وہ پژمردگی سے سوچ رہا تھا۔ "جیسے اچانک زندگی میں آئیں ایسے ہی اچانک چلی گئیں۔ اپنے ساتھ اتنا کچھ لے گئیں میرا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ کنگال کا کیا بنے گا۔ میں کیسے جیوں گا بنا کسی احساس کے، کسی جذبے کے۔" "یہ باتیں تو تمہیں آج محسوس ہو رہی ہیں۔ اس وقت کہاں تھے جب ساری تگ و دو، دو اور دو کو پانچ بنانے میں لگا دیا کرتے تھے؟" اس کے اندر جیسے کوئی ہنسا تھا۔

پھر وہ اندر کی کہانی سے گھبرا کر آفس سے نکل آیا۔ ڈرائیور کو ساتھ لینے کے بجائے اس سے چابی لے کر خود ہی ڈرائیو کرتا ہوا قدرے سنسان اور پرسکون رستے پر نکل آیا۔ یادوں کا ایک ہجوم سا اس کے اندر امڈا چلا آ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر یونہی اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ ناہید اختر اپنے پرسوز انداز میں نغمہ طراز تھی۔

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا

"آہ" ہائے، فراخ ماتھے پر آئے بالوں کو ایک ہاتھ سے بے تابی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے گہری سانس لی۔ اِدھر اُدھر شام کے گھنے غلاف میں لپٹے اداس مناظر روح کو عجیب طرح کی بے قراری بخش رہے تھے۔

سہ اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آ گئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک دم جیسے کسی نے اس کے دل کے مضراب چھیڑ دیے تھے، واقعی سو فیصدی برمحل شعر تھا، کس کے پیچھے گھر کی راہ لوں۔ گھر بھاگوں۔ وہ سونے جیسا محل نما گھر اسے اک عذاب گاہ محسوس ہو رہا تھا۔

"خوشیاں اونچی عمارتوں سے وابستہ ہوا کرتیں تو بادشاہوں کے گھروں کے مکین خوشیوں کے جھولوں میں جھوم جایا کرتے۔ ایسا نہیں ہوا کرتا جواد احمد۔ ایسا نہیں ہوتا۔" وہ شدید پُرزور لہجہ سماعتوں میں کتنا محسوس ہو رہا تھا۔

دل کی کسک تو ساتھ رہے گی عمر بھر
دریائے غم کے پار اُتر جائیں ہم تو کیا

اور اس کسک کے ساتھ جینا میرے لیے سزا بنتا جا رہا ہے نائلہ شاہ۔ مجھے تم پر کتنا غصہ آتا ہے۔ میں نالاں رہتا ہوں تمہاری یاد سے۔ جو کسی لمحہ ساتھ چھوڑتی ہی نہیں۔ اب ہر لمحہ، ہر جگہ لحظہ بہ لحظہ میری روح کاٹتی ہی چلی جاتی ہے۔ تنہائی کی یہ چادر شام کی طرح پھیلتی کیوں جا رہی ہے۔

پھول مرجھا گئے، چپ ہوئے بام و در شام تنہائی میں
ماند پڑنے لگے تتلیوں کے پر شام تنہائی میں
خال و خد میں ترے ایسے کھوئے جو ہم اتنا روئے جو ہم
اپنے احوال سے ہو گئے بے خبر شام تنہائی میں
گاہے گاہے تری دھیمی سرگوشیاں مجھ کو آنے لگیں
رفتہ رفتہ ہوا خامشی کا اثر شام تنہائی میں

"یہ میرے اندر کون بولتا ہے۔ یہ کون میرے زخم ادھیڑنے مجھے از سرِ نو توڑنے اندر در آتا ہے۔"
دہشت زدہ سوچیں اس کے روح و بدن کو بُری طرح کاٹ رہی تھیں۔ آج اسے وہ بے سبب بے تحاشا یاد آ رہی تھی۔

رنگ تھا روشنی میں ڈھلتا تھا
ہر کوئی میرے ساتھ چلتا تھا
اب سنبھلتا نہیں ہے دل میرا
یہ تو پہلے بھی کب سنبھلتا تھا
اب میں سائے کے پیچھے بھاگتا ہوں
میرے پیچھے یہ پہلے چلتا تھا
دم بھی آتا تھا دیکھ کر اس کو
دیکھ کر اس کو دم نکلتا تھا

"اے بیلی! ذرا اچھی سی چائے تو بنا دے چندا۔"
یونیورسٹی سے واپس آ کر کھانا کھا کر وہ بستر پہ دراز نیند کی وادیوں میں کھونے کو تھی کہ امی دروازے پہ آ گئیں۔

"کون آیا ہے؟" وہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تیرے بابا مرحوم کے پرانے جاننے والے ہوتے ہیں زبیر احمد صاحب۔ وہ اور ان کا بیٹا دونوں آئے ہیں۔"

"یہاں۔۔؟ مگر کس طرح؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "وہ تو غالباً ملتان ہوا کرتے تھے۔"

"کچھ عرصہ پہلے ادھر شفٹ ہوئے ہیں، بتا رہے تھے کہ وہاں کاروبار مندے میں جا رہا تھا، سو سب کچھ لپیٹ کر کے ادھر آ گئے، بڑے اچھے اور انسان دوست بندے ہیں، چائے لے کر آ جانا تم بھی سلام دعا لے لینا۔" امی یہ کہہ کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

"السلام علیکم۔" کمرے میں داخل ہو کر ٹرے ہاتھ میں پکڑے سر پر سلیقے سے نیلا آنچل ٹکائے اپنے مخصوص پُراعتماد انداز میں بغیر اِدھر اُدھر نگاہ کیے وہ چیزیں سینٹرل ٹیبل پر لگانے لگی تھی۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ ماشاءاللہ تو یہ ہے ہماری بیٹی؟" سفید سر سیاہ بالوں کی آمیزش لیے چھوٹی چھوٹی فرنچ کٹ داڑھی، مضبوط جثے اور صحت مند گندمی رنگت لیے بزرگ نما شخصیت نے بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"اور بچے! کیا مشاغل ہیں آپ کے؟" زبیر احمد اسی شفیق نرم انداز میں دریافت کر رہے تھے۔

"یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے آخری سال ہے۔ بین الاقوامی تعلقاتِ عامہ کے شعبے میں ہے۔" امی کے لہجے میں ممتا والا فخر و ناز شامل تھا۔

"اچھا۔ بھئی ماشاءاللہ۔" زبیر احمد کے لہجے میں سراسر تحسین تھی۔ "اپنے برخوردار جواد احمد بھی یونیورسٹی ہی میں ہوتے ہیں۔ ادھر مائیگریشن کرائی ہے۔ ان کا بھی آخری سال ہے ایم بی اے میں۔"

اس نے یونہی بلا ارادہ اپنی نظر ایک لمحہ کو اس سمت ڈالی،

اور پھر بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔
"جواد احمد۔" وہ بھی ایک دم چونک پڑا۔
"اچھا جانتے ہو ایک دوسرے کو۔ یونیورسٹی میں سل چکے ہوگے، اچھی بات ہے۔" زبیر انکل پہلے حیران ہوئے اور پھر خود ہی وضاحت کر دی۔
"کیسے مزاج ہیں مس نائلہ شاہ۔" اس نے بڑے اسٹائلش انداز میں صوفے سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ جمائے اس پر تفصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ مختصراً کہہ کر انکل سے دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کر کے نکل گئی تھی۔
جواد احمد کے گروپ سے وہ اچھی طرح واقف تھی، یونیورسٹی میں یہ گروپ "اسٹار گروپ" کے نام سے مشہور تھا۔ اور اس گروپ کا روحِ رواں اور لیڈر جواد احمد تھا۔ گروپ ممبرز میں بگڑے ہوئے رئیس زادے، فیشن زدہ لڑکیاں، سر بے راہ روی کے شکار مرد و زن شامل تھے ـــــ اچھے اور شریف لڑکے لڑکیاں تو اسٹار گروپ کے ممبران سے دور دور رہنے میں ہی عافیت جانتے تھے۔
الیکشن کا زمانہ تھا، اسٹار گروپ کا لیڈر جواد احمد کھڑا ہوا تھا۔ ووٹنگ کے لیے اکثر ان کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ لوگ بس سلام و دعا سے آگے بات نہیں بڑھاتے تھے، خصوصاً نائلہ کی ستھری کھری طبیعت اس گروپ کی بے باکی اور اخلاق باختہ طرز و انداز سے سخت الرجک تھی۔
"زبیر انکل تو اتنے اچھے اور شریف نظر آتے ہیں مگر ان کا بیٹا پورا ابلیس کا چیلا ہے۔ یہ کس پر چلا گیا؟" رات کو یوں ہی ٹیرس پر ٹہلتی وہ سوچ رہی تھی۔

"کیسی ہیں مس آپ؟" لائبریری کی سمت روانہ ہوتے ہوئے نائلہ ایک بھرپور پُرتپاک آواز پر جھٹکے سے پیچھے مڑی تھی۔
گلابی گریبان والی قمیص ـــــ اور نیوی بلو جینز میں کھڑا کھیلا، کف کے بٹن کھولے آستین لاپروائی سے کہنیوں تک موڑے رکھے وہ خوبصورت انداز میں کھڑا ہوا وہ کوئی مغرور یونانی دیوتا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سراپے کا ایک ایک جزو مردانہ کشش سے مالا مال تھا۔ وہ بلا مبالغہ ایک بھرپور نگاہ اور مسکراہٹ سے بڑے بڑے شاہوں، جاگیرداروں کی حسین و جمیل مغرور بیٹیوں کی نخوت میں خم ڈالنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس کی طلسماتی کشش کی لہریں جیسے اس کے مخاطب کو اپنے حصار میں لے لیتی تھیں۔ وہ مسحور سا ہو کر رہ جاتا تھا۔
اسے اپنا تفصیلی جائزہ لیتا دیکھ کر جواد احمد کی آنکھوں میں فاتحانہ سی کیفیت در آئی تھی۔
"جی فرمایئے۔" نائلہ شاہ کا لہجہ بہت خشک اور سرد تھا۔ اس کی توقع کے برعکس، حالانکہ اس کا خیال تھا وہ "تعلق داری" کے اظہار کے طور پر اب ضرور اس کے قریب آجائے گی۔
"کہاں جا رہی ہو، آؤ ذرا ادھر کینٹین کی طرف چلتے ہیں، ایک کپ چائے ہو جائے۔" اس نے اپنی طرف سے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے بڑی فراخدلانہ پیشکش کی تھی۔ اور پھر ہاتھ کے اشارے سے پیچھے آنے کا کہہ کر خود اعتمادی سے اگلا قدم بھی بڑھا لیا تھا کہ اس نے دو ٹوک کہہ دیا۔
"سوری، میں ہر ایرے غیرے کے ساتھ چائے نہیں پیا کرتی۔" ساتھ ہی اس سمت کو قدم بڑھا دیے جدھر اس کا گروپ تھا۔ سیما وغیرہ لوگ ادھر ہی آ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر اس کی پیشانی پر بل پڑتے چلے گئے۔
"کیا مطلب ہے مس آپ کا؟"
"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" ادھر انتہا درجے کی رکھائی تھی۔ اسی اثنا میں وہ لوگ بھی قریب آگئے، اور ہیلو ہائے کی، کہ بالآخر وہ عنقریب یونین کا پریذیڈنٹ بننے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص ساحرانہ انداز میں بڑی بشاشت اور گرمجوشی سے حال احوال پوچھنے کے بعد کنوینسنگ کا آغاز کیا تھا۔
"تو پھر ہم توقع رکھیں کہ آپ اپنے قیمتی ووٹوں کے تعاون سے اس خادم کو سرفراز فرمائیں گی۔"
جواب میں سبھی نے انہوں نے نیک تمناؤں کا اظہار

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے جانا چاہا کہ سیما نائلہ کے محبت بھرے گرم ہونے لگتے ہوئے بولی انداز دیکھ چکی تھی۔

"آپ سے تو میرا خیال ہے اس سلسلے میں کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ آپ سے تو ہماری قریبی رشتہ داری ہے" چلتے چلتے اس نے براہِ راست نائلہ کی آنکھوں میں جھانک کر بڑے دلنشین سے انداز میں کہا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"کس قسم کی رشتہ داری بھئی۔۔؟" اس کے جاتے ہی فروا نے نہایت متجسسانہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی تمہاری کہاں کی رشتہ داری ہونے لگی اس سے۔" سیما کو حد درجہ حیرت تھی۔ وہ میٹرک کے زمانے سے اسے جانتی تھی۔

"یونہی بکواس مار رہا تھا۔" وہ غصے سے سر جھٹکتے ہوئے ان کے قریب گھاس پر بیٹھ گئی۔

"ابا مرحوم کے کسی پرانے دوست کے صاحبزادے ہیں اور بس۔"

"وہ کوئی چائے شائے کی آفر بھی دی جا رہی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے۔" فروا نے انجان بن کر اس کی شکل دیکھی۔ جہاں ناگواری اور خفگی کے سائے نمایاں تھے۔

"دو ووٹوں کے لیے مارا ماری ہو رہی تھی سب؟" نائلہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ذہین فعال اور خاصی ہر دلعزیز شخصیت مانی جاتی تھی اور یونیورسٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں اس کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ اس کی رائے مشورے اور پسند و ناپسند کو ٹھیک ٹھاک اہمیت دیتے تھے، اس لیے الیکشن کے زمانے میں امیدواران ڈیپارٹمنٹ کی فعال اور پسندیدہ شخصیات سے خصوصی روابط رکھتے تھے۔ جواد احمد اس سے پہلے بھی ایک دو دفعہ اپنے اسٹار گروپ کے ہمراہ آ چکا تھا اس سلسلے میں۔

"سمجھتا ہوگا جیسے چل ہی پڑے گی اس کے ساتھ۔" سیما کے لہجے میں جواد احمد کے لیے ناپسندیدگی کے "تاثرات" واضح تھے۔ ان کا گروپ واضح طور پر "اسٹار گروپ" کے ہر بندے سے الرجک تھا۔

"ویسے تمہاری جگہ اگر کسی اور لڑکی کو یہ آفر ملی ہوتی تو اب تک مارے خوشی اور حیرت کے ہارٹ اٹیک ہوا چکی ہوتی۔" فروا نے شگفتگی سے کہا تھا۔

"یہ تو صحیح تجزیہ کیا تم نے۔" ارم بھی قائل ہو گئی۔

"حالانکہ سب جانتے ہیں اس کے گروپ کے کرتوت۔ خصوصاً اس کی بھنورا صفتی کی تو کوئی مثال ہی نہیں ملتی۔ پھر بھی جانے کیا دیو مالائی انداز ہے اس کا کہ لڑکی جان بوجھ کر اپنا آپ پیش کر دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔"

"کشش کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہوتی ہے۔ ظاہری خوبصورتی کی کشش جیسے جن کو قدرت نے خوبصورت نین نقش عطا کیے ہوں، وہ بے شک مرد ہو، عورت ہو یا قدرت کی تخلیق کردہ اس کائنات کا کوئی منظر ہو۔ فطرت کی اس حسین صناعی پر نظر پڑنا اور نظر کا داد دینا قطعی فطری امر ہے۔ دوسری ہوتی ہے باطنی کشش یعنی کسی کی نیک سیرتی سے، اس سے کسی تعلق کی نسبت سے یا دلی جذبات کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے کسی شخصیت کو پسند کرنا اور تیسری ہوتی ہے۔ جنس کی کشش جس میں خصوصی طور پر مرد عورت کا فرق واضح ہوتا ہے اور یہ کشش برق رفتاری سے سوکھی چٹختی لکڑی پر آگ کی طرح کا کام کرتی ہے۔ اس شخص کا کمال یہ ہے کہ یہ ظاہری —— کشش کے خزینوں سے مالا مال ہے۔ ہر طرح سے ایک "بم" کی طرح مخاطب کے اعصاب اور قلب پر پھٹتا ہے۔ بدقسمتی سے اپنی اس "صلاحیت" کا اسے بخوبی اندازہ ہے۔ اپنے وجود سے نکلنے والی کشش کی لہروں سے پیدا کردہ "تباہ کاریوں" سے بھی آگاہ ہے۔ سو اسی زعم نے تکبر اور غرور و انا کے جراثیم بھر دیے ہیں اس میں۔" نوٹس پر نظریں دوڑاتے ہوئے نائلہ نے قدرے تیکھے سے انداز میں تجزیہ کیا تھا۔

"ویسے چلی جانا تھا۔ کیا حرج تھا۔" فروا نے یونہی چھیڑا۔

"ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا۔ "میں تو ایسے بد بودار شخصیت رکھنے والے بندے کا سایہ بھی برداشت نہ کروں۔ اپنے والدین کے فخر و ناز کو، اپنے خاندان کی نیک نامی کو ملیامیٹ کرنا ہے مجھے؟ اور پلیز یہ

Aneela
Pakistanpoint

بات کسی کو پتا نہ چلے کہ میرا اور اس کا کوئی تعلق بنتا ہے۔"

مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ فروا لوگوں سے پہلے ہی جواد احمد ڈھنڈورا پیٹ چکا تھا اس تعلق داری کا۔ کیونکہ اسی نسبت سے اس کو موقع بے موقع دیکھ کر راہ روک لیتا یا ادھر ادھر کی مارنے لگتا تھا پتا تو چلنا ہی تھا۔ جھنجلا کر رہ جاتی۔ اس کے نزدیک یہ تعلق داری اس کے لیے شدید سبکی کا باعث تھی۔ خصوصاً لڑکیوں کا اسے تنقیدی اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنا اسے اندر ہی اندر سخت بری طرح خفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کچھ بھی تھا ساری یونیورسٹی اسٹار گروپ کے "کارناموں" سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ تھی۔ ایسے میں اتنے بدنام گروپ کے لیڈر سے اس کی قرابت داری اس کے لیے شرمندگی اور ذلت سے کم نہ تھی۔

"کدھر ہوتے ہیں پرنس آپ؟ بھئی بڑا شہرہ سنا تھا۔ بڑی دھوم مچی ہوئی ہے آپ کی۔ سنا تھا آپ ایک نظر سے مخاطب کو بھسم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سوچا پھر تو دیدار ضروری ہے۔"

ستاروں بھری سیاہ سلیولیس میکسی جو آگے اور پیچھے دونوں جانب سے انتہائی گہری تھی میکسی بدن کے ساتھ یوں پیوست تھی جیسے پہن کر آخری سلائی کی گئی ہو۔

جواد کی نگاہ گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھی۔ سوا کے بے نیاز۔ سی مگر بھرپور گرم مسکراہٹ لیے اس پر اپنی طلسماتی بھونرا نگاہیں ٹکا کر جواباً بولا۔

"شعلہ بھی ہیں شبنم بھی ہیں۔ سامان آتش تو آپ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہم تو محض موم کے پتلے ہیں۔ تمازت سے پگھل کر بہہ جانے والے۔ فنا ہو جانے والے۔ پروانے کی طرح نثار ہو جانے والے۔"

سیاہ تھری پیس سوٹ میں وہ بہت دلکش اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔

مرد بہت کم حسین ہوا کرتے ہیں۔ کہ مرد وزن کے لیے خوبصورتی کا پیمانہ بہت مختلف ہوتا ہے۔

عورت کا سارا حسن اس کے چہرے سے مشروط ہوتا ہے جبکہ مرد کی کشش کا پیمانہ اس کا بھرپور اسمارٹ وجود قرار دیا جاتا ہے۔ وہ تو دونوں "ہتھیاروں" سے لیس تھا۔ جہاں چہرے کا ایک ایک نقش بلا کا پرکشش اور طلسمی تھا وہاں سراپا غضب کی مردانگی اور وجاہت کا عکاس تھا۔ سو سیٹھ کریم کی بیٹی اور ایم پی اے کی طرحدار سوشل بیوی دونیا وجاہت سے گرائی۔

"یہ تو ثابت کرنا پڑے گا۔ تب ہی جانا جا سکتا ہے۔ کون دراصل کیا "شے" ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ دس پندرہ منٹ کے لیے بیٹھتے ہیں کہیں۔" اس کے لہجے میں تپش تھی۔

"یہ میرا کارڈ رکھیے گا۔ اس پر ایڈریس اور فون نمبر درج ہے۔ کل شام کے بعد کوئی سا پروگرام سیٹ کر لو۔ لیکن پہلے فون پر اطلاع دے دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" کارڈ لے کر اندرونی جیب میں پھرتی سے منتقل کرنے کے بعد وہ اس بے نیازی سے دوسری سمت بڑھ گیا تھا۔ گویا کوئی کاروباری ڈیلنگ طے کی ہو۔

نائلہ نے نہایت سلگتی ہوئی نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اندر غضب کا سمندر ابل رہا تھا۔ مٹھیاں شدت جذبات سے بھینچی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر رہ رہ کر ابال اٹھ رہے تھے۔ اخلاق و کردار کی کس بے دردی سے دھجیاں بکھیری جا رہی تھیں سر عام۔ جانے عزتوں کا سودا اتنا سستا اور کم قیمت کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ دن بدن۔ ایک جائز حق کو کس بے دردی اور دیدہ دلیری سے ناجائز طریقے سے کسی "چور" کے سپرد کر دیا جاتا ہے اچھی طرح لوٹنے کے لیے۔

"رہے۔ لو بھئی کیا حال چال ہے۔ آنٹی کدھر ہوتی ہیں۔" فراخ پیشانی پر آئے بالوں کو بڑے دلفریب سے انداز میں ایک ہاتھ سے پرے کرتا وہ بڑے بشاش اور گرمجوش انداز میں گویا ہوا تھا۔

نائلہ کی پیشانی ہزار کوشش کے باوجود سلوٹ زدہ ہو گئی۔ امی غسل لے رہی تھیں اور گلو بارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ سارا ملازم لڑکا ہو، جواد اپنے مادر کیٹ گیا ہوا تھا سو
مجبوراً ہی اسے بیرونی دروازے تک آنا پڑا تھا جبھی
آواز سن کر۔
"تشریف لائیے" اس کا ڈٹا ہوا انداز دیکھ کر مرتی
کیا نہ کرتی کے مصداق اندر لانا ہی پڑا۔ وہ بڑی بے تکلفی
سے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔
"بیٹھو بھی تم بھی۔ کھڑی کیوں ہو" گویا وہ
میزبان ہو۔
"آپ بیٹھے یہی کافی ہے" اس کا لہجہ حد درجہ
کھردرا تھا۔
ایسے کے جواد احمد نے خاصی توجہ سے اس کی
شکل کا جائزہ لیا۔ بالکل سادہ، عام فہم، نارمل نقوش
سے مزین چہرا تھا اس کا۔ بظاہر ایسی کوئی خاص کشش
نہیں رکھتا تھا کہ آدمی پلٹ کر دوبارہ دیکھنے پر مجبور
ہو جائے۔ سرخی مائل گندمی رنگت، کندھوں سے ذرا
نیچے تک چوٹی کی شکل میں مقید بال درمیانہ قد، ہلکے
نیلے رنگ کے لان کے بالکل گھریلو سے لباس میں
بالکل عام سے انداز میں وہ قطعی کوئی چونکا دینے
والی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ مگر اس کی شفاف
سی آنکھوں میں بھرے غصیلے شرارے اور چڑھی ہوئی
تیوریاں اس کے لیے خاصی غیر متوقع اور حیران کن
تھیں۔

Aneela Pakistanipoint

"اب بیٹھ بھی جاؤ ناں۔ کیا تیہا دکھا رہی ہو"
اس نے جواب میں حد درجہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔
انداز سے نمایاں تھا کہ بی بی ہم جانتے ہیں تم ہماری قربت
اور دوستی کے لیے مری جا رہی ہو۔ جب بڑی بڑی
شاہ زادیاں ہتھیار ڈال دیتی ہیں ہمارے آگے تو تم
ایک معمولی سی لڑکی کیا حیثیت رکھتی ہو۔ اندر سے
تو "مغلوب" ہو چکی ہو۔ ہماری شخصیت کی کشش کی
اسیر ہو چکی ہو۔ اب چھوڑو یہ دکھاوا ——

"امی ابھی آ رہی ہیں۔ میں چائے بھجواتی ہوں"
وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھی تھی۔
"ارے سنیے تو سہی" جواد احمد نے بعجلت پکارا۔
وہ دل ہی دل میں متحیر سا تھا۔ اس کے وہم و گمان
میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکی یوں اسے نظرانداز
کر کے اکیلا چھوڑ کر جا سکتی تھی۔
"اب اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں ہوتی مس
نائلہ شاہ۔ بندے کو تھوڑا نرمی سے، آرام سے پیار
محبت سے بات کرنا چاہیے" گویا اپنی دانست میں
ناصح بن رہا تھا۔
"سوری۔ مجھے یہ زبان نہیں آتی" اس نے انتہائی
سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ہنوز وہ دروازے کے پاس
کھڑی تھی۔

جواد احمد کو اس کے اکل کھرے انداز پر غصہ تو
بہت آیا کہ وہ اس لب و لہجے کا عادی نہیں رہا تھا
مگر مصلحتاً پی کر خوشگوار سے انداز میں بولا۔
"کوئی بات نہیں۔ ہم سکھا دیں گے۔ بشرطیکہ
ہمارے ساتھ رہو۔ ویسے کہاں ہیں تم اتنے دن
یونیورسٹی دکھائی نہیں دیں۔ کبھی پوچھ رہے تھے تمہارا
میں نے سوچا گھر کی بات ہے جا کر پتا کر آؤں خیر خیریت
تو ہے ناں سب"
"سب خیر ہے۔ آپ کو میری فکر میں دبلا ہونے
کی ضرورت نہیں اور دوسری بات یہ کہ میں پہلے
بھی آپ پر واضح کر چکی ہوں کہ آپ اس تعلق داری
کا یونیورسٹی میں ڈھنڈورا نہ پیٹیے گا"
"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے بھئی" اسے
اچنبھا سا ہوا۔
"میں پسند نہیں کرتی کہ کسی بھی حوالے سے میرا
نام آپ کے نام کے ساتھ آئے" اس نے نہایت
آرام سے جواب دیا۔ "یہ میری ریپوٹیشن کا سوال ہے"
لہجہ اور الفاظ کیا تھے اک بم تھا جو اس کے
اعصاب کے نزدیک پھوڑا گیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس
کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس نے کس قدر عام سے
انداز میں اس کی بھرپور شاندار خوبصورت شخصیت
کے سحر کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ دو کوڑی کا نہیں
چھوڑا تھا اسے۔
"آپ مجھے گالی دے رہی ہیں مس نائلہ شاہ
اور میں اتنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا"
وہ سختی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ احساس

WWW.PAKSOCIETY.COM

توہین سے سرخ ہو گیا تھا۔

”میں نہیں سمجھتی کہ آپ عزت اور بے عزتی جیسے الفاظ — سے کبھی آشنا بھی رہے ہوں۔“ اس نے اس کے غضب آلود چہرے کے برعکس نہایت ٹھنڈے اور ہموار انداز میں اگلی چوٹ کی تھی۔

وہ تلملا کر اس کی طرف مڑ گیا۔

”مس نائلہ شاہ! آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔ جانتی ہیں آپ کس سے مخاطب ہیں؟ میں اس قسم کے لب و لہجے کا عادی نہیں ہوں۔ کسی کی جرأت نہیں جو مجھے اتنی باتیں سنائے۔ آپ کی اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ بہر حال بابا جان کی نسبت سے اس گھر کے مکینوں کا احترام کرنا اور خیال رکھنا مجھ پر لازم ہے۔“

”اس احساس کا شکریہ۔ لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ ہمیں آپ کے ادب و احترام سے لیس رذالتوں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آپ چاہیں تو یہ چیز دوسری ضرورتمندوں پر خرچ کر سکتے ہیں بخوشی۔“

اس کے دوٹوک انداز پر جوادا احمد نے حقیقتاً ٹھٹک کر نہایت غور سے اس کے چہرے کے تاثرات جانچے۔ وہاں بناوٹ، تصنع یا دوغلے پن کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ انداز میں بھی نہایت درجے کی بے نیازی تھی۔ وگرنہ یہی گمان کر لیتا کہ بظاہر اس ناراضگی اور غصیلے پن کے انداز میں اپنائیت یا شکایت جتائی جا رہی ہے۔ وہ تو قطعاً بے نیاز اور بے لحاظ نظر آ رہی تھی۔

”بہت خوب۔“ بہت دیر تک اس کا چہرہ پڑھنے کے بعد وہ بالآخر آہستگی سے مسکرایا۔ ”تمہارا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ بغیر کسی لگی لپٹی کے کہہ ڈالا کہ میں تعلق استوار نہیں کرنا چاہتی۔ زبردست۔ ورنہ

لڑکیاں تو مجھ سے زبردستی کے بے سروپا تعلق جوڑ کر فخر اور خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اور تم مجھ سے ایک واضح اور مضبوط رشتے کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی خواہاں ہو۔ بہت خوب مجھے اچھا لگا تمہارا سادہ اور بھرپور خود اعتماد انداز۔ لیکن یہ تو بتاؤ آخر اتنی بیزار اور خفا کیوں نظر آتی ہو مجھ سے۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ حالانکہ میں تو دوسروں کی نسبت خاصی تمیز اور ادب آداب کے ساتھ تمہارے ساتھ بات کرتا ہوں۔ بھئی تمہارے تیور ہی ایسے ہوتے ہیں نا۔“

وہ بڑی شگفتگی سے کہہ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا اچانک پانسا پلٹ لیا ہو۔ نائلہ پر اس کے لہجے کی تبدیلی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

”میرے خفا یا بیزار ہونے کی نہ تو کوئی تک نظر آتی ہے اور نہ میرے پاس اتنا ٹائم ہوتا ہے میں چائے لائی ہوں آپ کے لیے۔“ وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر باہر نکلنے لگی۔

”ارے نہیں۔ بالکل بھی طلب نہیں ہے۔ ویسے تو تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے کا لطف ہی کچھ اور ہو گا لیکن فی الوقت تمہاری خوبصورت گفتگو اور دلکش باتیں سننے کو میری سماعتیں مچل رہی ہیں۔ پلیز بیٹھو ناں۔“

”ہونہہ! فراڈی، چاپلوس، موقع پرست۔“ وہ دل ہی دل میں پھنکاری اس کے بظاہر حریفانہ لب و لہجے کے پیچھے چھپی غرض اس کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ کیسے رہ سکتی تھی۔ ایسے بناوٹی لہجوں کی حقیقت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

”دیکھیے جوادا احمد صاحب! آپ مجھ سے میری زبان میں ہی بات کریں تو بہتر ہو گا۔ میں ایسے لب و لہجے کی عادی نہیں ہوں۔“

”کیسی؟ تم کس قسم کے لہجے کی عادی ہو۔ کچھ بتاؤ سمجھاؤ گی تو جانیں گے ناں۔“ اس کے لہجے میں بدستور دلچسپی تھی۔ ”حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی بھی!“ وہ دل ہی دل میں عاجز آ گئی تھی۔ اسی لمحے امی اندر داخل ہوئیں۔

”السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ۔“ وہ انہیں دیکھتے ہی بہ سرعت اٹھ کر لپکتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

”بڑے عرصے سے سوچ رہا تھا جا کر سلام دعا لے آؤں۔ بابا جان بھی کہتے رہتے ہیں کہ آتے جاتے ان کی خیر خیریت دریافت کر لیا کرو۔ بہت دل تھا میرا آنے کو۔ لیکن آنٹی بس مصروفیات۔“ وہ اتنے پرجوش والہانہ لگاوٹ آمیز انداز میں ملا تھا کہ امی سچ مچ بہت مسرور ہو گئیں۔ بڑے چاؤ سے اسے کھانے پر رکنے کا اصرار کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

...اُٹھا رہیچا۔ نائلہ اندر ہی اندر تلملاتی غیض کھاتی رہ گئی۔

"پھر ارے ہو ناں پرنس رات پارٹی پر ڈیڈی نے بڑا زبردست انتظام کرایا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے ان کی پچوائس کا کتنی بڑھیا ہوتی ہے۔ بڑی اعلیٰ نسل کی بھوو"ڈر" کوالٹی "ہے"۔"

"ارے آئیں گے کیوں نہیں۔" جواد احمد نے ...ہامیانہ انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا اور بھی انتظام کیا ہے؟" اس نے ...معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ارے کیوں نہیں۔ فکر نہ کرو ہر طرح کا انتظام ہے۔" کامران کے ساتھ ساتھ وہ بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ آخر کو — کیوں نہ ہوتا کامران ایم پی اے کا بیٹا تھا جو لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا تھا۔ معمولی چیز تو نہیں تھا۔ لازمی امر تھا اس کاک ٹیل پارٹی میں ہر طرح کی "دلچسپی" کا سامان ہو گا اپنے مہمانوں کی پسند اور مزاج کے مطابق۔

دوسری سائیڈ پر اس کے گروپ کی پشت پر کھڑی نائلہ شاہ نے شدت غیض سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ...جھٹک کر اپنے اندر امڈنے والے قہر کو بمشکل دباتے ہوئے وہ راستہ کترا کر گزری تھی کہ اچانک جواد کی نظر اس پر پڑ گئی۔

"ارے ...نیل۔ رکو ذرا!" اعلیٰ درجے کی بے تکلفی اور "تعلق داری" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اُسے پیچھے سے پکارا تھا۔

نائلہ اس کے سوقیانہ طرزِ تخاطب پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی پلٹ کر ایک لمحہ دیکھے بغیر وہ ...بے نیازی سے متوازن قدموں سے آگے بڑھتی گئی۔

"...لے بھائی۔ اس کے تو گویا سر پر سے گزر گئی ...ری پکار۔" کامران نے ایک نظر جاتی ہوئی نائلہ پر ...ڈالنے کے بعد جواد کی طرف دیکھتے ہوئے گویا چھیڑا تھا۔ "...تو لفٹ۔ بھئی ادھر سے تو لفٹ کا سائن ملا ہے۔" ...نے گولڈ لیف کا پیکٹ فضا میں اچھالتے ہوئے ...زی جاری۔

"ویسے یار ہے۔ اے!" کامران نے سگریٹ کی راکھ سائیڈ پر جھاڑتے ہوئے پُر خیال نظروں سے اسے دیکھا۔ اسٹار گروپ کے اکثر ممبران اسے ——— جے اے کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔

"تیری اس "رشتہ داری" سے بن گیے گی۔ مطلب یہ کہ تیرے "ٹیسٹ" کی تو نہیں لگتی۔ کیا خیال ہے۔"

"نہیں ہے تو بنا دیں گے۔" جواد احمد بدستور اسے نظر انداز کر کے جاتی نائلہ شاہ کی پشت پر گھور رہا تھا۔

"لے آئیں گے اسے اپنے "معیار" پر بہت جلد۔ یہ اس قسم کی متوسط طبقے کی نمائندہ عام سی شخصیت والی لڑکیوں کے پاس اور کچھ نہ ہو مگر نخرا ضرور ہوتا ہے۔ اسی کو استعمال کرتی ہیں بےچاریاں۔" "مگر تا کیے۔ میرے شہزادے کے آگے تو چٹان بھی پانی ہے۔" ٹونی نے بلا شیری کے سے انداز میں جواد کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

ایمن بڑی پیاری لڑکی تھی۔ دودھیا شفاف رنگت، بادامی بڑی بڑی آنکھیں سہمی ہوئی ہرنی جیسی آنکھیں، بیلے کی کلیوں جیسے دانت اور سرخ پنکھڑی لب اس پر ستم بالائے ستم معصومیت اور غضب کی سادگی۔ وہ حال ہی میں پشاور سے آئی تھی ——— فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ فطرتاً بہت شرمیلی، لیے دیے رہنے والی چپ چاپ دبو سی لڑکی تھی۔ نائلہ شاہ کی اتفاقاً اس سے جان پہچان ہو گئی جو بعد میں دوستی میں بدل گئی۔ اکثر جب بھی ملتیں ہائے ہیلو ضرور ہوتی۔ اس کو چند ایک بار نائلہ کے ہمراہ دیکھ کر جواد شاہ اچھا خاصا چونکا تھا۔

"تم سے بڑی لگتی ہے اس ایمن گل بی بی کی!" ایک دن یونہی وہ استفسار کرنے لگا۔

"تو کیا ہوا۔؟" نائلہ نے حیران نظروں سے اس کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ کہاں تم کہاں یہ شعلہ و شبنم۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آہن وریشم کا امتزاج۔" وہ بڑے طلسماتی انداز میں مسکرایا تھا۔ اس کے مزاج کو سمجھ گیا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ سو بظاہر سپر ڈال کر دوستانہ انداز اپنا لیے تھے۔ حالانکہ اس کے کسی رویے کا نائلہ پر رتی بھر اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے وہی بلکہ سے لاپروا بے نیاز رویے تھے۔

"تعلقات کے لیے "ہم خیالی" ضروری تو نہیں ہوتی۔ بس ایک دوسرے کو برداشت کرنے، ایک دوسرے کو سننے سمجھنے کا حوصلہ ہو۔ اعتبار اور احترام کی زنجیر ہونا چاہیے۔ جس کے بغیر دنیا کا کوئی رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ کہ اعتبار و اعتماد و احترام و عزت خونی و جذباتی یا آفاقی ہر رشتے کی اساس ہوا کرتے ہیں۔ یہ نہیں تو کوئی ربط خالص اور پائیدار نہیں ہوا کرتا۔"

چند ایک بار نائلہ نے ایمن گل کو جواد احمد کے ساتھ بات کرتے دیکھا مگر دانستہ یا نادانستہ اس نے ایمن سے اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا کہ بہر حال یہ اس کا پرسنل معاملہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس نے ایمن کے رویوں میں واضح تبدیلی کے آثار دیکھے۔ اس کا معصوم بھولا بھالا مگن و مست چہرہ کشمکش اضطراب اور انتشار کی گرد سے اٹ گیا، اس کی ہرنی کی سی بادامی خوبصورت آنکھوں میں عجیب سی ویرانیاں اور وحشتیں سمٹ آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز سے کسی بات سے خوفزدہ ہو۔ اس میں واضح طور پر کمزوری اور نقاہت کے آثار جھلکنے لگے تھے۔

نائلہ نے اس کا تذکرہ بھی ایمن سے کیا۔

"کیا بات ہے ایمن! تم بہت مرجھائی سی پژمردہ سی اور الجھی الجھی لگ رہی ہو ان دنوں۔ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا۔؟" اس نے بڑے ہمدردانہ انداز میں دریافت کیا تھا۔

ایمن کچھ گھبرا سی گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ رنگ جیسے اڑ سا گیا۔

"نہیں تو۔" وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ہاتھ مسلتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔ "ایسی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"پھر اتنی بے چین سی، گم صم سی کیوں رہنے لگی ہو؟" نائلہ نے فطری سادگی اور بے ساختگی سے پوچھا۔

"تمہارا وہم ہے نائلہ! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کنی کترا کر بات کا موضوع کہیں اور لے آئی۔ نائلہ بھی بھول بھال گئی۔

پھر وومین ہاسٹل میں جیسے دھماکا سا ہوا۔ ایک غلغلہ سا مچ گیا۔ وارڈن میڈم ثریا منصور نہایت غضب ناک تھیں۔ ہاسٹل کی تمام لڑکیوں کو جیسے چپ لگ گئی ہو۔ ہر کوئی انگشت بدنداں کھڑا تھا پھر یہ سکوت ٹوٹا اور جس کے منہ میں جو کچھ آیا وہ کہتا چلا گیا۔

"اف خدایا! معصومیت کے پردے میں اتنی معصیت۔"

"کتنی نیک پروین بنتی تھی۔ سر پر چادر اوڑھ کے بھولے بھالے انداز میں چپ چاپ سی منہ پر خاموشی کی مہر لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ کیا خبر تھی اس کے بھی ایسے نکلیں گے۔"

"توبہ۔ توبہ اتنے شریف غیرت مند خاندان کی لڑکی اور وہ۔۔۔"

"دیکھو کیسے چپ چاپ سکتے کے عالم میں بیٹھی ہے۔ ارے بے عزتی تو ہو گئی اب بتاتی کیوں نہیں میڈم کو اس لڑکے کا نام۔"

"لگتا ہے اسٹار گروپ میں سے۔"

"ہش۔ ارے نام بھی نہ لو۔ کوئی ممبر ہی نہ سن لے اس کا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ایمن کی طبیعت ویسے بھی ان دنوں گری گری سی تھی، اس دن بھی وہ چھٹی پر تھی باقی لڑکیاں تیار ہو کر یونیورسٹی جا چکی تھیں۔ وارڈن دس ساڑھے دس کے قریب یونہی اس کی طبیعت پوچھنے اس کے کمرے میں آئی تو دیکھا وہ درد سے بے ہوش ہونے کو تھی۔ وارڈن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے قریبی ہاسپٹل سے لیڈی ڈاکٹر کو بلا لیا اور چیک اپ کے بعد جیسے ہی ڈاکٹر نے کچھ پریشانی کے عالم میں میڈم کی طرف دیکھا

Aneela Pakistanpoint

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت کچھ ہاں بننے والا ہے۔ آئی تھنک ایمن بیٹے

"جی..." انوار ... ن اور اس کے ساتھ گھبرائی ہو کھلائی
زبانے آگے کچھ نہیں سنا تھا۔ ان کی سماعتوں پر
کسی نے بم سا چھوڑ دیا تھا۔

پھر شام تک شام کے اخبار کی خبروں کی طرح
یہ ایک سے دوسرے کان میں پڑتا چلا گیا۔ سب
وں اپنی اپنی جگہ متحیر سے رہ گئے تھے۔ شکل وصورت
عادات و اطوار کے لحاظ سے ایمن گل قطعی اس
قسم کی نہیں نظر آتی تھی۔ معاملہ اعلا سطح تک پہنچا
اور پھر ایمن کو فی الفور ہاسٹل خالی کرنے کا نوٹس
مل گیا۔ وہ جاتے سمے تک کسی مردے
کی طرح پُرسکوت تھی۔ نائلہ نے جب یہ خبر سُنی تو کلیجہ
تھام کر رہ گئی۔ اسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں
آیا۔ وہ ہراساں سی ہو کر افتاں و خیزاں ایمن کے
پاس آئی۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔ اسے
دیکھا تو ضبط کا یارا نہ رہا۔ اتنے دنوں کے رُکے
ہوئے آنسو بے دریغ بہا ڈالے۔
نائلہ کے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے لتاڑے ڈانٹے
یا اس کے ساتھ ہمدردی کرے۔

"مجھے تم نے ہلا ڈالا ہے ایمن۔ میں۔ میں سوچ
بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔ تم نے میری
دوستی کا مان۔ میرا اعتبار توڑ ڈالا ہے ایمن۔" وہ
روہانسی ہو گئی تھی۔ ایمن کچھ بھی نہ بول پائی اور زیادہ
بے قراری سے ہچکیاں لے لے کر بلکنے لگی۔
"میں نے تمہیں اس قسم کی لڑکی تو نہیں سمجھا تھا۔
کیا میرا مشاہدہ غلط تھا ایمن؟ کیا تم نفس کی اتنی کمزور
نکلیں۔ تم تو بہت معصوم تھیں۔ بہت سادہ اور بھولی
بھالی۔ تمہیں اپنے غیرت مند والدین اور دو بڑے
بھائیوں کا خیال نہیں آیا۔ جنہوں نے تم پر اعتبار
کر کے تمہیں تمہارے شوق کی خاطر اتنی دور بھیجا
اور تم نے۔ تم نے ان کی عزت خاک میں ملا دی۔
خاندان کے وقار پر دھبہ لگا دیا۔"
نائلہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو دھنک

کر رکھ دے۔ مٹھیاں بھینچے ہوئے وہ انتہائی
کرب انگیز اور غم و غصے سے لبریز انداز میں کہہ
رہی تھی۔
ایمن کچھ ساعت بعد اُٹھی اور اس کے قدموں
سے لپٹ کر بے تحاشا رونے لگی۔ نائلہ کے حواس مختل
سے ہونے لگے۔
"نائلہ۔ نائلہ۔ مجھے اور لعن طعن کرو۔ جھنجھوڑو۔
مار لگاؤ۔ میں اسی قابل ہوں۔ میں اندھی ہو گئی تھی۔
اس کے طلسم نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔ مجھ پر جادو
ہو گیا تھا۔ کچھ نظر ہی نہ آیا اس کی کشش کے حصار
میں۔ اس نے کہا یونیورسٹی میں کھل کے بات کرنا
مناسب نہیں۔ یہاں وہ تنہائی نصیب نہیں جہاں
دو پیار کے متوالے دل کے اندر موجزن جذبات
کا اظہار کر سکیں۔ چلو کہیں چلتے ہیں ایسی جگہ جہاں
صرف تم اور میں ہوں گے۔ جہاں کسی کا خوف ڈر یا
مصلحت آمیز گریز کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میرے
ایک بہت اچھے دوست کا فلیٹ ہے یہاں شہر
میں وہ صبح سویرے کا نسکالرات گئے واپس آتا ہے
کل میں اس سے چابی لے لوں گا۔ تم صبح کا پہلا پیریڈ
اٹینڈ کرنے کے بعد یونیورسٹی سے نکل آنا۔ میں باہر
ہی ہوں گا کچھ فاصلے پر جگہ تمہیں بتا دوں گا وہاں
آ جانا۔ پھر تمہیں لے کر اپنے دوست کے فلیٹ
پر چلیں گے۔ وہاں اطمینان سے حال دل کہیں گے
اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کر لیں گے۔ مجھے
جان و دل سے اس کی بات پر اس کی ذات پر اعتماد
تھا۔ سو بے جھجک چلی آئی۔ کہ یہ جو مجھ پہ اس طرح
مرتا ہے میری اتنی ستائش کرتا ہے میرا اتنا دم بھرتا
ہے۔ میرے لیے ضرور سنجیدہ ہی ہو گا۔ فلرٹ نہیں
کرے گا میری عزت کو اپنی عزت سمجھ کر اس کی
حفاظت کرے گا۔ مجھ سے زبردستی نہیں کرے گا۔
اور نائلہ۔ نائلہ واقعی۔ اس نے میرے ساتھ
زبردستی نہیں کی۔ وہ دھیرے دھیرے مجھے اپنے
پیار کے عملی اظہار کی برسات میں اس طرح بھگوتا
چلا گیا۔ اس طرح مجھ پہ دیوانہ وار نثار ہوتا چلا گیا کہ میری
سوکھی کھیتی جیسی پیاسی روح پودی کی طرح سیراب ہونے

WWW.PAKSOCIETY.COM
Aneela PakistaniPoint

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو ہمک گئی۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کس طرح پھسل گئی کے عالم میں، میں نے خود کو جذبات کی لہروں کے حوالے کر دیا اور اس نے مجھے اپنے پیار کی زنجیر میں باندھ کر برباد کر دیا۔ ستم تو یہ ہے کہ اس کی سحر انگیز محبت اور طلسماتی شخصیت کی کشش نے مجھ سے اپنی بربادی پر ماتم کناں ہونے کا احساس بھی چھین لیا۔ میں نے خفا ہونا بھی چاہا تو اس نے تھپک کر کہا "ارے پیاری یہ تو محبت میں ہوتا ہے، یہ میری محبت اور جذبات کا اظہار ہے تو ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر دل کو قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

میں سمجھتی رہی اتنی دیوانگی دکھاتا ہے میرے بغیر اس کی کیسے گزرے گی اب۔ شادی تو ہونا ہی ہے ابھی سے، میرے روپ کا سونا اور حسن کی چاندنی اسی کے لیے تو ہے۔ سو اس کے اشاروں پہ ناچتی رہی۔ پھر وہ کئی بار مجھے دوست کے فلیٹ پر لے کر گیا۔ پھر ایک دن میں نے شادی کا ذکر چھیڑا تو اس کا جیسے چہرہ ہی بدل گیا۔ کہنے لگا تم لڑکیاں عجیب چیز ہوتی ہو۔ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں، اتنا پیار کرتا ہوں، کیا یہ کافی نہیں شادی تو محض کاغذی کارروائی ہوتی ہے اور میں نے کب تم سے یہ کہا تھا عجیب پاگل لڑکی ہو۔ اور۔ اور نائلہ پھر جیسے میرے سامنے میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ ہر شے مجھے گھومتی محسوس ہوئی۔ اس تلخ حقیقت نے مجھے گم صم کر دیا تھا۔ میری روح کو چیر ڈالا تھا۔"

وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھے دھیرے دھیرے خواب کے سے عالم میں حقائق کی بند پٹاری کھول رہی تھی۔ اور نائلہ شاہ ایک شاک کی سی کیفیت میں بغیر پلکیں جھپکائے بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کون تھا وہ۔۔؟" اس کی آواز جیسے کسی اندھے کنوئیں سے ابھری تھی۔ لہجے میں ایک سنسنی خیز سرسراتا سا ارتعاش تھا۔ جواب میں اس نے گہری سرد آہ بھری۔

"بربادیوں میں ساتھ کسی آشنا کا تھا۔ اس قصے کو چھوڑو۔ نائلہ پلیز مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تم جیسی شفاف دل والی اتنے سچے موتیوں جیسے کردار کی حامل لڑکی کو دھوکہ دیا۔ میں۔۔۔۔"

"مجھے اس کا نام بتاؤ ایمن۔ شاید میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ اس کے لہجے میں شدید بے چینی تھی۔ ہتھیلیاں اضطراب کے عالم میں کھول اور بند کر رہی تھی۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا نائلہ۔" ایمن کے چہرے پر ویرانی کے سائے تھے۔

"مجھ جیسی نفس پرست لڑکیوں کا شاید یہی انجام ہوا کرتا ہے۔ میں نے نادانی کی جو تمہارے جیسی ہمدرد اور غمگسار لڑکی سے اس بارے میں کوئی مشورہ یا رائے نہ لی، اور آنکھیں بند کر کے اس اندھی راہ پر چل نکلی۔ یہ بھی نہ پلٹ کر سوچا کہ اس تعلق کا انجام موت سے بھی بدتر ہو گا۔"

"ایمن۔" کسی نامعلوم اندیشے نے نائلہ کے دل کو لرزا کر رکھ دیا۔ اس نے تیزی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گی ایمن۔ دیکھو مجھے بتاؤ وہ کون ہے شاید میں اس کو قائل کر سکوں۔ وہ تمہیں عزت سے اپنا لے۔"

جواب میں ایمن ہنسنے لگی۔ اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ اتنا کہ نائلہ پریشان سی ہو کر اس کی صورت تکنے لگی۔ پھر وہ اٹھی اپنی چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں اور چادر لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ نائلہ گومگو کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ وہ چند قدم بڑھا کر اس کے قریب آئی اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور اسے خود سے لپٹائے لپٹائے رقت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔

"تمہارے جذبے تمہارے خلوص اور تمہاری محبت کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ تمہارے ہمدردانہ خلوص نے سرتاپا مجھے احسان کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ تم نے مجھے بہت پیار دیا۔ یہاں کے اجنبی ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں مدد دی۔ میں کم ظرف اور بے توقیر تھی جو تمہارے خلوص کے میٹھے چشمے سے فیض یاب ہونے کے بجائے پیاس کے عالم میں ایک سراب کے پیچھے چل پڑی۔ نائلہ تمہارا بے حد شکریہ۔ مگر اس کا نام جاننے یا نہ جاننے سے کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑنی نہیں پڑے گا۔ اب چھونا اب ناممکن ہے۔ وہ تو ایک سورج ہے جذبات کی حرارت اور تپش سے بھرپور۔ ایک محبت کی چاندنی برساتا ہوا۔ ایک ستارہ ہے اپنی کشش سے راہی کو منزل کی سمت چلنے پہ مائل کرنے والا۔ اس کے سب ہی مگر وہ کسی کا نہیں بنتا ہے کہ آسمان پر چمکنے والے زمین والوں کے دل پر تو چمک سکتے ہیں۔ اپنی روشنی کی حدت اور برودت سے زمین والوں کے جسم و جان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں مگر ان کے لیے آسمان سے زمین پر اتر کر ان کی مٹھی میں بند نہیں ہو سکتے۔ وہ تو جادوگر ہے لفظوں کا، باتوں کا، آنکھوں سے طلسم کرتا ہے اور ہونٹوں سے پھول برسا کر مقابل کے تمام ہوش و حواس چھین لیتا ہے اس کی قوتِ مدافعت کو اس طرح سلب کر لیتا ہے کہ لٹنے والا بھی اس پر گمان و شکایت کے طومار نہیں باندھ پاتا۔ چھوڑو اس قصے کو نائلہ۔ خوش رہنا اور میرے لیے دعا کرنا۔"

وہ روکتی رہ گئی مگر امین گل کو جانا ہی تھا وہ چلی گئی۔ اور محض ایک ہفتے بعد پشاور میں اس کے ملاقاتی ہی کے رہنے والے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے سجاد ملک کی زبانی پتہ چلا کہ امین نے اپنے بھائی کے ریوالور سے اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کر لی ہے۔

نائلہ کے اعصاب گویا برف بن گئے۔ وہ تو کتنے دنوں سے بے چین تھی۔ اس کا ایک ایک پل نامعلوم سے دباؤ تلے پڑا دھک رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کچھ ہونا ہے، کچھ ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اور ہو کر رہے گا۔ چشمِ تصور میں بار بار امین کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ سماعت میں اس کی سسکیاں ہچکیاں اور اس کی بھرائی آواز کا زیر و بم گردش کر رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا، ایک ایک لفظ اسے دہکتا ہوا انگارہ محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ کیسا انصاف ہے، اس مقام تک لے جانے والا وحشی درندہ کیا حیوانیت کی سطح سے بھی گر گیا ہے۔ کیا اس کے دل کا لوہا زنگ آلود نہ ہوا ہوگا۔ کیا اس کا "اندر" نہیں پیا ہوگا۔

کتنے ہی دنوں تک اس کے اندر بے نام سی منتشر سوچوں اور جذبوں کا بے چین غم زدہ سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔

"یار! یہ شرمیلی بھولی بھالی، دبی دبائی لڑکیاں، تو اظہار کے معاملے میں بالکل "مٹس" ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے گویا آپ مری کی برف سے کھیل رہے ہیں۔ کوئی جان ہی نہیں ہوتی ان میں۔ نہ جوش نہ سرگرمی نہ واضح ردِ عمل۔ کچھ لطف ہی نہیں رہتا۔ خوبصورتی کو کیا چاٹنا ہے، جب اس کے اظہار کا سلیقہ ہی نہ ہو۔ ادا و ناز اور لہجے کی حدت ہی نہ ہو۔ بھلا چپ چاپ برف کی ڈلی جیسے احساس سے کوئی کب تک دل بہلایا کرے۔"

جواد احمد کا لہجہ اچھا خاصا بے زار کن اور جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ گزرتے گزرتے ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

"تو تم کو کیا کمی ہے پرنس۔ تمہارے لیے تو بہت پڑے ہیں "ٹارگٹ" تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔" ٹونی نے کندھے پر ہاتھ مار کر خوشامدی انداز میں کہا تھا۔

"چلو۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کو یونہی سہی۔" جواد نے جیسے خود کو تسلی دی۔

"ٹونی! تمہیں سر ریاض بلا رہے ہیں۔" پاس سے گزرتے کسی کلاس فیلو نے کہہ کر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ ٹونی جواد سے "گڈ بائے" کہہ کر لیب کی طرف چلا گیا۔ جواد درخت کی ٹہنی ہاتھ سے ادھر ادھر جھلاتے ہوئے بے فکرے سے انداز میں ہونٹوں سے سیٹی بجاتا ادھر ادھر طائرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جب وہ یکدم پیچھے سے نکل کر اس کے آگے عین سامنے ——— آن کھڑی ہوئی اور چپ چاپ سپاٹ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اوہ۔ آؤ ڈیئر۔ میں تمہاری ہی کمی محسوس کر رہا تھا۔ یار بوریت ہی بہت ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے چلیں نان کہیں۔ میرا مطلب ہے تمہارے گھر یا میری مانو تو میرے ہاں، بابا جان بڑے عرصے سے کہہ رہے تھے کسی دن تمہیں لے کر آؤں، ملنا چاہ رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے تم سے۔"
اسے دیکھتے ہی وہ ٹہنی چھوڑ کر سیدھا ہو گیا تھا اور بڑی شگفتگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا۔ جواب میں وہ کچھ نہیں بولی، ایک ٹک اس کو دیکھتی رہی۔

"کیا میں آج بہت اچھا لگ رہا ہوں۔" وہ اس کی نظروں کے جمود سے کچھ الجھ سا گیا تھا۔ تاہم اپنی دلی کیفیت چھپانے کو بڑے دلکش سے انداز میں مسکرا کر سر کو خم دیا تھا۔

"تو تمہارے متعلق ہی کہا تھا امین نے کہ تمہارے سب ہیں لیکن تم کسی کے نہیں بنتے ہو۔ ہے ناں! وہ تمہاری جادو اثر ساحرانہ اداؤں کا شکار ہوئی تھی ناں۔ تمہاری کشش کی لہروں نے اسے موت کے جزیرے پر لا پھینکا تھا۔ ہے ناں۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس پر نظریں جمائے جیسے کسی روبوٹ کی مانند میکانکی انداز میں بول رہی تھی۔ اس کا حملہ اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ جواد کو حفاظتی تدابیر سوچنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا تھا۔ اس کا رنگ ایک لمحے کو واضح طور پر بدلا۔ مگر وہ جہاندیدہ، تجربہ کار بندہ تھا دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھال کر سر جھٹکتے ہوئے، ہنس رہا تھا۔

"پاگل نہ ہو تو۔ کیا اول فول کہے جا رہی ہو چلتی ہو گھر کہ نہیں۔ پھر بتاؤ ناں۔"

نائلہ کچھ ساعت یونہی ساکت نظروں سے اُسے دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں میں جیسے انگارے سے اتر آئے۔

"تو گویا تم ہی تھے، میرے اندر بھی یہی الارم بجا تھا۔ بجا طور پر ساری تفصیل سن کر تمہارا ہی نام آیا تھا کہ تم ہی ہو جو اتنے گھناؤنے اور بدبودار کردار کے مالک ہو سکتے ہو۔" اس کے لہجے میں ننھی ننھی جیسے چنگاریاں سی برسنے لگیں۔

"کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔" وہ ناراض ہونے لگا۔

"جواد احمد۔" اس نے دانت پیستے ہوئے آہستگی سے اور وحشت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"میں حیران ہوتی ہوں۔ تم کیسے انسان ہو، اندر سے کتنے بدصورت اور بد ہیئت ہو، مگر شکل سے نہیں لگتے ہی کب ہو۔ ایک انسان اتنا شنیع عمل کر سکتا۔ ایک انسان اتنا تعفن زدہ نہیں ہو سکتا۔"

"نائلہ۔ وس از ٹو مچ۔" اس کے لہجے کی تحقیر اور سرسراہٹ نے جواد احمد کو ایک لمحے کو اندر سے بڑی طرح ہلا کے رکھ دیا تھا۔

"تم اتنے مکروہ اور کریہہ نظر ہو کہ تم پر کوئی تھوکنا بھی پسند نہ کرے۔ میں تم پر مرنے والوں کی ذہنی حالت پر متعجب ہوں۔ وہ یقیناً اندھے تھے جنہیں تمہارے اندر کی بدصورتی اور ہیبت کذائی سے نظر نہیں آتی۔ تم تو کسی قابل ہی نہیں ہو۔ ذرا اپنے آپ کو آئینے میں تو دیکھنا۔ تم اپنے آپ سے خود ہی ڈر جاؤ گے۔"

"آپ حد سے بڑھ رہی ہیں نائلہ شاہ۔" غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ نتھنے بری طرح پھڑکنے لگے۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں گواہ تھیں کہ وہ اپنے ضبط کو آزما رہا ہے۔

"اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں آپ کی طرف بڑھنا اپنی توہین سمجھتی ہوں جواد احمد۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر تڑخ کر دو ٹوک جواب دیا۔ اور پھر کھٹا کھٹ کرتی دوسرے پیج کی طرف مڑ گئی تھی۔

"کچھ لوگ کچی عمر میں ہی پکی گولیاں کھیلنا سیکھ جاتے ہیں۔ یہ سب وقت کی گردش کا کمال ہوتا ہے۔" حفیظ صاحب نے اس کی بات پر محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا تھا۔

"بہت خوب۔ بھئی آپ کے متعلق تو یہ بات سو فیصد درست تسلیم کی جاتی ہے۔ اتنی کم عمری جسے بالی عمریا کہتے ہیں۔ اس میں ایڈورٹائزنگ کمپنی کھولنا اور اسے کامیابی سے چلانا بڑے اچنبھے کی بات لگتی ہے۔ تم تن تنہا میدان مار رہے ہو، ہم بڈھوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔"

بڑی خوشدلی تھی حفیظ صاحب کے انداز میں۔ نائلہ نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کی دھن میں ہلکی سی دستک دے کر کمرے کے اندر آ گئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرانی تھیں۔" عادت ہاتھ میں پکڑے کاغذات کی سمت متوجہ معروف معروف سے انداز میں چادر نما دوپٹہ کاندھوں پر برابر کرتے ہوئے وہ اپنے ہی حسابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ حفیظ صاحب کے مقابل بیٹھی شخصیت کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکی تھی اور نہ ہی پلٹ کے اس کا کوئی ارادہ تھا۔ البتہ اس کی طرف پشت کیے بیٹھے براؤن چیک دار کوٹ میں ملبوس شخص نے اچانک پلٹ کر دیکھا تھا۔ جیسے کرنٹ سا کھا کر مڑا ہو۔ نائلہ کے ذہن میں بھی ایک جھماکا سا ہوا۔

"ان کی پرسوں کی کرانی میں تین۔"

حفیظ صاحب جو کہ اس ٹریولنگ ایجنسی کے مالک تھے انہوں نے اپنی توجہ اس کی سمت مبذول کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے سر۔" اس نے جواد احمد کے کہتے ہوئے لب دیکھ لیے تھے، سو ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر وہ برق رفتاری سے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

اپنی سیٹ پر آ کر بجتے فون کی سمت متوجہ ہو کر میسج نوٹ کرنے اور ریسیور رکھنے تک وہ بڑے الجھے الجھے سے انداز میں اس اچانک تصادم کے بارے میں سوچتی رہی۔ آج ایک عرصے بعد ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس دن کے واقعے کے بعد یونیورسٹی میں پھر دونوں جگہ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ دوبارہ آیا ہی نہیں، اور یونیورسٹی میں آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ خود ہی ۔۔۔ آئی آر ڈیپارٹمنٹ کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس واقعے کے بعد دوبارہ نہیں آیا۔ کبھی کسی جگہ اچانک مل بھی گئے تو دونوں ہی کترا کر نکل جاتے تھے۔

پھر امتحانات کے زمانے آئے۔ پیپرز ہو گئے رزلٹ بھی نکل آئے۔ سب اپنے اپنے کاروبار زندگی میں مصروف ہو گئے۔ اس نے حفیظ ٹریولنگ ایجنسی جوائن کر لیا۔ یہاں کام کرتے ہوئے اسے تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ سہالی اُدھر ۔۔۔ تو وہ انگلینڈ چلی گئی تھی شوہر کے ساتھ ۔۔۔ چلے شادی کے بعد سے بچنے کے لیے جاب شروع کر دی تھی۔ سو نائلہ ایڈجسٹ ابھی طبیعت کے بندے تھے کام کرنے والے کی قدر کرتے تھے۔ وہ سر پر سوار ہونے اور رعب داب سے کام لینے والے مالکوں میں سے نہیں تھے۔ بڑے خوش بشاش اور بااخلاق انداز میں اپنے ورکرز کے ساتھ پیش آتے تھے۔ سو نائلہ کو یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

"جلیل صاحب! کاردار صاحب نہیں آئے ابھی تک۔" اس نے منیجر کی خالی سیٹ دیکھ کر قلم کاغذ میں الجھے عبدالجلیل میاں آف نوانگلی سے دریافت کیا۔

"وہ خاردار شاب۔" جلیل میاں نے سر اُچکا کر چشمہ سکیٹر بس۔" وہ کام میں کو آنے لگی ہے۔ شالا اب تو جیسے نیند کا ہو کے رہ گئی ہے اے۔ ادھر جنج اختر شاب جرا جرا بعد اس کے بارے میں پوچھتی ہے کہاں گئی ہے کب آئے گی۔ شالا ام کو بتا کیں یہاں کے گئی اے ام بولا شاب وی ہیلو ٹو آئیڈیا وہ بڑ وڑج ہی گوج رہ کلب کو آنے لگے ٹائم پے۔ سالا موٹا تو جیسے خبید کا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ادھر حفیظ اختر صاحب ذرا ذرا دیر بعد اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں کہ کہاں گئی ہے کب آئے گی۔ سالا ہم کو بتا کے تھوڑی گیا ہے۔ ہمیں کوئی آئیڈیا نہیں ہے کہ وہ کہاں جاتا ہے) جلیل میاں با آواز بلند بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گئے تھے۔

ابھی جو کاردار صاحب یہاں ہوتے تو دونوں میں اچھا خاصا گھمسان کا رن پڑ جاتا۔ "الو کا پٹھا کہیں کا۔ بات کرنے کی تمیز ہی نہیں سالا جنس ہی تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔" وہ اس پر چڑھائی کر دیا کرتے تھے۔ نائلہ بیچ بچاؤ کراتی۔

"کاردار صاحب ان کی بولی ہی ایسی ہے۔ آپ خیال نہ کیا کریں۔" دل ہی دل میں البتہ وہ بھی خوب محظوظ ہوا کرتی تھی۔ خصوصاً جب وہ کاردار صاحب کو "خاردار" بنا دیا کرتا تھا۔ بقول اس کی کولیگ عشق نقوی کے "نادانستگی میں ہی سہی، لیکن جلیل میاں بالکل صحیح نام سے مخاطب کرتے ہیں انہیں۔"

کاردار صاحب کا مزاج بھی تو نیم چڑھے کریلے جیسا تھا۔ شادی شدہ تھے، دو چھوٹے بچے بھی تھے۔ مزاج کے فطرتاً سخت، کم گو اور ترش تھے۔ تیوریاں شاید ہی کبھی پیشانی سے جدا ہوئی ہوں۔ جلیل میاں کبھی کبھار چوری چوری سے کاردار صاحب کی طرف دیکھ کر انہیں سنانے کو نا ملہ —— سے کہا کرتے۔

"جرور آج تو غاردار شاب اپنی بیوی سے زگھڑا بجھڑا کر کے آئی ہے۔ ام سرط لگانے کو تیار ہے۔"

(ضرور آج تو کاردار صاحب اپنی بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہیں۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں۔)

جلیل میاں بنگالی تھے۔ گہرے سانولے مرنج مرنجان ہر دم کچھ کرنے کو بے تاب۔ اپنے ہی حسابوں میں لگے رہتے تھے۔ بنگالی "ج" کو "ز" اور "ز" کو "ج" بنا دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح "س" کی جگہ "ش" مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر بنا دینا بھی انہی کی زبان کا کمال ہوا کرتا ہے۔ جب اپنا تعارف کرانا مقصود ہوتا۔ بڑے فخر سے سینے پر ہاتھ رکھ کر مخاطب سے ہم کلام ہوتے۔

"ام ذلیل میاں ہیں۔ ذلیل میاں آف نواکھلی۔" اپنے علاقے کا نام بتانا وہ ضروری خیال کرتے تھے۔

"جی ہاں، یہ وہاں سے ذلیل ہوتے ہوتے یہاں پہنچے ہیں۔" کاردار صاحب موجود ہوتے تو ضرور تائیدی انداز میں نمک پاشی کرتے۔

"پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے"

"السلام علیکم۔" اسی دم کوئی اس کی ٹیبل پر آن رکا تھا۔ "کیا حال ہیں جناب عالی۔"

اس کا دل ایک دم اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں ہتھیلیاں ٹیبل کے کناروں پر جمائے اسٹائلش سے انداز میں جھکا اس کے چہرے پر نظریں جمائے وہ انتہائی گرمجوشی اور بشاشت انداز میں اس سے مخاطب تھا۔ لہجے میں پرانی تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ غالباً بھول چکا تھا یا بھلا دیا تھا۔

"یوں نظروں میں حیرانی کیوں سمیٹ لی ہے۔ بھئی دل کی آنکھ سے دیکھیے کہیں کونے کھدرے میں جواد احمد کا نام ضرور چمکتا نظر آئے گا۔" اس کا لہجہ بھی مسکرا رہا تھا۔ غالباً اس اتفاقی ملاقات پر بہت خوش تھا۔

وہ دل ہی دل میں تلملا رہی تھی۔ متعدد ایسا تھا کہ وہ ایک بھی نادیبی لفظ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی یہ اس کا آفس تھا، رپوٹیشن کا سوال تھا۔ اور جو کسی نے بات کرتے دیکھ لیا تو بتنگڑ بننے میں کیا دیر لگے گی۔ وہ اس پر توجہ دیے بنا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"ویسے تم یہاں کہاں اور کب سے؟"

"کافی عرصے سے ہوں۔" اس نے دزدیدہ نگاہوں سے عینک کی کمانی درست کرتے جلیل میاں کی طرف دیکھ کر اضطراری انداز میں انگلیاں مسلتے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"کمال ہے، مجھے خبر ہی نہیں۔" وہ جیسے زور سے کہنے لگا۔ "میں بھی ادھر قریب ہی ہوتا ہوں تمہارے اس پلازے کے ساتھ والا پلازہ چھوڑ کر اس سے اگلا پلازہ ہے جو تھا فلور ہے دس قدم کا فاصلہ بھی نہیں ہو گا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ آؤ ناں ادھر۔ تمہارا اپنا آفس ہے۔" اس نے کارڈ میز پر ڈال دیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔" اس نے بے دھیانی کے عالم میں جلدی جلدی کہا۔ وہ اس کے جملوں پر کب غور کر رہی تھی۔ نظریں جلیل میاں سے ہوتی ہوئی سامنے داخلی دروازے سے اندر آتے کاردار صاحب پر جمی تھیں۔ اس کی جان پہ بن گئی۔ کس طرح اس کو یہاں سے دفعان کرے۔

"اچھا جواد صاحب! اس وقت میں بزی ہوں پھر بات ہو گی نا۔" اس کو ٹالنے کو وہ بعجلت کہہ کر رکی نہیں بلکہ فائلیں اٹھا کر تیزی سے حفیظ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ فی الحال اس سے بہتر ذریعہ فرار اور کوئی نہیں تھا۔

وہ بھی کچھ توقف کے بعد سر جھٹک کر باہر کی سمت چلا گیا تھا۔

"یہ صاحب کس سلسلے میں تشریف لائے تھے؟" وہ واپس آئی تو کاردار صاحب نے یونہی پوچھ لیا۔

"یہ۔ حفیظ صاحب سے ملنا تھا، مجھے تو خبر نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ اندر سے لرز رہی تھی۔ کھلاسی ضرور رہی تھی کہیں دیکھ ہی نہ لیا ہو مجھے اس سے بات کرتے۔

...خص (توبہ)۔ اس کے آگے
...دھوکا باز اور شاطر۔ پاپی بھرے
...ان کے بیچ میں منفرد تھا۔
"آپ جانتے ہیں اسے؟" اس نے دھڑکتے دل

...کون نہیں جانتا، پورے شہر میں بدنام
...کرتوتوں کی بدولت۔ بڑے بڑے امراء
...کا رسیا، رئیس زادوں کی رنگین محفلوں میں
...جام پیالہ بنا ہوتا ہے۔ یہ اس پلازہ
...پلازہ چھوڑ کر "سادات پلازہ" کے آگے
...گروپ آف کمپنیز" کا بورڈ لگا ہوا دیکھا ہی
...یہی چلا رہا ہے کوئی چھ سات ماہ سے
...بڑے بڑے لوگوں کی عالی شان گاڑیوں کا
...روز لگا رہتا ہے۔ بڑا شاندار دفتر سیٹ کیا
...اس نے، بڑے تعلقات ہیں، مگر شریف لوگ
...دور کی سلام دعا ہی رکھتے ہیں۔"
...حفیظ صاحب سے اس کا کیا واسطہ ہے؟" اس
...ہوا۔
...ہوتا ہے اپنی ایجنسی کا، اسی سلسلے میں
...ان دنوں۔ مجھے بھی بھیجا تھا ایک دوبار
...نے کام کے لیے اس کے پاس۔ تبھی
...دفتر کی شان و شوکت دیکھی تھی۔ ویسے تم محتاط
...لڑکیوں کے معاملے میں بہت بدنام ہے یہ۔
...ایک نئی بنی سنوری حسین تتلیاں
...پلازہ" کی سیڑھیاں چڑھتی اترتی نظر آتی
...ماڈلنگ کے لیے تو کوئی جاب کے چکر
...دوستی کے بہانے۔ جادوگر ایسا ہے،
...مرد و زن کو مٹھی میں کر لیتا ہے۔" ان
...اس کے کردار کے متعلق بہت حقارت

...کیوں منہ لگانے لگی اسے؟" وہ دل
...کاردار صاحب کی بتائی گئی معلومات سن

...کر رہی تھی۔ "تو بھی اس سے تعلق رکھ
...اپنے شفاف دامن پر دھبہ لگانا ہے؟"
...اختیار میں کب ہوتا ہے، چند دن
...تب جلیل میاں نے اس کی آفس

...دو دن کی اپنی چھٹی کے دوران کی کارگزاری سناتے ہوئے بتایا۔

"دونوں دن آپ کے فون آتے رہے کوئی احمد شاب تھی۔ بہت پوچھ رہی تھی آپ کا۔"

"اُف اللہ۔" وہ دل ہی دل میں سراسیمہ سی ہو گئی۔ شومئی قسمت تھوڑی دیر بعد اس کے ٹیبل کے فون کی بیل بج اٹھی۔ اٹھایا تو ادھر سے وہی تھا۔

"ارے بھئی، کہاں غائب ہو، انگلیاں فگار ہو گئیں ہماری تو تمہارا نمبر ڈائل کر کر کے۔"

"کیوں آپ کو کوئی کام تھا؟" ارد گرد کے ماحول پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے خون کے گھونٹ پی کر۔

وہ دھیمے انداز میں بات کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"چھوڑو بھی یار۔ کیا اب عزیزوں سے ملاقات کے لیے بھی کام کی بیخ لگانا ضروری ہوتا ہے۔" بڑا بے تکلفانہ انداز تھا۔ وہ تاؤ کھا کر رہ گئی۔

"ایسا ہے کہ میں سخت بزی ہوں اس وقت۔" اس نے کچھ دور بیٹھے کاردار صاحب کی انگلیوں میں دبے قلم کی ادھر ادھر حرکت پر نظریں جمائے جمائے دانت بھینچ کر کہا اور پھر فون رکھ دیا۔ شام کو وہ نکلنے کی تیاریوں میں تھی۔ اپنی دراز وغیرہ لاک کر کے دوسری سائیڈ کی الماری میں گھسی فائلیں اوپر نیچے رکھ رہی تھی۔ جب جلیل میاں نے پکار لگائی۔

"مس نیلہ آپ کا فون آئی ہے۔"

"کون صاحب ہیں؟" اس کے ہاتھ ٹھٹکے۔

"کوئی احمد شاب اے۔"

"ان سے کہہ دو، وہ نکل چکی ہیں۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد بالآخر اس نے دبے دبے انداز میں کہا۔

جلیل میاں نے حکم کی تعمیل کی۔ "اے احمد شاب نیلہ بی بی ابھی شوٹی (چھٹی) کر گیا ہے۔ جی آں۔" انہوں نے فون رکھ دیا۔

نائلہ کو خدشہ تھا کہیں آفس ہی نہ چلا آئے، سو وہ بجلی کی سی تیزی سے الماریاں بند کر کے چابیاں سیکورٹی گارڈ کو دے کر آناً فاناً آفس سے نکل گئی تھی۔

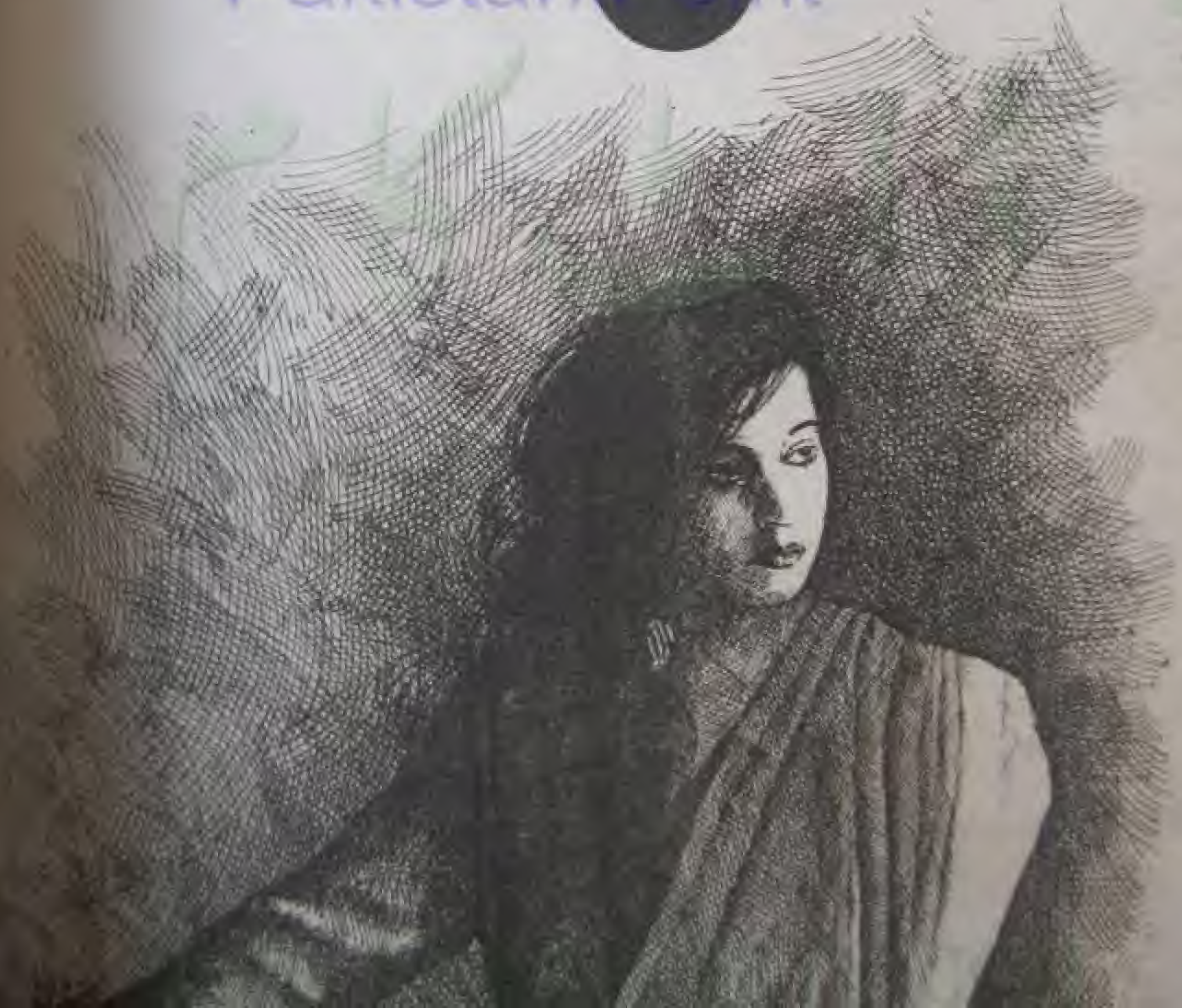
باقی آئندہ

جواد احمد مردانہ دلکشی کے حامل بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی میں وہ سب کچھ پایا تھا جو ان کی خواہش تھی۔ مادی آسائشوں اور دولت کے پیچھے۔
انہوں نے تمام اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیا تھا۔
لیکن آج ایک عمر گزار کر وہ حسابِ سود و زیاں کرنے بیٹھے تھے تو انہیں پتا چلا تھا کہ سب کچھ پانے کے

شازیہ چوہدری

زندگی دھوپ گھنا سایہ

Aneela
PakistaniPoint



باوجود وہ تہی داماں تھے۔

جواد احمد اپنے والد کے ایک دوست سے ملنے گئے تو وہاں نائلہ شاہ کو دیکھ کر چونک پڑے۔ نائلہ جواد ان کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ نائلہ بھی انہیں دیکھ کر بہت حیران تھی کیونکہ جواد احمد کا اسٹار گروپ یونیورسٹی میں بہت بدنام تھا۔ اس گروپ میں بگڑے ہوئے رئیس زادے، فیشن زدہ لڑکیاں اور [illegible] کے شکار لوگ شامل تھے۔ لڑکیاں جواد احمد کی شخصیت پر مرتی تھیں لیکن نائلہ شاہ نے کبھی انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

نائلہ نے جواد احمد کی بے راہ روی کے نمونے دیکھے تو اس کی نفرت اور بڑھ گئی۔ نائلہ کی روم میٹ اور عزیز دوست ایمن بھی جواد احمد کے چکر میں آکر اپنی عزت گنوا بیٹھی۔ اسے ہوسٹل سے نکال دیا گیا اور ایک دن خبر آئی کہ وہ خودکشی کر کے یہ جہان چھوڑ گئی۔

تعلیم مکمل کر کے نائلہ شاہ نے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر لی۔ ایک دن جواد احمد حیدر صاحب سے ملنے آئے تو نائلہ کو دیکھا۔ انہوں نے نائلہ کو فون کیا تو نائلہ نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ جواد باز نہیں آئے۔ بار بار فون کرتے رہے

دوسری اور آخری قسط

"کہاں رہ گئی بھئی یہ دین۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی سمت دیکھا۔ پھر منتظر نظریں دائیں سائیڈ گھمائیں۔

"ارے ابھی ادھر ہو چلو اچھا ہوا یہیں مل گئیں۔" اسی ساعت اسے اپنے بائیں جانب انتہائی قریب سے آواز سنائی دی۔ وہ اچھل ہی تو پڑی۔ ڈرتے ڈرتے گردن گھما کر ادھر دیکھا۔ وہ اختتامی سیڑھی کے بالکل پاس پارک کی ہری نیوی بلو سوزوکی کا فرنٹ ڈور کھولتے کھولتے رک گیا تھا۔

"اف اللہ۔ کہاں پھنس گئی۔" اس نے بے بسی سے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دل ہی دل میں کوفت زدہ ہو کر سوچا۔ کیا مصیبت سر پر سوار ہو گئی ہے۔ اس نے ضرور مجھے رسوا کر کے ہی چھوڑنا ہے۔ "آؤ چلتے ہیں۔ تمہیں گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آنٹی سے بھی سلام دعا ہو جائے گی۔ یار اتنی مصروفیت رہی کہ آ ہی نہ سکا۔"

اس نے روانی کے عالم میں کہتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ یوں جیسے وہ منتظر ہی تو تھی لفٹ کے لیے۔

نائلہ نے پروا بھی نہ کی اک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی تھی۔ اس کی گاڑی کی طرف سے رخ موڑ کر تندہی سے دائیں سائیڈ دیکھتی دل ہی دل میں گاڑی آجانے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"ارے آؤ نا بھئی۔" اسے اڑیل ٹٹو کی طرح جوں کا توں کھڑے دیکھ کر اس نے متحیر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اصرار سے کہا تھا۔

"شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ اپنا راستہ لیں۔" طوعاً و کرہاً جواب دے کر وہ پھر رخ موڑ گئی۔

اسی لمحے ویگن کی جھلک دکھائی دی۔ وہ تیزی سے آخری سیڑھی چھوڑ کر لب سڑک آن کھڑی ہوئی اور فرنٹ سیٹ پر ایک موٹی سی "آنٹی نما" چیز کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھا۔

مگر پیچھا کہاں چھوٹنا تھا۔ چند دن بعد شام کو وہ گھر کی دہلیز پر تھا۔ احمد بھائی، شینا بھابی اور امی کو لے کر ہاسپٹل گئے تھے۔ شینا بھابی کے کوئی عزیز ادھر ایڈمٹ تھے ان کی مزاج پرسی کے لیے جانا تھا۔

"تم۔ آپ۔" اس کی پیشانی پر واضح طور پہ

ناگواری کے بل پڑ گئے تھے۔
"جناب۔" اس نے بڑے دل فریب انداز میں سر خم کیا "بس یا اندر نہیں آنے دو گی۔ باہر سے ہی ٹرخانے کا ارادہ ہے کیا؟؟"
"گھر میں کوئی نہیں ہے اس وقت۔" اس نے تلخ لہجے میں اطلاع دی۔ انداز ایسا ہی تھا۔ چٹا کھاؤ تاکہ میں دروازہ بند کروں۔
"تو کیا ہوا۔ میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔" اس نے اپنی مخصوص بے باک نگاہیں اس پر ٹکا دی تھیں۔
وہ جز بز سی ہو کر اپنا دوپٹہ مزید سامنے پھیلاتے ہوئے سنگین و سپاٹ نظروں سے اس کے خوشبودار طلسماتی وجود کو گھورنے لگی۔
"آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ اور براہِ مہربانی دوبارہ زحمت نہ کیجیے گا۔ میرے بھائی دو بجے آچکے ہیں۔ ان کی بیوی اور رشتہ دار وغیرہ سب یہیں ہوتے ہیں، ہم نہیں چاہتے آپ کے متعلق انہیں پتا چلے۔ کیونکہ آپ سے متعلق تعارف کے لیے ہمارے پاس کچھ اچھے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کو تو سارا زمانہ جانتا ہے۔ اور میرا خیال ہے امی جان بھی اب آپ کا یہاں آزادانہ آنا جانا پسند نہیں کریں گی۔ احمد بھائی کچھ اور مزاج کے انسان ہیں۔ وہ اس طرح کی تعلق داریاں نبھانے کے چکروں میں نہیں پڑتے پھر خوامخواہ آپ کو ایمبیرس منٹ ہو گی۔"
اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت سلیقے اور تدبیر سے کام لیتے ہوئے اسے صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ اس کے لہجے میں کوئی لحاظ نہیں تھا۔
کچھ دیر وہ سینے پر بندھے ایک بازو پر دوسرے بازو کی کہنی ٹکا کر اس کے ہاتھ کی مٹھی بنا کر ٹھوڑی کے نیچے رکھے کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات جانچتا رہا، کچھ تامل کے بعد بولا۔
"ٹھیک ہے میں گھر نہیں آؤں گا آئندہ۔ لیکن اس صورت میں جب تم میرے آفس آنے کا وعدہ کرو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔" اس وقت نوجوان چھڑانے کو اس نے ہامی بھر لی، خیال تھا کہ پھر دوبارہ ٹکراؤ کب ہوگا جو وعدہ خلافی کا احساس دلائے گا۔ مگر اس نے فون کر کے ناطقہ بند کر دیا۔ کتنی ہی بار اس نے جلیل میاں سے جھوٹ کہلوایا۔ کبھی بجتی بیل کو یونہی چھوڑ کر ادھر ادھر کام میں لگ جاتی یا ریسیور نیچے رکھ دیتی۔ مارے باندھے اٹینڈ بھی کرنا پڑتا تو ترنت ہی کا بہانہ کر کے فوراً فون بند کر دیتی مگر تابکے۔ جب اسے احساس ہو گیا کہ یہ فرار الٹا رسوائی کا سامان پیدا کرتا جائے گا تو بالآخر ایک دن دوپہر کے اوقات میں وہ کام نپٹا کر اس کے آفس چلی ہی آئی۔ اس دن کاردار صاحب چھٹی پر تھے، بڑی ہمت کر کے اس نے "سادات پلازہ" کی لفٹ میں گھس کر فلور نمبر چار کو دبا دیا تھا۔ مگر اندر سے اس کا دل بُری طرح واہموں کا شکار بنا ہوا تھا۔

تاریک سے کاریڈور سے گزرتے ہوئے تھوڑی دور جا کر وہ ٹھہر گئی۔ سامنے ہی بورڈ نظر آ گیا تھا وہ گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔
"جی فرمائیے۔" ہلکی ہلکی خشخشی سی داڑھی الپستہ قامت فربہی مائل تیس پینتیس سالہ شخص نے ریسپشن پر اس سے دریافت کیا۔ بعد میں پتا چلا یہ نیاز خان تھا۔ جواد احمد کا معتمد خاص۔
"جواد احمد صاحب سے ملنا ہے۔ کدھر ہوں گے۔" اس کے سادہ بے نیاز سے لہجے اور انداز کے تحکمانہ پن نے نیاز خان کو ٹھٹکا سا دیا۔ اس نے اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا۔
سفید کاٹن کی شلوار کے ساتھ براؤن قمیص دوپٹے میں انتہائی عام سے انداز میں بغیر کسی ظاہری آرائش کے بہت سادہ اور عام سے نقوش والی لڑکی ماڈلنگ کے لیے تو قطعی نہیں آ سکتی۔ صاحب کی "جان پہچان" والی دوست بھی نہیں ہو سکتی کہ ان کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے۔ یہ تو شکل سے بہت شریف لگ رہی ہے۔ عام متوسط طبقے کی نمائندہ غیر اہم سی لڑکی ان کی تعلق دار کیونکہ ہونے لگی پھر یقیناً جاب کے لیے آئی ہو گی۔ مگر ہاتھ میں فائل ندارد۔ انداز میں رعب اور شانِ استغنائی؟ اس خانے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی فٹ نہیں بیٹھتی۔

نیاز خان اپنی سوچوں میں کھویا رہا۔ اسے پاس پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ کا اسم گرامی۔ اور آمد کا مقصد وغیرہ۔"

"ان تکلفات میں نہ پڑیں اور سیدھا جا کر انہیں کہہ دیں نائلہ شاہ آئی ہے۔" اس نے تنک کر کہا۔

اس کے طرزِ تخاطب پر بڑے چیمبتے ہوئے انداز میں اس نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر کچھ توقف کے بعد کوئی نمبر ملانے لگا۔

"سر کوئی لڑکی آئی ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔ جی۔ نام۔ نام نائلہ شاہ بتاتی ہے۔" پھر وہ دوسری طرف سے جواب کے انتظار میں لمحہ بھر کو چپ ہوا۔

"جی۔ جی سر!" واضح طور پر اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ جسمانی حرکات و سکنات میں بھی اضطراب آمیز تاثرات نمایاں ہو گئے تھے۔

"سر! ابھی فارغ ہو رہے ہیں مس نائلہ! آپ پلیز تشریف رکھیے۔" اس کے انداز ہی بدل گئے تھے۔ بڑے گھبرائے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

نائلہ نے کچھ توجہ نہ کی۔ اسی اثناء میں سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور خوشبودار جھونکے کے ہمراہ وہ اندر سے برآمد ہوا۔

"خوش آمدید۔ صد شکر کہ آپ نے بھی یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ آیئے تشریف لایئے پلیز۔" وہ اس کی پذیرائی کو بذاتِ خود باہر ریسپشن تک آیا تھا۔ نیاز خان تو دروازہ کھلتے ہی الرٹ ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

"دیکھیے آپ پلیز آئندہ میرے آفس فون مت کیجیے گا۔ میری ریپوٹیشن کا سوال ہے۔"

اس نے چھوٹتے ہی کمرے کی طلسماتی خوابناک فضا کا اثر قبول کیے بغیر درشتی سے کہہ ڈالا تھا۔ جواب میں وہ کچھ دیر تک گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم ویسی ہی ہو۔ بالکل ویسی ہی۔ ذرا بھی نہیں بدلیں۔" بالآخر وہ گویا ہوا۔ اس کے لہجے میں ایک شگفتہ سا ٹھہراؤ تھا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی۔

"فرمایئے۔ کس بات کے لیے آپ نے اتنے دنوں سے میرا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔"

کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کی اتنی اہمیت اور توجہ ملنے پر خوشی کے مارے پاگل ہو جاتی، مگر یہ نائلہ شاہ تھی۔ زندگی کے راستوں پر سیدھا اور ثابت قدم ہو کر چلنے والی۔ سو دو ٹوک کھردرے انداز میں اس سے سوال کیا تھا۔

"ایسے ہی یار۔ تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ آخر اتنے عرصے بعد دوبارہ ملے ہیں ہم۔ کتنے عرصے سے کچھ کہا سنا نہیں ایک دوسرے سے۔"

"ہمارے درمیان ایسی کوئی بے تکلفی پہلے بھی نہیں تھی جواد احمد صاحب۔" اس نے تڑختے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ کی یادداشت خاصی خراب ہے۔"

"سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔" اس نے شرارت سے سر جھکایا۔ اسی اثنا میں نیاز خان دو کوک اور ایک پلیٹ میں پیسٹریاں سجا کر ٹرے لگا کر لے آیا۔ اس کے منع نہ کرنے کے باوجود جواد نے زبردستی اسے کوک پلوائی۔

"تمہاری اپنی ایک کشش ہے نائلہ! میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ آخر میں اور میرا دل تمہاری طرف کیوں لپکتا ہے تم دیکھنے میں اتنی عام سی ہو، مگر دل و نظر کو خاص کیوں لگتی ہو۔ کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود تمہاری ذات کی کشش میں، میں خود کو محصور پاتا ہوں۔" پتا نہیں وہ سنجیدہ تھا یا ظاہر کر رہا تھا۔

"میں سمجھائے دیتی ہوں جواد احمد تمہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو چہرے پر گرمجوشی اور والہانہ پن کا ماسک لگا کر تم اپنے چہرے پر پڑی تنفر و تحقیر، بدگمانی اور فریب کاری کی سلوٹیں سب سے پوشیدہ رکھ سکو گے۔ کچھ نگاہیں نظر شناس بھی ہوتی ہیں اور وہ بدن نہیں روح کی حقیقت تک پہنچ جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں کیا جانتی نہیں ہوں تمہارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

...، وحشی، سفاک، بے رحم، بے ضمیر انسان، کو، اور کیا اب بھی بے خبر ہوں تمہارے سیاہ اعمال سے؟ یہ بات نہیں ہے، چشم پوشی کرنا اور بات ہے مگر تمہارے باطن کی بدصورتی تو شروع دن سے مجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ ظاہری بات ہے مجھ جیسی عام شخصیت کی متوسط طبقے کی سادہ سی لڑکی تمہارے معیار کے آسمان کو کیسے چھو سکتی ہے۔ تمہیں میں نہیں، میری ذات کے اعتماد، میرے بے نیاز رویے اور لاپروا اسٹائل نے میری طرف متوجہ کیا کہ یہ سب چیزیں تمہیں شیئر کرتی تھیں۔ تمہاری مردانگی پر حرف آتا تھا کہ اتنا عالی شان بھرپور مرد ہو کر ایک بہت عام سی لڑکی کو قابو نہ کر سکا۔ مجھے تسخیر کر لینے کی ضد نے تمہیں میری سننے اور مجھے برداشت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ تم ہر قیمت پر مجھے جھکانا چاہتے ہوئے توڑنا چاہتے ہو۔ اپنے حسن کے حضور مرعوب و متاثر اور مسخر دیکھنا چاہتے ہو، ایک بار میری شکست کا اعتراف دوسرے لفظوں میں اپنے لیے محبت کا اظہار میرے منہ سے سن لو اس کے بعد تمہاری زخمی انا اور مردانہ خودداری رام ہو جائے گی۔ اور پھر کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھو گے۔ میری طرف لپکنے کا واحد سبب "نارسائی" ہے۔ رسائی کے بعد تو یوں بھول لو گے جیسے کبھی نام سے بھی آگاہی نہ ہوئی ہو۔ یہ ہے سارا چکر۔ جو تم مجھے دام میں گرفتار کرنے کے لیے چلا رہے ہو۔"

وہ روانی کے عالم میں کہتی چلی گئی۔ اور وہ چپ چاپ ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے ایک ٹک اسے دیکھتا سنتا چلا گیا۔ بالآخر وہ چپ ہو کر ہونٹ چباتے ہوئے گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں مسلتی اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم نے صحیح اندازہ لگایا۔" کتنی ہی دیر بعد وہ بولا تو اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن، شکست اور مضطربانہ سا اعتراف جھلک رہا تھا۔

"اور میرا اندازہ تمہارے بارے میں خاصا غلط نکلا۔ میں شروع میں یہ سمجھتا رہا، تم میرے مقابلے میں اپنی غربت اور اسٹیٹس کے کمپلیکس میں مبتلا ہونے کے باعث بظاہر بے زار اور تحقیر کا اپنائے ہوئے ہو۔ اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے سختی اور طبقے کا نقاب اوڑھا ہوا ہے اور درپردہ مجھ سے مرعوب و متاثر ہو، میری توجہ کی منتظر ہو۔ یہ تو مجھ پر بڑی دیر بعد کھلا ہے کہ تم مجھ سے کوئی تعلق واسطہ رکھنے کی خواہاں ہی نہیں ہو، اور یہ کہ تمہارے متنفر اور تحقیر آمیز رویے کے پیچھے در اصل میرے کردار کی کجی اور میری بدنام زمانہ شخصیت سے بیزاری پنہاں ہے، یقین کرو نائلہ یہ میری زندگی کا بڑا انوکھا تجربہ ہے کہ کوئی لڑکی میری اتنی کشش آمیز پرسنالٹی کے حصار سے بچی رہ سکتی ہے۔ کوئی مجھے ٹھکرا بھی سکتا ہے۔ کوئی میرے بڑھے ہوئے ہاتھ ریجیکٹ بھی کر سکتا ہے۔ ایسا کبھی بھی میری زندگی میں نہیں ہوا۔ میں ہمیشہ چاہا گیا ہوں۔ ہمیشہ اپر ہینڈ رہا ہے میرا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی "ہار" کا لفظ نہیں سنا تھا۔ ہارے ہوئے منظر سے آشنا نہیں تھا۔ میں نے تو ہمیشہ فخر سے بلندیوں کی طرف سر اٹھا کر چیلنجنگ انداز میں انہیں دیکھا ہے، پستیاں تو کبھی میرے آس پاس بھی نہیں بھٹکیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا نائلہ اور میں یہ بھی سمجھ گیا ہوں بہر حال کہ تم بہت انسانیت نواز اور اعلیٰ روایات کی پاسدار ہو۔ یقیناً میری اس روش سے تمہارا دل کڑھتا ہوگا۔ اور اگر میں راہ راست پر آ جاؤں تو تمہارا یہ تنفر خود بخود دوستی میں بدل جائے گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا نائلہ کہ تم مجھے مثبت تعمیری شخصیت میں ڈھال دو۔ زندگی کو پڑھنے کے لیے میری نگاہوں میں سیدھی سچی روشنی بھر دو۔ یقین کرو میں بھی خود کو کبھی جب تنہائی میں "تاریکیوں کے حصار" میں پاتا ہوں تو اس ید بیضا کی کھوج رہتی ہے جو مجھے اندر باہر سے منور کر دے۔"

نائلہ دم بخود اسے سن رہی تھی، بات کے اختتام پر جواد نے اس کی سمت دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سچائی اور سنجیدگی کی جھلک تھی۔ جس نے نائلہ کو مخمصے میں ڈال دیا۔

"نائلہ پلیز۔" وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا اور آہستگی سے اپنا دایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر ہلکے سے دبا ڈالا۔ "مجھے یقین ہے تم مجھے روشنی تک لا سکتی ہو۔ شاید — لاشعوری طور پر یہی وجہ تھی جو میں اتنا زیادہ تمہارے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے خود بھی اپنی حرکتوں پر اختیار نہیں تھا۔ بس ایک اضطرار تھا۔ ایک عجیب سا اصرار میرے اندر سے ابھرتا تھا تمہیں اپنے سے آشنا رکھنے کا، ہم کلام ہونے کا۔"

"یہ میرے لیے بہت مشکل ہے، تم خود سوچو۔ میری ریپوٹیشن کا سوال ہے۔"

"اُف خدایا۔" اس نے غصے کے عالم میں اپنے بال نوچ لیے۔ "ایک تو مجھے ان ریپوٹیشن صاحبہ کی سمجھ نہیں آتی۔ آخر کیا سوال ہے اس کا۔ کیا ڈیمانڈز ہیں اس کی۔ پیٹ ہی نہیں بھرتا ان محترمہ کا تو۔" اس کا انداز اتنا بے ساختہ، اتنا رواں تھا کہ نائکہ بلاارادہ بے اختیار ہنس پڑی۔

وہ بھی غصہ چھوڑ کر اسے دیکھتے ہوئے دلکشی سے مسکرا دیا۔

"اچھا اب بتاؤ صاف صاف لفظوں میں۔ کہ میرا ساتھ دوگی کہ نہیں۔ مجھے سدھارنے میں انسان بنانے میں، میری زندگی سنوارنے میں؟" اسے ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر سکون کی سانس لیتا ہوا وہ بے تکلفانہ پوچھنے لگا۔

"یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ تم کس حد تک میری بات سنتے ہو، مانتے ہو اور اس پر عمل کرتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ضرور پوری پوری کوشش کروں گا۔ تم جو کہو گی مانوں گا۔" اس نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"تو پھر سب سے پہلا کام یہ ہے کہ تم شادی کر لو تاکہ اپنے نفس کی ضرورت جائز شرعی رستے سے پوری کر سکو۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ تمہارا مشورہ درست ہے۔" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ "لیکن یار سچی سچی بات بتاؤں کہ اس سلسلے میں ابھی کچھ پیچیدگیاں ہیں۔ میں ابھی اسٹیبلش نہیں ہوا ہوں، میری امپورٹ ایکسپورٹ اینڈ ٹریڈنگ ایجنسی نے ابھی حال ہی میں کام کرنا شروع کیا ہے۔ سمجھو بابا جان کا جتنا سرمایہ تھا اس میں لگ چکا ہے۔ اب میرے ہاتھ میں پیسہ نہیں ہے۔ بابا جان سیلف میڈ انسان تھے۔ انہوں نے جو کچھ چھوڑا، وہ اس کمپنی کی شروعات میں کھپ گیا۔ اتنی سی کمپنی ہے۔ ظاہر ہی بات ہے اس کو بننے میں ابھی وقت لگے گا۔ ابھی کم از کم ایک سال کا عرصہ تنگی کا عرصہ ہوگا۔ پھر مجھے گھر بنانا ہے اپنی کلاس کے ہائی اسٹینڈرڈ کے مطابق۔ جہاں ہائی سوسائٹی کے لیے بڑے پیمانے پر نہایت اہتمام کے ساتھ ڈنرز اور کیٹ ٹو گیدر ٹاپ فنکشنز ارینج کیے جا سکیں۔ تم تو جانتی ہو اپنے نام کو متعارف کروانے کے لیے ہمارے اوپر بیٹھے ناخداؤں کی آشیرباد اور "تائید و حمایت" ضروری ہوتی ہے۔ پھر شادی کے لیے کسی ایم این اے، کسی وزیر مشیر یا سیکرٹری کا گھر دیکھنا ہوگا۔ اس سے کمپنی کے بینیفٹس بھی ہوں گے۔ بہت سے مسائل ہیں، جن کے لیے پیسہ ہونا بہت ضروری ہے۔ میری ظاہری ٹپ ٹاپ اور شان و شوکت دیکھ کر سب یہ سمجھتے ہیں کہ کروڑ پتی نہ سہی مگر لکھ پتی ضرور ہوگا۔ اور سچی بات ہے نائکہ، اگر میں یہ سب کچھ نہ اپناؤں، یہ آرائش، یہ پر تعیش ساز و سامان نہ ہو تو یہاں آئے گا کون، کسی ٹٹ پونجیے کے ہاں نواب وزیر کیوں آنے لگے سب اتنے پیسے ہے یار۔ صرف پیسہ۔"

اس نے سر جھٹکا۔ "اور دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے کندھوں سے اونچا ہونے کے لیے ہمیں بھی اسی ہتھیار سے وار کرنا پڑتا ہے۔ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔ سب کا یہی یار ہے۔ سب ظاہر پرست ہیں۔ بناوٹ پسند ہیں چاہے یہ لفظوں کی بناوٹ اور سجاوٹ ہو۔ چاہے عمارت کی ہو۔"

اس کی بہت سی باتوں سے اختلاف ہونے کے باوجود وہ ٹوکے بغیر اس کو سنتی رہی۔

"مگر جواد! اگر تم اندھا دھند نام اور پیسہ کمانے کے لیے بھاگو گے تو بہت جلد یا تو ٹھوکر کھا کر گر جاؤ گے اور اپنے آپ کو نقصان پہنچا بیٹھو گے یا پھر اتنا آگے نکل جاؤ گے کہ تنہا رہ جاؤ گے۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے صبر و تحمل اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے جراثیم تم میں نہیں ہیں۔"

"اب تم ہو ناں، تم سنبھال لو گی۔" اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور پھر نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پھولی ہوئی شکل دیکھ کر کبھی کبھار ٹائم نکال کر آجاتی۔

اس کے کام میں مفید مشوروں سے نوازتی۔ آفس کے معاملات دیکھتی۔ اس کی نگاہ میں کھینچ کے رکھتی کون سی لڑکی آئی گئی۔ کس سے کیا تعلق تھا۔ کس کو کتنی دیر بٹھایا۔ وہ اچھی خاصی اس کی کلاس لیتی اور وہ صفائیاں دیتا رہتا۔ کبھی اپنی شرارتوں سے اس کا ناطقہ بند کیے رکھتا۔ کبھی کسی اسکینڈل کی نائلہ کو ہوا لگتی تو وہ بپھری ہوئی اس پر چڑھائی کر دیتی۔ وہ اتنا کو کھلا جاتا کہ جھوٹے بہانے بہلانے کی تگ و دو میں سچ اگل دیتا۔ جس پر کبھی نائلہ کی غصے کے عالم میں بے اختیار ہنسی نکل جاتی، اور کبھی وہ روہانسی ہو کر آئندہ دوبارہ آفس میں قدم نہ رکھنے کا عہد کر لیتی۔ مگر وہ ادھر ادھر کی تاویلیں دے کر بہرحال اسے منا لیتا۔

”جتنی مصیبت مجھے تمہارا موڈ درست کرنے کے لیے کرنی پڑتی ہے۔ اتنے ناز نخرے میں کیٹی کے بھی نہیں اٹھاتا۔ قسم سے لگتا ہے بیوی وہ نہیں تم ہو۔ اتنا تو مجھے اس سے بھی ڈر نہیں لگتا غلط کام کر کے جتنا تمہاری طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے“ کبھی کبھی وہ اس کی پونی کھینچتا ہوا کہتا۔

”غلط حرکتیں نہ چھوڑنا، جھوٹ گھڑنے کی فیکٹری ضرور ذہن میں تعمیر کرتے رہنا!“ وہ خفگی کے عالم میں گھور کر رہ جاتی۔

کیٹی ایک غیر ملکی فرم کے مالک کی بیٹی تھی۔ پاکستان میں چھٹیوں میں باپ کے پاس آئی تو ایک فنکشن میں جواد سے ٹاکرا ہو گیا، جو بعد میں محبت اور شادی میں بدل گیا۔ اس شادی کا بزنس پوائنٹ آف ویو سے جواد کو ٹھیک ٹھاک فائدہ ہوا۔ پھر اس یورپی حسینہ کی خوبصورتی بھی اس کے معیار کے مطابق تھی۔ سو نائلہ سے صلاح مشورہ کر کے اس نے یہ قدم اٹھا لیا۔ اتنے عرصے میں وہ گھر تو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کر ہی چکا تھا۔

”تمہاری مرضی ہے تم دیکھ لو۔ کیونکہ یہ خالص تمہارا پرسنل معاملہ ہے زندگی تم نے گزارنی ہے اگر وہ تمہارے مطلوبہ معیار پر پورا اترتی ہے تو ٹھیک ہے، لیکن بہرحال دیکھ سوچ کر فیصلہ۔“ نائلہ نے اس کے مشورہ مانگنے پر کہا تھا۔

یہ شادی شروع شروع میں تو ٹھیک ٹھاک چلی۔ اس کی بھرپور بولتی ہوئی شخصیت کے حصار نے اس کے پرجوش اظہار جذبات کے طلسم نے اس مغربی حسینہ کے دل کا قلعہ فتح کر لیا تھا۔ کیٹی کے کافرانہ حسن و ادا نے بھی جواد کو دیوانہ کر دیا تھا بڑے فخر سے فنکشنز میں اپنی بیوی کا تعارف کرواتا۔ لوگ کیٹی کا مضبوط بیک گراؤنڈ اور اس کا شعلہ ساماں حسن دیکھ کر دل ہی دل میں جواد کی قسمت پر رشک کرتے۔ کیٹی کے والد کی فرم کے نام نے ان کی سپورٹ نے جواد کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ پھر کیٹی کی بھرپور سوشل پوزیشن بھی اس کے بڑے کام آئی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اس کی کشش کا حصار توڑ کر نکل آیا۔ کیٹی کو ناز نخرے اٹھوانے اور والہانہ نثار ہوتے جذبات کے اظہار کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ کیا سمجھتی۔ کہ وہ شروعات میں انداز محبانہ کی انتہاؤں کو چھونے کے چار دن بعد بندے کو اس کی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ یہ تو اس کی سرشت میں شامل تھا کسی ایک سے نبھا کر قناعت پسند ہو جانا اس کا شیوہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو طلب کا بندہ تھا۔ مگر یہ کہ پیاس کے عالم میں زندگی کا سارا انحصار پانی کے ایک معمولی سے کٹورے میں سمٹ آتا ہے اور جی بھر کر سیراب ہونے کے بعد بھلے وہ چھوٹا سا کٹورا ٹھنڈے میٹھے چشمے میں بدل جائے مسافر اک نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

کیٹی کو اس سے وقت نہ دینے کی شکایت رہنے لگی۔ نائلہ سے بات ہونے پر بھی وہ یہی شکوہ کرتی۔

”جے کو بالکل بھی میری پروا نہیں ہے ان کا سارا کچھ تو جیسے صرف بزنس ہی بن گیا ہے صبح نو بجے کے نکلے رات دو دو بجے گھر آتے ہیں میرے لیے کوئی ٹائم ہی نہیں ہے ان کے پاس۔“

”ارے آپ فکرمند نہ ہوں، ان کا کام ہی ایسا ہے۔ ظاہری بات ہے سارے معاملات انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی ڈیل کرنا ہوتے ہیں۔ ساکھ بنانا کون سا آسان تھا ہوتا ہے۔ ننھے پودے کو تناور درخت بنانے کے لیے قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔" وہ اگر دن رات مصروف رہتے ہیں تو بے مقصد تو نہیں رہتے ناں؟" وہ تسلی دیتی۔

"مگر ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بیوی کے لیے دو گھڑی ٹائم بھی نہ نکال پائیں؟" کیٹی روہانسی ہو جاتی۔ نائلہ اس کی تشفی کرانے کے لیے کندھے تھپتھپاتی۔

"نہیں سمجھتیں آپ۔ جب بندہ باہر نکلتا ہے تو اسے بہت کچھ دیکھنا سوچنا پڑتا ہے۔ اس سے ڈیلنگ، اس کا حساب، اس سے ملاقات، ڈپلومیسی، ٹیکنیک اور ٹیکٹ کے گر آزما کر کلائنٹ کو قابو کرنا ہوتا ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ دل چھوٹا نہ کرنا۔ ویسے میں ان سے کہوں گی۔"

"جواد! تم کچھ زیادہ ہی مصروف نہیں ہو گئے؟ کیٹی اور چھوٹی بلی زین کو بالکل بھی وقت نہیں دیتے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ بندہ اپنے گھر بار سے بھی غافل ہو جائے۔" اس دن آئی تو وہ یہی موضوع لے بیٹھی۔

"محنت کر رہا ہوں دن رات۔ میں نے اپنا آرام سکون تباہ کیا ہوا ہے ان محترمہ کو طلب رہتی ہے اپنے ناز نخرے اٹھوانے کی۔"

"کیوں نہ ہو، تمہاری بیوی ہے وہ۔ اس کا حق ہے۔" اس نے بہت دکھ سے کہا۔ "پھر تمہاری بیٹی ہے۔ اسے تمہارے پیار، تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ تم سب کچھ انہی کی خاطر ہی تو کر رہے ہو۔ انہیں تمہارے نام سے زیادہ تمہاری توجہ کی طلب ہے۔"

"لیکن مجھے اپنی کمپنی کا نام چمکانا ہے۔ جے اے گروپ آف کمپنیز کو سب سے آگے لے کر جانا ہے ایک وقت آئے گا جب سارے اٹھے ہوئے سر میرے سامنے جھک جائیں گے۔ یہ جو بچارو میں بیٹھے موبائل فون ہاتھوں میں لیے ماتھے پر تکبر اور نخوت کی لکیر لیے خدا بنے بیٹھے ہیں، میں نے ان کو جھکانا ہے، ان کو زمین دکھانی ہے۔" کبھی کبھی وہ بالکل جنونی سا ہو جاتا تھا۔ نائلہ مقدور بھر اس کو ٹھنڈا کرتے — سیدھا رستہ دکھانے کی سعی کرتی رہتی۔

پھر کیٹی کے اور جواد کے مابین اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ کیٹی کو احساس ہو گیا کہ جس شے کی کشش نے اسے باندھ کے رکھ دیا تھا وہ کبھی ہمیشہ کے لیے اس کی نہیں ہو سکتی۔ نوبت طلاق پر جا پہنچی۔ بچی جواد کے پاس ہی تھی۔

کیٹی سے شادی کے خاتمے کے بعد جواد نے ایک وفاقی وزیر کی خوبصورت بیٹی رشنا سے شادی کر لی۔ نائلہ کے استفسار پر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"ارے یار! چھوڑو پرانا قصہ۔ میرا دل بیزار ہونے لگا تھا اس سے۔ اچھا ہوا اپنی خوشی دونوں نے راہیں بدل لیں۔ مجھے اب اس کی اتنی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس سے جتنا فائدہ میں نے لینا تھا لے لیا۔"

اس کے بے فکرے، نخوت آمیز مطلبی انداز پر وہ جی بھر کر اسے لعنت ملامت کرتی رہی۔ کچھ عرصہ تو رشنا کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ پھر وہی روٹین شروع ہو گئی۔ رشنا کو اس کی بے توجہی کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن اس کا انداز دوسرا تھا۔ ظاہر ہے وہ روایتی پاکستانی بیوی تھی۔ شوہر کو کسی دوسری لڑکی سے بات کرتے، اس سے ملتے دیکھ کر ہزاروں وسوسے اور شکوک و شبہات دل میں پلتے رہتے۔ اس نے ہوشیاری یہ دکھائی کہ اس سلسلے میں نیاز خان کو ٹریپ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے فون پر پوچھتی رہتی صاحب آج دوپہر کس کے ساتھ لنچ پر گئے ہیں؟ رات کا پروگرام کیا ہے؟ ایک بار یونہی کسی کام کے سلسلے میں دفتر سے گزر ہوا تو نائلہ سے ملاقات ہوئی۔

"یہ رشنا ہیں میری بیگم۔" جواد نے تعارف کرایا تھا۔

نائلہ حسب عادت گرمجوشی سے ملی۔ حال چال دریافت کرتی رہی۔ اپنے خوش خلق انداز میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس دوران رشنا تنقیدی

Aneela Pakistani Point

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہتا ہوں۔ اسے دیکھتی رہی۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جواد کا اس لڑکی سے کس قسم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

"اچھا ابھی میں چلتی ہوں پھر دیر ہو رہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بیگ سنبھال کر اٹھتے ہوئے جواد کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جو ان دونوں کو محوِ گفتگو دیکھ کر فائلوں میں کھویا ہوا تھا سر اٹھا کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔

"اتنی جلدی۔" اس نے کہہ کر گھڑی دیکھی، آج وہ بہت عرصے بعد ادھر آئی تھی۔ ایک ماہ سے زائد ہی ہو گیا ہوگا ورنہ وہ ہر ماہ ایک دو چکر ضرور لگاتی تھی۔ آنے سے پہلے وہ اسے بتا کر ٹائم فکس کر کے آتی تھی۔ اور عموماً ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھتی تھی۔ ابھی اس کو آئے بیس منٹ ہی گزرے تھے کہ رشنا آ گئی تھی۔ اس سے باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

"ہاں ناں۔ اب چلتی ہوں۔ ایک گھنٹہ ہونے کو آیا ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔

"ابھی کافی باتیں ڈسکس کرنے والی رہتی تھیں۔" چور نگاہ رشنا پر ڈالتے ہوئے جواد نے اضطراری لہجے میں کہا۔ دل ہی دل میں رشنا کی موجودگی اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کل آ سکتی ہو تم۔؟" دبے ہوئے لہجے میں اصرار تھا۔

"نہیں نہیں بہت مشکل ہے۔ کل بہت کام ہے خلیل میاں اور کاردار صاحب دونوں چھٹی پر ہیں۔" اس نے فوراً تاویل دی تھی۔

"اچھا۔" جواد کے چہرے پر چھایا مایوسی کا تاثر رشنا کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔ کسی لڑکی کی موجودگی میں ویسے بھی بیوی کی نظریں شوہر کے چہرے پر سرچ لائٹ کی طرح پڑتی ہیں۔

"پھر میں فون کر کے تم سے پتا کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، ویسے کرنا کیا ہے۔ میرا خیال ہے ہماری اے والے اشتہار کے لیے اس سے بہتر کوئین، ماڈل اور فقرے اور ہو ہی نہیں سکتے جو ہم نے ابھی ڈسکس کیے ہیں۔"

"لیکن بہرحال کچھ پہلو ایسے ہیں جن میں وضاحت کے لیے مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔"

"چلو پھر کونٹیکٹ کر لینا۔ اوکے خدا حافظ، اوکے رشنا وش یو بیسٹ آف لک۔"

وہ وش کر کے اپنے مخصوص پُراعتماد انداز میں کمرے سے نکل گئی تھی۔ رشنا کی نگاہیں بہت دیر تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

"یہ کون ہے اور اس کو کیا حیثیت حاصل ہے یہاں۔" دوسرے دن وہ نیاز خان سے پوچھ رہی تھی۔

"یہ کسی زمانے میں صاحب کی کلاس فیلو رہی ہیں، سائٹ والے پلازے میں واقع ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہیں۔ یہاں آتی رہتی ہیں۔ بڑے عرصے سے آ رہی ہیں۔ ہمیں بھی مدد دیتی ہیں۔"

"تمہارے صاحب سے کتنی کلوز ہیں؟" اس کا سوال معنی خیز تھا۔

"یہ تو جی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نیاز خان بہرحال جہاندیدہ تھا۔ جانتا تھا وفاداری کا اصل صلہ تو صاحب کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ بیگمات تو آتی جاتی رہتی ہیں، اس لیے پہلو بچا گیا۔ دوسرے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ صاحب اس کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ جب وہ پہلی دفعہ آ کر روانہ ہوئی تھی تو اس کے بعد جواد نے نیاز خان کو بلا کر کہا تھا۔

"مس نائلہ شاہ آئندہ جب بھی آفس آئیں انہیں بہت عزت و احترام دیا جائے۔ ہر طرح خاطر تواضع کی جائے۔ جیسے ہی داخل ہوں، میں سیٹ پر اگر موجود ہوں تو فوراً فون پر اطلاع دی جائے۔"

اس نے اکثر یہ مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ کھری کھری سنا رہی ہے ڈانٹ رہی ہے لڑ جھگڑ رہی ہے، غصے میں ہے اور صاحب سر جھکائے کھسیانے سے شرمندہ ہو کر سن رہے ہیں، صفائیاں دے رہے ہیں، اسے منا رہے ہیں۔ وہ بڑے تحکم سے بولتی تھی۔ بڑا رعب اور دبدبہ ہوتا تھا اس کے انداز میں۔ خصوصاً کام کرواتے وقت تو وہ بالکل کمپنی کی مالکن کی طرح ورکرز سے پیش آیا کرتی تھی، سمیت صاحب کے۔

وہ بھی کبھی کبھار سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ آخر

اس لڑکی اور صاحب میں کیا رشتہ ہے۔ آخر والا بھی نہیں تھا۔ مالک نوکر والا بھی نہیں تھا۔ آخر کس جذبے سے وہ یہاں آکر اس کا کام کرتی تھی، اتنے خلوص سے اتنی تندہی اور یکسوئی سے بہت سارا کام منٹوں سیکنڈوں میں نپٹا کر یہ جا وہ جا۔ آخر وہ کون سی غیر مرئی کشش ہے جو صاحب کو اس کی سب کچھ سن لینے اور اس کی بے نیازی برداشت کر لینے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

”تم شاید مجھے بتانا نہیں چاہ رہے۔“ رشنا اس کی خاموشی سے کھٹک گئی۔

”ارے نہیں بیگم صاحبہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے واقعی اس بارے میں کوئی خاص علم نہیں ہے، یہ ہے کہ سر ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے پہلی بیگم صاحبہ کے ساتھ بھی بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔“

”بظاہر دیکھا جائے تو اس میں ایسی کوئی کشش تو نہیں ہے۔ تمہارے صاحب سے تو روز ایک سے ایک بڑھ کر حسین لڑکیاں ٹکراتی ہیں۔ لیکن نجانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے جیسے وہ جواد کے لیے بہت خاص ہستی ہے۔ جواد کے لہجے کی بے تابی، چہرے کا حسرت زدہ تاثر اور آنکھوں کی لپک بہت کچھ آشکار کر رہی تھی۔“

رشنا گویا خود سے ہم کلام تھی۔ وہ کیٹی کی طرح زبان کی تیز نہیں تھی، کبھی ہوتی بھی تھی تو جواد احمد کی قربت اس کے نسوانی غرور کو پاش پاش کر چکی تھی۔ مگر بہرحال وہ اندر ہی اندر جوڑ توڑ میں لگی ہوئی تھی۔

اس کے ہاں بیٹا ہوا تو جواد نے خوشی میں گھر پر فنکشن ارینج کیا۔ نائلہ کو بھی بصد اصرار مدعو کیا۔ وہ بیٹے فواد احمد کے ساتھ زین کے لیے بھی ڈھیروں تحائف لے کر آئی تھی۔ بڑے والہانہ انداز میں فواد زین سے ملی تھی۔ پھر جواد اور رشنا کے اصرار پر کبھی کبھار وہ گھر چلی آتی۔ بچوں سے بہت پیار کرتی رشنا سے بڑے دوستانہ انداز میں ملتی۔ رشنا نوٹ کرتی کہ جواد اس کی مہمان نوازی میں خصوصیت سے دلچسپی لیتا، جتنی دیر تک وہ گھر میں رہتی بہت بڑے ہشاش بشاش انداز میں اس کی باتوں، بچوں کی باتوں اور رشنا کی باتوں میں دلچسپی سے متوجہ رہتا۔

”یار! تو نے شرط لگا رکھی ہے کیا کہ میری بیویوں کے لیے خطرے کا الارم بنی رہے گی۔“ ایک دن وہ شرارت سے اسے دیکھتا ہوا کہہ بیٹھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھنے لگی۔

”پہلے کیٹی بھی کبھی کبھی کہہ دیا کرتی تھی کہ نائلہ آپ کے بہت کلوز ہے، اس کی بات آپ زیادہ مانتے ہیں۔ اور اب رشنا کے اعصاب پر تم سوار ہو گئی ہو کہتی ہے اس عام سی معمولی سی لڑکی میں کیا کشش ہے جو تم اس سے قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ میں نے بھی کہا۔ ہاں ہاں دیکھو ناں بھلا اتنی غیر اہم سی لڑکی میرے معیار کی کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر وہ میری جان ہی نہیں چھوڑتی اس سے عاجز آیا ہوا ہوں۔ تم ہی کوئی منتر پڑھ کر اسے بھگاؤ۔ اسے کہو اپنے لیکچرز کے ٹوکرے اور نصیحتوں کے پلندے سمیت کہیں غائب ہو جائے۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”کسی دانشور نے کہا ہے خوبصورتی کی تلاش میں ساری دنیا پھر لو، یہ اگر آپ کے دل میں نہیں ہے تو کہیں بھی نہیں ملے گی۔ ہم دل کی نظر سے دوسروں کو دیکھتے ہیں دل کو جو اچھا لگتا ہے وہی نظر کو بھی لبھاتا ہے۔ نظریں اس کو دیکھنا اور دیکھتے رہنا چاہتی ہیں۔ ماں کو اپنا بچہ ساری دنیا سے پیارا، چاند ستاروں سے زیادہ حسین کیوں لگتا ہے؟ ہمیں اپنی ماں کا جھریوں بھرا چہرا سارے جہاں سے عزیز کیوں محسوس ہوتا ہے ــــ ہم کیوں نہیں کہتے کہ یہ عورت تو خوبصورت نہیں ہے۔ اس کی جگہ ہم فلاں خوبصورت اداکارہ کو ماں جتنی محبت دے دیتے ہیں۔ ہمارا بچہ تو پیارا نہیں ہم سامنے والوں کے خوبصورت بچے کو پیار کریں گے ایسا کبھی ہوا ہے؟ نہیں ناں۔ اور نہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کرتا۔ بعض اوقات اہم ہونا ضروری ہوتا ہے مگر خوبصورت ہونا اہم نہیں ہوا کرتا۔

”نہیں ــــ مجھ سے زیادہ میرے بچوں اور بیویوں کا خیال رہتا ہے۔ میرے لیے تو لگتا ہے دور دور کوئی جگہ نہیں تمہارے دل میں۔“

تبھی جب وہ علیک سلیک کے بعد جیدی بچوں

کی خیریت پوچھتی، آفس کے حالات پوچھتی تو وہ بچوں کی طرح منہ بسور کر کچھ چڑ کر، جھنجھلا کر کہہ دیتا۔ وہ ہنس دیتی۔

"تمہارے سر میں بدقسمتی سے دماغ نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی ہے۔ بے وقوف انسان خلوص کا اظہار و اسلوب کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ تم عزیز ہو تو تمہارے توسط سے تمہارے بیوی بچوں، تمہاری کمپنی، تمہارے مفادات مجھے عزیز ہیں۔ ان کا خیال رکھنا تم سے عزیز داری کا کھلا اظہار نہیں تو اور کیا ہے؟"

"بس تم مجھے چھپے سب اظہار مجھ تک ہی رکھا کرو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ بچوں کی طرح ضد کرتا منہ بنا تا رہتا۔ وہ مسکراتی رہتی، کبھی ڈپٹ کر چپ کرا دیتی۔

انہی دنوں جواد نے ایک لیڈی سیکریٹری اپائنٹ کی۔ زارا بڑے معصوم حسن اور شوخ لب و لہجے والی۔ اس کے انداز میں نزاکت اور شرارت ضرور تھی، مگر چالاکی اور بے باکی نہیں تھی۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی مگر اس کی ہنسی میں دعوت کے بجائے حجاب ہوتا تھا۔ تھی تو ناآموز ہی البتہ نائلہ کی گائیڈ لائنز میں بہت جلد کام سیکھ گئی۔ جواد کا سلوک اس کے ساتھ خاصا مہربان اور لگاوٹ آمیز تھا۔

"اب کیا کیا جائے اللہ نے دل ہی بڑا نرم اور مہربان بنایا ہے۔ ہر لڑکی کے لیے کہیں نہ کہیں سے ہمدردی اور اپنائیت کا جذبہ پھوٹ نکلتا ہے۔"

نائلہ کی سرزنش اور ناد یدی نگاہوں کے جواب میں اس نے بڑے مسکین سے انداز میں وضاحت کی تھی۔

اس نے جواباً اسے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی فائل سر پر دے ماری۔

"باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے جواد کے بچے، شرم کرو اب۔ بیوی بچوں والے ہو۔"

"تو کیا بیوی بچوں والوں کے سینوں میں دل نہیں ہوتے؟" نہایت معصومیت سے دریافت کیا گیا تھا۔

جلد ہی نائلہ نے تاڑ لیا کہ اس کی طلسماتی شخصیت اس کا نوٹ لینے والا بھرپور لب و لہجہ اور اس کے دل کھینچ لینے والے طرز نشست و برخاست کا سحر زارا جیسی نوخیز کم عمر لڑکی کے خوابوں پر پوری طرح گرفت کر چکا ہے۔ اس نے دبے دبے انداز میں بالواسطہ زارا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ جانتی تھی، زارا کی محبت روایتی پیچ لیے ہوئے ہے۔ اس میں سطحی یا بازاری پن نہیں ہے لیکن بہر حال یہ روش زہریلی ہے۔

"بائی دی وے مجھ سے محبت کرتی ہے ناں۔ مجھ پر مرتی ہے۔ میں تو ایسا نہیں کرتا ناں۔ میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو اسے مجبور نہیں کیا ناں۔"

نائلہ کے ناراض انداز پر اس نے صفائی پیش کی۔

"مگر تم ایسے لگاوٹ آمیز انداز میں اس سے پیش ہی کیوں آتے ہو، جس سے وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔" اس نے خبر لی۔

"میرا تو اسٹائل ہی یہی ہے۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے لاچاری سے کندھے اچکائے۔ "اسی انداز میں تو تم سے صدیوں سے پیش آرہا ہوں، تم پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم کو میں نے کون سی غلط فہمی کا شکار بنا دیا ہے۔" اس نے جیسے زبردست نکتہ پیش کیا تھا۔

"ہر کوئی میری طرح مضبوط اعصاب کا مالک نہیں ہوا کرتا۔" اس نے پیشانی پر آئے بال سائیڈ پر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کم عمر ہے، ناتجربہ کار ہے، عمر کی اس اسٹیج پر ہے جہاں ایک مسکراہٹ، اپنائیت آمیز لہجہ، ایک شائستہ لفظ، ایک بھرپور نگاہ خیال و خواب کی دنیا بدل دیا کرتی ہے، پھر تمہاری تو ہر ہر ادا ایسی ہے کہ زارا جیسی لڑکی کی ایک نہ چلنے دے۔"

"چلو اسی بہانے تم نے میری تعریف تو کی۔" وہ خوش ہو گیا۔ لیکن بہر حال اس کی مسلسل سرزنش اور غضبناک تیوروں سے ڈر کر کافی حد تک شائستگی اور تہذیب کے دائرے میں رہنے لگا۔ مگر کیا کیا جاتا کہ زارا پر کیوپڈ کا تیر بری طرح اپنا اثر دکھا چکا تھا۔

"نائلہ! ذرا اڑ کر پہنچو آفس۔ فوراً۔ ضروری اور ہر صورت۔" ایک دن اس نے دوپہر کے ٹائم اسے فون کیا، اور پھر کچھ کہے سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ لہجہ اور

الفاظ اتنے سنسنی خیز، بے تابی اور ہیجان لیے ہوئے تھے کہ اسے جاتے ہی بن پڑی تھی۔

"کیا ہوگیا۔ کون سا طوفان برپا ہوگیا۔؟"

وہ دل میں خدشے اور وسوسے لیے کچھ دیر بعد اس کے روبرو گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"نائلہ۔ نائلہ۔ نائلہ۔" وہ کرسی سے اٹھا اور مسرت و شادمانی اور سرخوشی کے عالم میں رقص کرنے کے انداز میں گھوم گیا۔

"جواد۔ جواد۔ تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے سیدھی طرح بات بتاؤ نہ۔"

"میں اس وقت اتنا خوش ہوں، اتنا خوش ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔" وہ شدتِ مسرت سے چور مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔

"پتا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کون سی ہستی آئی تھی۔ ملک رضا خان۔ جانتی ہو ناں، بزنس کی دنیا میں نہ صرف اس شہر بلکہ پورے پاکستان میں ان کا نام بڑا معتبر ہے۔ بیرونِ ملک سے پارٹیز ان کے آفس میں قطار باندھے کھڑی نظر آتی ہیں۔ میری درخواست پر وہ وقت نکال کر آئے۔ اور نائلہ —— میرے ساتھ انہوں نے اتنی عظیم بزنس ڈیلنگ کی جس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکو گی۔ اُف خدایا! اس معاہدے پر عمل درآمد کے بعد میری کمپنی دنوں میں تمام چھوٹے بڑے ناموں کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔ خدایا۔ نائلہ —— میرے خوابوں کی تعبیر عنقریب اب میرے سامنے ہو گی۔ میں اتنی جلدی یہ مقام پالوں گا یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔" منزل پا لینے کی خوشی سے اس کا رواں رواں کھل اٹھا تھا۔ نائلہ کو بھی دلی خوشی ہوئی تھی۔

"ملک صاحب کی کیا ڈیمانڈز تھیں۔؟" اس نے تفصیل جاننا چاہی۔

"ارے یار! وہ تو بادشاہ آدمی ہیں۔" جواد ان سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ "کہنے لگے اب ساتھ رہے گا تو خود بخود لین دین کا سلسلہ چل نکلے گا۔ میری بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے تمہاری محنت تمہاری صلاحیت نے مجھے متاثر کیا ہے اور میں نے جان لیا ہے کہ تم کو اب دے دی جائے تو ترقی

ہوئے جیب سے نکلو گے۔ ہاں فی الوقت تمہارے آفس کی ایک شے ہمیں پسند آئی ہے، تمہاری سیکرٹری۔ ہم نے کہا حضور دل و جان حاضر ہیں، آپ ایک سیکرٹری کی بات کرتے ہیں۔"

"کیا۔؟" نائلہ نے یکدم دہل کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی، وہ کہہ رہے تھے کچھ عرصے کے لیے اسے ہمارے ہاں بھیج دو۔ خدمت سیوا کے لیے۔ میں نے کہا بھلے تاعمر رکھیے، کبھی پلٹ کر نام نہیں لوں گا۔"

وہ یوں عام سے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے ملک صاحب نے ایک جیتی جاگتی لڑکی نہ مانگی ہو بلکہ کوئی سجاوٹی چیز پسند کر کے لے جانے کی طلب کی ہو۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے جواد۔" اس کی شریانوں میں خون اُبلنے لگا تھا۔

"ارے تو کیا ہوگیا۔ تم اتنی خفا کس بات پر ہو رہی ہو۔ زارا یہاں نہیں تو وہاں نوکری کرے گی۔ اسے جاب ہی تو چاہیے ناں۔ پھر وہاں ملک صاحب کے ہاں کے تو نچلے درجے کے ملازم بھی شہر کے بڑے بڑے سیٹھوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تم کیا معمولی چیز سمجھتی ہو انہیں۔ زارا کے تو نصیب کھل گئے ہیں۔"

"تم اچھی طرح جانتے ہو وہ کس قسم کی "نوکری" کروائیں گے اس سے۔" وہ دانت پیستے ہوئے خونخوار نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔ جواد پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ لاپروائی سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔

"ہماری جانے بلا۔ زارا ضرورت مند ہے جبھی ملک صاحب کے ہاں ملازمت دلوا دیں گے۔ وہ اگر چاہے گی تو کچھ عرصے بعد بے شک چھوڑ کر دوبارہ ہمیں جوائن کر لے۔"

"زارا کبھی بھی نہیں مانے گی۔"

"اسے منانا میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔" اس کے پاس جواب تیار تھا۔ اور پھر واقعی جانے اس نے کون سا فسوں پھونکا کہ وہ سچ مچ تیار ہوگئی۔

نائلہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس نے زارا سے بات کی، دبے دبے انداز میں اس کے ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیلے کا انجام کار سمجھا یا مگر اس کے دل و دماغ پر جو ذائقہ
کی محبت بھرے نیچے، حدت آمیز ہاتھوں کا لمس،
اور دلفریب مسکراہٹ کا خمار بول رہا تھا۔

"تو کیا ہوا میڈم! مجھے کمپنی کے مفاد کے لیے کچھ
عرصہ ملک صاحب کے ساتھ کام کرنا پڑے گا۔ کچھ ہی
عرصے کی تو بات ہے پھر دوبارہ آکر یہاں کا آفس
جوائن کر لوں گی۔ سر نے کہا ہے میری سیٹ اس وقت
تک خالی رہے گی۔"

وہ آفس چھوڑ کر چلی گئی۔ نائلہ سر پٹکتی رہ گئی۔

"تم نے اسے کیا کہا تھا۔ کس طرح بتایا تھا؟" وہ
بھنچے بھنچے ہونٹوں سمیت کڑے تیور لیے اسے گھور
رہی تھی۔

"میں نے کیا بتانا تھا۔" اس نے کندھے اچکائے
"بس تھوڑا سا اظہار محبت کیا۔ پھر بتایا کہ کمپنی کو اس
کڑے وقت میں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ
میری طرح کچھ عرصہ ملک صاحب کے ہاں ان کی مرضی
کے مطابق کام کرے۔ کچھ عرصے بعد میں اسے واپس
بلا لوں گا۔ اور اس کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں
گا۔ یار! ایسی لڑکیاں دو چار ڈائیلاگ کی تو مار ہوتی
ہیں۔ وہ میری محبت میں آمادہ ہو گئی۔ گو اسے خبر
نہیں تھی، وہاں اس سے کیا 'کام' لیا جائے گا۔"

وہ خود ہی اپنی اصطلاح پر محظوظ ہو کر ہنس
پڑا۔ "اب پتا چل چکا ہو گا۔ کل ملک صاحب کا فون
آیا تھا۔ کہہ رہے تھے تمہارا بھیجا ہوا "تحفہ" بہت
پسند آیا۔ کچھ عرصے کے بعد واپس بھیج دوں گا کہ یہ تمہاری
جدائی میں کچھ زیادہ ہی ہلکان ہے۔"

نائلہ کو لگا۔ اس کے جسم کا سارا خون دماغ اور
چہرے میں بھر گیا ہے، اس کے قدموں تلے جیسے کسی
نے انگارے بچھا دیے تھے۔ زخمی ناگن کی طرح تلملاتی
ہوئی آگے بڑھی اور ایک ساعت میں اس کے قریب
پہنچ کر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑنے لگی۔

"تم نہایت بے غیرت اور گھٹیا فطرت انسان ہو۔
تم نے اپنے مفاد کے لیے ایک معصوم لڑکی کو ایک
بھوکے بھیڑیے، ہوس پرست درندے کے حوالے
کر دیا۔ جواد احمد ڈوب مرو کہیں جا کر ذلیل انسان

اس نے دانت پیستے ہوئے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی
تھی۔ لہجہ شدت غیض سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"کمینے آوارہ فطرت انسان۔ تم نے یہ بھی نہ سوچا
کہ تمہاری بھی بیٹی ہے۔ آج کسی کی بیٹی کو اپنی شیطانی
چال میں پھنسا کر اپنی دولت اور شہرت کی بھینٹ
چڑھا رہے ہو، تو کل کو کوئی تمہارا چیلا تمہاری بیٹی......"

"نائلہ شاہ۔" اس نے غضب ناک انداز میں
دھاڑتے ہوئے جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا لیا۔
"آپ حد سے آگے بڑھ رہی ہیں۔"

"تم جانتے ہو حد حدود کو وحشی۔ درندے۔"
اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ "تم
اپنے مفاد کے لیے اس حد تک بھی گر سکتے ہو، میرے
تصور میں بھی نہیں تھا۔ مگر جواد احمد یاد رکھنا قدرت
تمہیں بخشے گی تو نہیں۔ دیکھ لینا ایسا بھیانک انجام
ہو گا تمہارا کہ تم موت مانگو گے اور وہ تمہیں نہیں
ملے گی۔ تم......"

"میرا جو بھی انجام ہو گا میں دیکھ لوں گا۔ یہ میری
دردِ سری ہے۔" اس نے تیزی سے بات کاٹ دی
تھی۔ اس کے تیور ہی ایک دم بدل گئے تھے۔ نائلہ
بے یقینی کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔

"آپ کو اس بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں
کرنی چاہیے۔ ٹھیک ہے اگر آپ میرے ساتھ
نہیں چل سکتیں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔
یوں بھی میں کب تک آپ کے اشاروں پر ناچتا رہوں
گا۔ بہت ہو گیا۔ مجھ سے اتنی پابندیاں برداشت نہیں
ہوتیں۔ آپ تو میری پوری شخصیت کو تباہ کرنے پر تل
گئی ہیں۔ اتنی دقیانوسی اور رجعت پسند سوچیں مسلط
کر رہی ہیں مجھ پر۔ ٹھیک ہے آپ کی نیکی آپ کے
ساتھ، میری بداعمالیاں میرے ساتھ۔ میں تو ایسا
ہی ہوں۔ ایسا ہی رہوں گا۔ اگر میرے ساتھ سے
آپ کی ریپوٹیشن خراب ہوتی ہے تو آپ خوشی مجھے
چھوڑ دیں۔ لیکن مجھے گالیاں دینے کا آپ کو کوئی
حق نہیں ہے۔"

"مجھے کوئی حق نہیں ہے۔" اس کے تنے ہوئے
اعصاب یک لخت ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ لہجے میں اضمحلال
تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پاتے

Areela PakistanPoint

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے جواد احمد۔ جہاں تک میرا کام تھا میں نے کر دیا۔ خدا گواہ ہے کہ قدم قدم پر تمہیں روشنی دکھائی۔ تمہیں حتی الوسع گڑھے میں گرنے سے بچایا لیکن اب جبکہ تم خود ہی روشنی کی طرف سے آنکھیں میچ لینے پر تل گئے ہو، خود کو ہر صورت ہولناک تصادم سے دوچار کرنے پر آمادہ نظر آتے ہو تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو تمہیں بہت مضبوط، کامیاب اور اعلا روایات کا حامل انسان بنانا چاہتی تھی۔ تمہیں ماسٹر پیس بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی تھی۔ مگر تم تو عام سے "انسان" بننے پر بھی آمادہ نہیں ہو۔ مجھے تم سے کیا مطلب یا غرض ہونا تھی۔ مجھے تم پر نبذ نہیں لگا کر سکون ملتا تھا۔ یہ تو انسانیت تھی۔ انسان دوستی تھی۔ مگر یاد رکھنا جواد احمد۔ نام جنس اور پیسے کے لیے لگائی گئی یہ آگ ایک دن تمہارے دامن کو ضرور جھلسائے گی۔ تم تک اس کی آنچ ضرور پہنچے گی مگر شاید اس وقت بہت دیر ہو چکی ہو۔ تمہاری یہ روش تمہیں اندر سے بہت تنہا کر دے گی۔ اس وقت تمہیں میں اور میری باتیں یاد آئیں گی۔ میں جا رہی ہوں اور اتنے عرصے تک میں نے جو نیکی کی اس کا صلہ میں تم سے نہیں اپنے رب سے طلب کروں گی۔" وہ نکل گئی تھی، رکی نہیں تھی۔

"ممی کے بچے! اتنی دیر سے آئے ہو، کب سے انتظار کر رہی تھی تمہارا۔"

گاڑی کا دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے زین نے برابر بیٹھے تیمور پر غصہ اتارا تھا۔

"بچے تو دیر سے ہی آتے ہیں ناں۔" وہ ہنس کر کالج گیٹ کے پاس کھڑی گاڑیوں کے درمیان راستہ تلاش کرنے کی غرض سے پیچھے مڑا تھا۔ تب ہی میڈم شاہ کی نظر اس پر پڑی۔ زین کو بیٹھتے تو دیکھ ہی چکی تھیں، پچیس چھبیس سالہ، بھوری چمک دار آنکھوں والا ہینڈسم سا مرد، نیلی جینز اور سفید شرٹ میں یقیناً آفت قسم کی چیز لگ رہا تھا۔ مگر جس چیز نے انہیں ساکت مجود ہو جانے پر مجبور کیا تھا وہ اس کا اکھٹا ہوا تھا اس چہرے اور اس کے بیک گراؤنڈ کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ شہر کے بنا... کا بگڑا ہوا "لاڈلا" سپوت تھا۔ نت نئی... سر کرنے کا شوقین، اس کے مزاج کی رنگینی کی... دور دور تک تھے۔

ٹرن بیک ہوتے ہوئے زین کی نظر اتفاقاً... کے آگے اپنی ریڈ سوزوکی کا دروازہ کھولے... میں تھامے تیمور کی سیاہ ٹویوٹا کرولا کی سمت... شاہ پر پڑ گئی۔ ایک لمحے کو اس کا رنگ اڑ گیا۔

"میڈم شاہ نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" اس نے... سے تیمور کی طرف دیکھا۔

"تو کیا ہوا۔؟" اس کے انداز میں کمال درجے کی لاپروائی تھی۔

"ویسے تو وہ بہت اچھی ہیں۔ بہت دوستانہ انداز میں بات کرتی ہیں۔ مگر ان سے ڈر بہت لگتا ہے۔ ہماری فرسٹ ایئر کی انگلش کی کلاسز وہ لیتی ہیں اور کالج کی ایڈمن انچارج بھی ہیں۔ بارعب شخصیت ہے ان کی۔ خو نیر لیکچرارز ان سے بات کرتے ہوئے اسٹوڈنٹس کی طرح ہی گھبراتی ہیں۔"

"چلو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو، خوبصورت سی۔ اپنے جیسی۔" اور زین کا نوخیز چہرہ گلال ہوتا گیا۔

بالآخر اس کی گاڑی پر شکوہ سے سیاہ آبنوسی گیٹ کے آگے جا رکی۔

"ارے یہ کیا۔ پاپا گھر پر ہیں اس وقت؟" پاپا کی پوٹھوہار کھڑی دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ اسی لمحے وہ ڈرائیور کے ہمراہ اندر سے نکل کر اپنی جیپ کی سمت بڑھتے نظر آئے۔ اس لمحے زین گاڑی سے اتر کر دوسری طرف آ کر قدرے جھک کر اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ جب پاپا کی نظر ادھر پڑی۔

"پھر شام کا کلب جانے کا پروگرام پکا ہے ناں۔"

"ہاں۔ بالکل۔" زین نے یقین دلایا۔

"ہیلو پاپا۔" تیمور کو وش کر کے وہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر ان کے قریب آئی تھی جو جیپ میں بیٹھتے بیٹھتے رک گئے تھے۔

"یہ کون تھے جن کے ساتھ آپ آئی تھیں۔ ان...

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی چبھتی نظریں اس پر تھیں۔ وہ اندر سے کچھ چور سی ہو گئی۔

"میرے دوست ہیں پاپا۔ تیمور۔"

اس نے دیکھا پاپا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات مترشح تھے۔

"پاپا کو بُرا کیوں لگا۔ پہلے بھی تو میرے میل کلاس فیلوز آتے رہتے ہیں گھر۔ میرے دوسرے بوائے فرینڈز ہیں جو پاپا کے دوستوں کے بیٹے ہیں۔ پاپا خود مجھے ان کے ساتھ ٹائم گزارنے اور انہیں کمپنی دینے کو کہا کرتے ہیں۔" وہ الجھن میں تھی۔

"کب سے ہے آپ کی دوستی ان سے؟" اُن کی آواز میں عجیب سی نامانوس سی سرد مہری تھی۔ وہ اندر سے خوف زدہ سی ہو گئی۔

"کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی ہے پاپا۔" اس نے سر جھکا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"تو پھر اسے ختم کر دیں۔" ان کے دھیمے انداز میں حتمی پن نمایاں تھا۔

"مگر کیوں پاپا۔؟" اس سے اپنے اندر بے ساختہ سوال چھپایا نہ گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑے اس کے جھکے سر کو دیکھتے رہے۔ پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

"دوستی اچھے لوگوں سے کی جاتی ہے، اس شخص کی دوستی آپ کے لیے نقصان دہ ہو گی۔ امید ہے آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا۔"

اس نے لاچاری سے سر ہلا دیا۔ پھر پاپا جیپ کی سمت بڑھ گئے۔ وہ اندر آگئی۔ چینج کر کے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھنے تک وہ اسی اُدھیڑبن میں لگی رہی کہ آخر تیمور میں ایسی کیا چیز دیکھ لی پاپا نے جو اتنے خفا ہو رہے تھے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ شروع سے ہی پاپا نے ہمارے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دیا۔ جو ہمارا دل چاہا ہم نے کیا۔ ممی کی ایکسیڈنٹ میں ہلاکت کے بعد بھی کبھی ہم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی۔ پھر آج۔ مگر میں تیمور جیسے پیارے انسان کو تو نہیں چھوڑ سکتی۔ کتنی خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ کتنے دلکش انداز میں دیکھتا ہے میری طرف۔ اب تو پاپا مجھے کلب میں یا کسی بھی فنکشن میں اس کے ساتھ دیکھ کر خفا ہوں گے۔ گویا کھلم کھلا ملنے پر پابندی ہو گئی اب۔ ٹھیک ہے میں تیمور سے کہہ دوں گی۔ کالج سے سیدھے ہم گھومنے پھرنے چلے جایا کریں گے۔ دن کے وقت پاپا کہاں ملتے ہیں آرام سے ۔۔۔ تین چار بجے گھر آجایا کروں گی۔ اگر کبھی پاپا گھر ہوئے بھی تو کہہ دوں گی پریکٹیکل تھا آج۔

وہ اپنی دانست میں پوری پلاننگ کر کے مطمئن ہو گئی، بلکہ اس پر عمل درآمد بھی کر لیا، مگر تابکے۔ ایک شام جب وہ یونیفارم سمیت ایک اوپن ریسٹورنٹ میں تیمور کے ساتھ اسنیکس پر ہاتھ صاف کر رہی تھی، جب تیمور سے کسی بات پر خفا ہوتے ہوئے اس کی نظر سامنے کے بک اسٹال پر پڑی۔ اور پھر ایک سرد سی پھریری اس کے پورے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ ان کی نگاہ اس سے پہلے ادھر پڑ چکی تھی۔ اس کی جان پر بن گئی۔ خدایا میڈم شاہ نے دیکھ لیا ہے مجھے اس طرح یونیفارم میں۔ اب کیا ہو گا۔ اس دن بھی جب انہوں نے اسے تیمور کی سیلہ کرولا میں دیکھ لیا تھا تو اگلے دن پوچھ رہی تھیں۔

"وہ آپ کے کون تھے جن کے ساتھ آپ جا رہی تھیں۔"

"وہ میرے کزن ہوتے ہیں۔" کچھ اٹک اٹک کر اس نے بات بنا لی، جس پر وہ ایک گہری چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی تھیں۔

اس واقعے کے دو دن بعد کی بات تھی کہ جب وہ شام پونے چار بجے کے قریب گھر پہنچی تو پاپا غصے کے عالم میں لاؤنج میں ٹہلتے دکھائی دیے۔

"زین۔ ادھر آئیں ذرا۔" اس نے کترا کر نکل جانا چاہا تھا کہ پاپا کی پاٹ دار درشت آواز نے قدم روک لیے۔ وہ کپکپا سی گئی۔

"آپ کہاں سے آرہی ہیں اس وقت؟" ان کے لہجے میں سختی تھی۔

"وہ۔ پاپا۔ کالج سے۔" وہ کامیاب ایکٹریس نہیں تھی۔ پھر کم عمری میں جھوٹ، اس قسم کے واقعات کے متعلق جھوٹے بہانے گھڑنے میں مہارت بھی تو نہیں ہوتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بکواس کر رہی ہیں آپ۔" انہوں نے آگ بگولہ ہو کر بات کاٹ دی تھی۔

"یہ دیکھیے۔ یہ ہیں آپ کے کرتوت۔" انہوں نے ایک پرچہ اس کے سامنے لہرایا۔ "آپ کے کالج سے آپ کی میڈم کی طرف سے وارننگ لیٹر ایشو ہوا ہے۔ پڑھیں ذرا اسے آپ۔ اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی کالج یونیفارم میں کالج سے نکلنے کے بعد بازاروں، ہوٹلوں میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہے، اور یہ بات کالج کے وقار کے منافی ہے، اس قسم کی حرکات سے کالج کی ساکھ تباہ ہوتی ہے آپ اپنی بیٹی کے روزمرہ کے معمولات کی سمت سنجیدگی سے توجہ دیں۔"

وہ عرق عرق ہو گئی۔ مانو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی بات تھی۔

"آئندہ سے آپ کو ڈرائیور کالج پک اینڈ ڈراپ کیا کرے گا۔ اور آئندہ میں اس قسم کی بات برداشت نہیں کروں گا۔" پاپا کے لہجے میں شدید ناراضگی اور غیض تھا۔

مگر اسے عشق کا سرسام ہو چکا تھا۔ تیمور کی پُرجوش والہانہ محبت نے اُسے چالاکیاں سکھا دیں۔ اس دن وہ اس کے مشورے کے مطابق بیگ میں گھر یلو لباس تہہ کر کے لے آئی۔ صبح کے تین پیریڈ اٹینڈ کیے۔ پھر دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بیگ سمیت باتھ روم میں گھس گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو وہ کاٹن کے نیلے اور سرخ پرنٹ کے کپڑوں میں تھی، جبکہ کالج یونیفارم بیگ کے اندر منتقل ہو چکا تھا۔ اب بابا چوکیدار سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اِدھر اُدھر احتیاطی نگاہ دوڑا کر وہ گھڑی پر نظریں دوڑاتے ہوئے بالآخر کالج گیٹ سے باہر آ گئی، جہاں کچھ فاصلے پر حسبِ وعدہ تیمور اپنی سیاہ کرولا میں موجود تھا۔ یہاں سے انہوں نے ایک گیسٹ ہاؤس میں جانا تھا۔ جہاں تیمور کے ایک دوست نے ایک کمرہ لیا ہوا تھا۔ تیمور کی اس سے بات ہو چکی تھی۔ وہ اکیلا چھڑا چھانٹ تھا اور اس وقت آفس جا چکا تھا اپنے کام سے۔

اپنی طرف سے زین نے پوری احتیاط کی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ باتھ روم سے نکلتے وقت دو آنکھوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ میڈم شاہ راؤنڈ لیتے ہوئے اتفاقیہ اِدھر آ گئی تھیں۔

"یہ زین آج وِد آؤٹ یونیفارم آئی ہے۔" اسے گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ "ابھی صبح ہی تو میرے پیریڈ میں یہ یونیفارم سمیت کلاس میں تھی۔"

وہ کچھ کچھ کر تیزی سے گیٹ کی طرف لپکیں، اسی اثنا میں زین نکڑ پر کھڑی کرولا میں بیٹھ چکی تھی۔ میڈم شاہ بجلی کی سی تیزی سے اسٹاف روم کی طرف بڑھیں، جہاں ان کا پرس پڑا ہوا تھا۔ پرس سے گاڑی کی چابی لے کر اسی تیزی سے اپنی ریڈ سوزوکی میں آنا فاناً ان کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ مگر فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ بالآخر انہوں نے سیاہ کرولا کو گیسٹ ہاؤس کے پورچ میں کھڑا پا ہی لیا۔

"ایکسکیوز می۔ یہ مسٹر تیمور ملک کس کمرے میں ٹھہرے ہیں؟" انہوں نے استقبالیے پر موجود لڑکی سے دریافت کیا۔ پھر معلومات لے کر جلد ہی مطلوبہ نمبر کے دروازے پہ پہنچ کر بے تابانہ دستک دی۔ اندر سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

"چھوڑو مجھے ممی، یہ کیا کر رہے ہو، دیکھو مجھے چھوڑ دو۔ ممی۔ پاپا۔ اوہ گاڈ ہیلپ می۔"

دستک دینے والی انگلیوں میں اضطراری عجلت در آئی تھی۔ بالآخر دروازہ کھل گیا۔

"میڈم۔" ردی حالت میں بکھرے بالوں اور بے ترتیب لباس سمیت اپنے حواسوں سے بیگانہ زین آگے بڑھ کر ان کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

"تھینک گاڈ۔ میڈم۔ آپ آ گئیں۔ ورنہ یہ شخص تو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی یہ میرے ساتھ ایسا کرے گا۔"

"اگر سوچنے کی زحمت ہم لوگ کر لیں تو یہ دنیا بہشت ــــ نہ بن جائے۔" میڈم شاہ کے لہجے میں کاٹ دار تلخی تھی۔

زین ان کے قدموں میں جھک کر ہچکیاں لینے لگی۔

"میڈم! مجھے نہیں پتا تھا تیمور اس طرح کا نکلے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرتی تھی بہت اچھا لگتا
تھا۔ اس لیے بہت محبت ... مگر اس نے اتنی خراب حرکت کرنے کی
... مجھے ... ساتھ ... میں تو بہت بھروسا کرکے
کوشش کی ... آئی تھی۔
اس کے ساتھ ... ہی تو ڈوبتے ہیں۔" ان کے لہجے میں
بھروسے ... اتنا ہی پوروں کے سے انداز
... تھا۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے۔ ایک
... باہر نکل چکا تھا ... ریوالور کی گولی کھا کر قبر میں سونے سے بچ گئی
ایک زارا ... پاؤں میں گھنگھرو باندھنے پر مجبور نہیں
ہوئی۔ چلو اٹھو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ اپنا حلیہ
درست کرو۔ اپنے گھر فون کرکے بتانے کے بعد
میری کچھ باتیں سننا۔ میں تمہیں بتاؤں گی یہ سب کیسے
اور کس طرح ہوتا ہے۔ ہوا کرتا ہے۔"

اور پھر انہوں نے اسے اپنے چھوٹے سے مگر خوبصورت اور پرسکون گھر لے جا کر اس کی حالت سنبھل جانے کے بعد بڑے دوستانہ انداز میں ایسی وارداتوں کے اسرار و رموز اور انجام کار بتائے۔

"امین بھی تمہاری طرح ٹریپ ہوئی تھی۔ اور زارا نے بھی تمہاری طرح واقعے کی گہرائی میں جانے کے بجائے جذبات سے کام لیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔۔۔ وہ اپنے محبوب کی باتوں میں آکر نوکری چھوڑ کر ملک صاحب کے ہاں چلی گئی، اور جب کچھ عرصے بعد ملک صاحب نے اسے واپس بھیجا تو اس کے محبوب نے اسے اپنے پاس رکھنے میں ٹال مٹول شروع کردی۔ زارا اپنی عزت گنوا چکی تھی۔ گھر اور معاشرے میں اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ شاید وہ بھی موت کو گلے لگا لیتی کہ اس سے پہلے ہی ایک نائکہ کے ہتھے چڑھ گئی اور پھر گھنگھروؤں سے ناتا جوڑ لیا۔ یہ تو محض دو نام ہیں، سینکڑوں ہزاروں ایسے واقعات روز ہوتے ہیں اور ہوتے چلے آرہے ہیں، بس نام بدل جاتے ہیں۔ اب تم میری ہدایات غور سے سننا، پھر پابندی سے ان پر عمل کرنا۔ آئندہ سے اس شخص کا تصور بھی پاس مت پھٹکنے دینا۔ اپنے نفس پر کنٹرول کرو اور اس کے لیے پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھنا شروع کردو۔ اپنے آپ کو مثبت تعمیری سرگرمیوں میں مصروف رکھو۔ پڑھائی پر توجہ دو، میوزک، ایسے گلے، کلب کے فنکشنز، دوستوں کے ساتھ باہر جا کر ہنگامہ آرائی اور شور و غل کر کے تفریح کرنے کا پروگرام بند۔"

وہ اور بھی بہت سی باتیں بتاتی رہیں۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتی رہی کہ اب تو وہی اس کی نجات دہندہ تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹے۔ آپ بڑا چپ چپ رہنے لگی ہیں۔" پاپا کتنے ہی دنوں سے دیکھ رہے تھے وہ یکسر بدلتی جا رہی ہے۔ کالج سے آکے تھوڑی دیر آرام کے بعد اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو جاتی۔ کسی بوائے فرینڈ کا فون آتا تو اٹینڈ کرنے سے معذرت کر لیتی۔ شام کو بھی ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی نوٹس بناتی رہتی۔ پہلے کی طرح فلاں کے ہاں پارٹی اور ڈھمکاں کے ہاں فنکشن یا سیر و تفریح کرنے کے پروگرام جیسے ختم ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ پہلے شام کو اسے گھر میں بیٹھنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ اب آرام سے بیٹھی پڑھتی رہتی، یا کچن میں لوا کے ساتھ لگ جاتی۔ نمازوں کے اوقات میں مصلے پر نظر آتی۔ بہت ہی واضح تبدیلی آئی تھی اس کے طرزِ عمل میں۔ ایک شوخ الھڑ سولہ سترہ سالہ چلبلی سی لڑکی کا روپ بدل گیا تھا۔ اب وہاں نہایت متانت، سنجیدگی اور بردباری کے تاثرات نمایاں ہوتے جا رہے تھے تبھی وہ پوچھ بیٹھے تھے۔

"ایسی کوئی بات نہیں پاپا۔"

"کیا ہوا۔ زین بیٹے۔ کوئی بات ہوگئی ہے۔"

باپ کا ہمدردانہ لہجہ اسے ندامت کے دریا میں ڈبو گیا۔ جانے کیسے دل بھر آیا وہ پھوٹ پھوٹ کر ان سے لپٹ کر رونے لگی، اور روتے روتے بے اختیار ہی اعترافِ گناہ بھی کرتی چلی گئی۔ کیسے وہ انہیں بے وقوف بنا کر تیمور سے ملتی رہی۔ کس طرح اس دن تیمور اسے بہکا کر لے گیا اور اس کی عزت پہ حملہ کرنا چاہا۔ کس طرح میڈم شاہ کے روپ میں خدا نے اپنی مدد بھیجی، وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"پاپا! آپ صحیح کہتے تھے۔ کہ وہ شخص میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ آئی ایم ویری سوری،"

Aneela

پاپا جو میں نے آپ کی بات نہیں مانی، پاپا میڈم شاہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ وہ اتنی اچھی ہیں پاپا۔ ان کی باتوں میں ان کی شخصیت میں اتنا نکھار اور اتنی سچائی ہے پاپا! کہ بے اختیار ان کی کہی بات پر ایمان لے آنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔"

ناک منہ پونچھتے ہوئے اس نے پاپا کی گود سے سر اٹھا کر ایک لمحے کو ان کے چہرے پر دیکھا۔ وہاں تاریک سائے سے لہرا گئے تھے۔ اس کے گھنگھریالے بالوں کو سہلاتے ہاتھوں میں کپکپی سی ابھر گئی تھی۔ چہرا پل میں صدیوں کا بوڑھا اور ناتواں لگنے لگا تھا۔

"یہ سب ہو گیا اور تم نے مجھے خبر بھی نہیں کی۔"

ان کی آواز کسی اندھے کنویں سے ابھری تھی۔

"پاپا۔" زین کا لہجہ شدت غم سے بھر آ گیا۔ "آپ کو کبھی فرصت ہی نہیں ملی ہمارے معاملات میں دلچسپی لینے کی۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کر گئی۔ پاپا نظر چرا گئے کہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"پاپا! انہوں نے مجھے بہت کچھ بتایا۔ گو کہ کچھ باتیں ان کی مجھے اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئیں، مگر پاپا وہ بہت سبق آموز ہیں۔" وہ بتاتی چلی گئی، اور ان کے چہرے کے رنگ بدلتے چلے گئے۔ اپنی بات کے اختتام پر زین نے جب ان کی طرف دیکھا تو دہل کر رہ گئی۔

"پاپا۔ پاپا۔ آپ کو کیا ہوا۔" وہ ان کے وحشت زدہ سے پتھرائے وجود اور مضطرب چہرے کے اذیت ناک تاثرات پر متعجب اور ہراساں ہو کر انہیں جھنجھوڑنے لگی۔

"زین۔" وہ بولے تو ان کا لہجہ درد، تھکن اور شکستگی لیے ہوئے تھا۔ انداز میں ایسی اضطرار آمیز پژمردگی تھی کہ زین کو ہول آنے لگے۔

"زین! مجھے اپنی میڈم سے ملواؤ فی الفور۔"

"ٹھیک ہے پاپا! آپ کل مل لیجیے گا۔ ایسا کیجیے گا واپسی پر آپ مجھے پک کر لیجیے گا۔" زین دل ہی دل میں پاپا کی بے تابی اور بے قراری پر متحیر سی تھی۔

دیکھ رہی تھی۔

"پاپا! وہ رہیں میڈم شاہ۔" وہ دیکھتے ہی سوزوکی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔" اس نے چلا کر پاپا کو متوجہ کیا تھا۔ "آپ کے ہمراہ لے آؤں ادھر آپ سے ملوانے۔"

جب کافی دیر تک پاپا کی طرف سے جواب نہ آیا تو اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا، وہ بے دم بے خود ہو کر ایک ٹک میڈم شاہ کو تک رہے تھے۔ میڈم شاہ نے بھی ادھر دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کو واضح طور پر ان کے چہرے کا رنگ بدلا، پھر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے وہ اپنے مخصوص بے نیاز پُر اعتماد انداز میں اپنی ریڈ سوزوکی میں بیٹھ گئی تھیں۔

"نہیں بیٹے۔ چلو گھر چلتے ہیں۔" زین کے دوبارہ پوچھنے پر وہ طویل سانس لیتے ہوئے اسٹیئرنگ کی طرف متوجہ ہو گئے، ان کا چہرا صدیوں کے غبار سے اٹ گیا تھا۔ زین کچھ گومگو کے عالم میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"تو یہ تم ہو۔ تم ہی ہو سکتی تھیں، میرے وجود کا رواں رواں یہی گواہی دے رہا تھا۔" وہ خود سے مخاطب تھے۔ زین آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پاپا کو دیوانوں کی طرح خود سے باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔

"پہلے تو اتنے اصرار سے آئے اور اب ملے بھی نہیں۔" اُسے الجھن سی ہو رہی تھی۔ اس سارے قصے پہ۔

وہ اب کہاں ہے؟
جو پاس تھی تو قریب تر تھی۔
جو دور ہے تو عزیز تر ہے۔
وہ اب کہاں ہے؟
کہ جس کے واپس پلٹ کے آنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔
جسے نرسنے لبوں کی ساری دعائیں مل کر بلک بلک کر پکارتی ہیں۔
وہ جس کی تصویر بھیگی آنکھیں۔

پلک پلک سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں میں چھپا
انکار بھی ہے
وہ اب کہاں ہے؟
وہ اب کہاں ہے؟
بے چمکتی ہوئی دکانوں
ہجوم سے بھرے دو رویہ سڑکوں
پرانی گلیوں، نئے محلوں
مسافروں سے لدے پھندے سارے بس
اسٹاپوں
جدید مصروف شاہراہوں پر لمحہ لمحہ نئی نویلی
گزرتی کاروں کے بند شیشوں کے پیچھے ڈھونڈا
مگر بھٹکتی ہوئی نگاہوں نے اس کی صورت
کہیں نہ پائی۔
دکھی دلوں کا مداوا بن کر وہ آنے والی۔ کبھی
نہ آئی۔
وہ اب کہاں ہے۔
بچھڑ کے مجھ سے۔ وہ اب کہاں ہے؟

"تم نے صحیح کہا تھا نائلہ کہ نام، جنس اور پیسے کے لیے لگائی جانے والی یہ آگ میرے دامن تک ضرور پہنچے گی۔ مجھے ضرور جھلسائے گی۔ تم نے جو جو کچھ میرے بارے میں پیش گوئی کی تھی وہ سب حرف بحرف سچ نکلی۔ تم جیت گئیں نائلہ! بنا کسی ہتھیار کے بھی، اور میں شخصیت، شہرت اور شان و شوکت سب کے ہوتے ہوئے بھی ہار گیا ہوں۔" جواد احمد کے ویران مضمحل ملول چہرے پر پچھتاوے اور اذیت ناک وحشتیں رقم تھیں۔

دوسرے دن ہی وہ زین سے ایڈریس لے کر اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ دروازے پر پہنچا تو اتفاقاً نائلہ نے ہی ریسیو کیا تھا۔

"تشریف لائیے۔" اس کے لہجے میں کوئی اچنبھا اور استعجاب نہیں تھا۔ گویا وہ منتظر ہی تھی اس کی آمد کی۔

"آج نہیں کہو گی میری ریپوٹیشن کا سوال ہے۔" بغور اس کو دیکھنے کے بعد اس کے لبوں پر پھیکی سی پژمردہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

"نہیں سا۔" نائلہ کے لہجے میں مضبوطی تھی، اگرچہ کہ میں چہرہ شناس ہوں۔ جان سکتی ہوں کہ آج اس چہرے پر جو رنگ ہیں وہ ٹھوکر کھا کر سنبھلنے کا ارادہ باندھنے والے چہروں پر در آیا کرتے ہیں۔ آپ نہ بھی بولیں تو ندامت، پچھتاوے اور ملال کے یہ رنگ خود ان کہی داستانیں سنا دیں گے۔" تب وہ تھکے تھکے انداز میں اندر آ گیا تھا۔

"تیمور ملک۔ وہ۔ ملک رضا خان کا بیٹا تھا۔" جواد احمد کا چہرہ یکلخت تمتما سا گیا۔ نائلہ نے جتایا نہیں کہ میں نے بھی تو تمہیں کبھی یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ دوسروں کی بیٹیوں کو چارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک لحظے کو اپنی بیٹی کو تصور میں ضرور لانا۔ مگر اس وقت تم نے آنکھیں بند اور سماعتیں جامد کر لی تھیں۔ جتانے کا فائدہ بھی کیا ہوتا کہ وہ تو خود سراپا عبرت بنا ہوا تھا۔ اس قدر تھکا ہوا، ٹوٹا، نڈھال، دلگرفتہ اور ہارا ہوا کہ نائلہ کا مہربان، روادار دل اس کی پچھلی تمام تلخ باتوں اور الزامات کو فراموش کر گیا تھا۔

"نائلہ۔" جواد کے لہجے میں بڑی حسرت سی تھی۔ پھر وہ اٹھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سنبھلتی سمجھتی، وہ اس کے قریب قالین پہ دو زانو بیٹھا اور ہولے سے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیے۔

"جواد صاحب پلیز۔" وہ بے طرح بوکھلا گئی۔
"کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ سختی سے کہہ کر ساڑھی کا آنچل سنبھالتی اٹھ کر پرے ہو گئی تھی۔

"کچھ اعترافات کر لینے دیجیے مجھے نائلہ۔" وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح دھیرے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کا ہر ہر انداز ایسا تھا جیسے اس کا عالیشان وجود بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے والا ہو۔

"بڑے عرصے سے یہ بوجھ۔ یہ اسرار دل میں لیے پھر رہا ہوں۔ میری بلبلاتی انا کے گھوڑے نے، میری نخوت، میری ہوس گیری نے کبھی میرے دل کو موقع ہی نہیں دیا اس بات کا اعتراف کرنے میں کہ میرے لیے سکون کی چھایا، سکھ کی برکھا صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمہاری قربتوں میں، تمہاری باتوں کے سحر میں تمہارے وجود کی لطافتوں میں سے پھوٹا کرتی تھی۔ تم نے انجانے میں میرے اندر کینسر کی طرح جڑیں پھیلالی تھیں اور اب تمہاری یاد کا کینسر روز بروز میرے اندر پھیلتا بڑھتا جا رہا ہے۔"

"جواد احمد۔" اس کے سرسراتے مغلوب سے شکست خوردہ لہجے نے نائلہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑادی تھی۔

"گزرتے زمانے میں رہنے والے شائستگی کے موہوم سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔" اس کے لہجے میں نامعلوم سی کہر تھی۔

"شائستگی حال ہی کب ہے۔" جواد نے دلگرفتہ انداز میں آہ کھینچی۔ کتنی ہی دیر دونوں کے درمیان صرف سناٹا بولتا رہا۔ دریچوں سے شام کی ملگجی کرنیں جھانک رہی تھیں۔

"نائلہ۔" وہ اب کے بولا تو لہجے میں بہت سے امید کے جگنو جھلملا رہے تھے۔

"زندگی کی اس کڑی دھوپ میں تمہارا وجود ہمیشہ گھنے سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ ابر بن کر رہا ہے۔"

وہ کچھ ساعت کو رکا مگر نائلہ اس سے پہلے اس کے منہ سے نکلنے والے اگلے جملوں کا مفہوم پا چکی تھی۔ تیزی سے بولی۔

"جواد صاحب! بہت دیر ہو چکی ہے اب۔" پھر ایک دم اس کے انداز میں زندگی سے بھرپور بشاشت در آئی۔ "ابھی ابرار بھی آنے والے ہوں گے، اسکول کی چھٹی ہو چکی ہو گی۔"

"ابرار۔" جواد کے سوالیہ انداز میں بہت سے خدشے کلبلا رہے تھے۔

"جی، میرے شوہر۔ ابرار گیلانی۔" نائلہ کے انداز میں وہی مخصوص اعتماد اور رسانیت تھی۔ جواد احمد کی آنکھوں میں جلنے والے امید کے قمقمے یک لخت بجھ سے گئے۔

"کیا کرتے ہیں وہ؟" اسے اپنی آواز خود ہی بہت کھوکھلی اور بے جان سی لگنے لگی۔

"ایم ایس سی کمپیوٹر سائنسز میں کیا تھا۔ پہلے ایک فرم میں ملازمت کرتے تھے، بیوی اور ... سالہ بچی سارا بھی تھی۔ ایک شام تینوں موٹر سائیکل پر سیر و تفریح کے لیے نکلے ... ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بیوی کا موقع پر انتقال ... کی ٹانگوں پر چوٹیں آئیں۔ ڈاکٹرز ... کوشش کے باوجود بس ایک ٹانگ بچا سکے۔ سارا ... طور پر بیچ گئی تھی۔ انہوں نے ہمت ہارنے کے بجائے ملازمت سے جواب مل جانے کے بعد ایک جاننے والے کے ساتھ مل کر معذور ... کا تعلیمی ادارہ کھول لیا۔ جس میں معذوروں کو کمپیوٹر کی جدید تعلیم سے روشناس کرا کر انہیں نہ صرف اپنا بلکہ ملک و قوم کا بوجھ اٹھانے ... معاشرے کا فلاحی فرد بنانے میں معاونت ... گی۔ میں ٹریولنگ ایجنسی کی نوکری چھوڑ کر ... میں اس ادارے کا ایڈریس پڑھ کر وہاں گئی ... ابرار سے ملاقات ہوئی۔ ان کے عزم نے، ان کی سچائی، سادگی اور بہادری نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان کا پرپوزل آیا تو میں نے بلا جھجک ... بھیا اور امی کے انکار کے باوجود ہاں کہہ دی اور اللہ کا شکر ہے کہ میرا یہ فیصلہ درست اور "بارآور" ثابت ہوا۔ ابرار گیلانی نے مجھے ... سکھ دیا، اس طرح میری ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشی کہ میں مقاصد عظمیٰ کے حصول کے لیے ان کے مشورے کے بعد تدریسی شعبے سے وابستہ ہو گئی اس عہد کے ساتھ کہ قوم کی بیٹیوں کو نفس امارہ کی پرستش سے بالاتر ہو کر اعلیٰ اخلاقی سماجی اور معاشرتی روایات کا احترام و تقدس سکھاؤں گی کہ کل کوئی ایمن ریوالور کی تلاش میں اپنے بھائی کی الماریاں نہ کھنگالے۔ پھر کوئی ... زارا نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر گناہ کی ... سے ناتا جوڑنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ کوئی جواد ... کوئی تیمور ملک اپنی طلسماتی جھلک دکھا کر ان کے خوابوں کے کواڑ کھول کر بے باکی سے اندر نہ آنے پائے۔"

"السلام علیکم امی!" اسی لمحے کوئی ہیر دل ... دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔

"آؤ سارا۔ ان سے ملو۔ یہ میری اسٹوڈنٹ کے والدِ محترم ہیں۔" اور "جواد صاحب! یہ میری بیٹی ہے سارا۔"

جواد احمد نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سترہ اٹھارہ برس کی سنہری رنگت، نازک نقوش کی حامل اس دوشیزہ کے انداز میں بلا کی سنجیدگی، شائستگی، وقار اور اعتماد تھا۔ دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر لپٹا ہوا تھا۔ ماں کے کہنے پر اس نے بڑے بااخلاق انداز میں سلام کیا تھا۔

"کیا کرتے ہیں بیٹا آپ؟"

"جی میں نے ابھی ایف ایس سی پری میڈیکل کا ایگزام دیا ہے۔ رزلٹ کا ــــ انتظار ہے۔ ان دنوں بابا جان کے ساتھ ان کے اسکول جاتی ہوں ہیلپ کے لیے۔"

"ارے ہاں تمہارے بابا جان نہیں آئے۔؟"

نائلہ نے بیٹی سے استفسار کیا۔

"نکل ہی رہے تھے وہ بھی ہمدانی انکل کے ساتھ ابھی آتے ہی ہوں گے۔" پھر وہ جواد ــــ سے معذرت طلب کر کے ڈریس چینج کرنے کے لیے چلی گئی۔

"بہت اچھی تربیت کی ہے تم نے اپنے شوہر کی بیٹی کی۔"

اس کے تحسین آمیز طرزِ تخاطب پر نائلہ نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

"میں نے بہت عرصہ پہلے آپ سے کہا تھا کہ خلوص کا اظہار واسطوں کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ خدا بھی کہتا ہے کہ اگر مجھ سے محبت کا دعوا رکھتے ہو تو پھر میرے محبوب کی سنت پر عمل کرو۔ جو شخص آپ کے لیے اتنا مخلص ہو جس کے لیے آپ کے دل میں بہت ساری جگہ ہو، اس کی عزیز شے کو آپ کیوں نہ دل سے لگا کر رکھیں گے۔ سارا اچھی طرح باخبر ہے کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں۔ میں نے اسے اندھیرے میں نہیں رکھا لیکن میں یہ بات ایک سو ایک فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر میں سارا کی سگی ماں ہوتی تو بھی شاید وہ مجھ سے اتنا پیار نہ کرتی جتنا اب جان کر کرتی ہے۔ جواد احمد خلوص کی اپنی

ادارۂ خواتین ڈائجسٹ
کی جانب سے بہنوں کے لیے
خوشخبری
شگفتہ محمود کی مرتب کردہ
"خاتون کا دسترخوان"
کی کامیابی کے بعد
ایک اور کتاب
"کرن دسترخوان"
شائع ہو گئی ہے
اگر آپ اپنے دسترخوان کو نئے لذیذ اور عمدہ کھانوں سے سجانا چاہتی ہیں تو "کرن دسترخوان" آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
قیمت 120/- روپے
سول ایجنٹ:-
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی
فون 216361

WWW.PAKSOCIETY.COM

کشش، ایک مہک، ایک لمس ہوا کرتا ہے۔ یہ وہ جنس ہے جو نایاب ہے، دولت اور شہرت تو کسی نہ کسی طرح ہاتھ آ ہی جاتی ہے۔ مخلص اور انسانیت نواز دل رکھنے والے ساتھی نہیں ملتے۔ یا ملتے بھی ہیں تو آپ نگاہ جوہر شناس سے محروم ہونے کے سبب انہیں کھوج نہیں پاتے۔"

"تم نے صحیح کہا نائلہ۔" اس نے کرب انگیز سوچوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے شکستگی سے اپنا جملہ دہرایا۔" اور ان میں سے ایک میں ہوں۔" وہ خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہا تھا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔" پھر یک لخت وہ پلٹ کر دروازے کی سمت بڑھا تھا۔

"ابرار سے نہیں ملیں گے؟"

جواب میں اس نے ایک بے چین نگاہ اس پر ڈالی۔"میں اس خوش نصیب انسان کو اس مقدر کے سکندر کو دیکھ کر اپنی روح کی کرچی کرچی بکھرنے کا تماشا کیسے دیکھ پاؤں گا۔ کیسے کسک آمیز زخموں کو مزید شعلے دکھاؤں گا۔"

"نہیں اب چلوں گا۔" اس کا رخ بدستور دروازے کی طرف تھا پھر وہ دہلیز پہ پہنچ کر مڑا اور کچھ دیر۔ اس پُر تمکنت، سادہ و دلفریب چہرے کے نقوش نگاہوں کے ذریعے دل میں اتارنے کے بعد بولا۔

"اگر تم گوارا کر سکو تو میں اپنی بیٹی کو کبھی کبھار تمہاری دہلیز پر لے آیا کروں۔ میں چاہتا ہوں یہاں کی پاکیزہ فضا، تمہاری بیٹی کی محبت بھری دوستی تمہاری گھنے سائے کی طرح کی بے مثال شخصیت زین کو سہارا دے دے۔ اپنے باپ کی طرح زندگی کے سمندر میں بھٹکنے ڈولنے نہ دے۔ اس کا باپ بدقسمت تو اس گھنے سائے سے مستفید نہ ہو سکا، اس کی بیٹی یہ موقعہ نہ گنوائے کہ ایسے لمحات کبھی کبھار مقدر سے ہی اور مقدر والوں کو ہی ملا کرتے ہیں۔ جنہیں مٹھی میں بند کر کے محفوظ نہ کیا جائے تو بندہ ساری عمر کا روگی بن جاتا ہے۔ جنم جنم کا پیاسا رہتا ہے۔" وہ خود سے بیگانہ ہو رہا تھا۔

"تمہاری تمنا نے بارہا میرے دل میں سر ابھارا تھا، مگر دولت اور شہرت کا نشہ اس کو زبان تک لانے سے پہلے ہی ختم کر دیتا تھا تم ہی تم تھیں میرے اندر۔ یہ میں جان گیا تھا مگر مانتا نہیں تھا۔ اب مانتا ہوں مگر پا نہیں سکتا۔ تم نے ایسا تھا۔ ہیں۔ ہمدردی اور خلوص کے جذبے سے لبریز دل سے کر جو کچھ میرے لیے کیا۔ جس جس طرح سے مجھ جیسے آوارہ، بدفطرت، عیاش طبع رذیل انسان کو ضائع ہونے گنے سے بچاؤ کے لیے پوری ایمانداری سے تم ایڑی لڑاتی رہیں جس جس طرح مجھے سمیٹا بنایا اس کے جواب میں تمہیں وان کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے۔ میری یہ شان و شوکت، میرا سونے جیسا محل، ملکی اور غیر ملکی بینکوں میں پڑی بے شمار کرنسی، وہ سب کچھ اس کے آگے ردی ہے۔ میں کسی طرح بھی تو تلافی نہیں کر سکتا اس عظیم نقصان کی۔"

"تم تلافی کر سکتے ہو جواد احمد۔" نائلہ کے لہجے کی مضبوطی سے اسے چونکا گئی۔

"خود برباد ضرور ہو گئے، مگر اگلی نسلیں تو بچا سکتے ہو۔ فواد اور زین کی صورت میں تمہارے پاس تلافی کا بہترین سامان موجود ہے۔ انہیں معاشرے کے بھرپور ذمہ دار اور کار آمد شہری بنا کر اعلا روایات و اقدار کی ان کے اذہان میں منو دلا کر تم کسی حد تک اپنی کوتاہیوں کا ازالہ ضرور کر سکتے ہو۔"

"مگر ایک تلافی کیسے ہو گی۔ دل کے نقصان کی" وہ دل ہی دل میں کراہا تھا۔

"تمہارے بچوں کے لیے یہ دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ کہ اس گھر سے ہر ایک کو سکون، پاکیزگی اور شانتی ہی ملے گی۔" نائلہ نے مزید کہا تھا۔

جواد نے رک کر ایک نظر اس پر ڈالی۔ گہری، بے چین، مضطرب، بے قرار اور تڑپتی تڑپتی حسرت و ملال کے رنگوں میں ڈوبی نظر جس نے نائلہ کو چند ثانیوں تک جھنجلا کر رکھ دیا۔

"خدا حافظ۔" نائلہ کے لبوں کے کونے جانے کیوں مرتعش سے ہو گئے تھے۔ دل ایک ساعت کو بہت ہی عجیب و غریب سے سوز کے حصار میں آ گیا تھا۔ بے چارہ، ادھورا، تشنہ کام، بیمار دل شخص۔ اپنے کرتوتوں کے ہاتھوں کس کرب ناک انجام سے دوچار ہوا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا!
زندگی دھوپ تم گھنا سایا
آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا!
تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے!
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا
ہم جسے گنگنا نہیں سکتے
وقت نے ایسا گیت کیوں گایا
زندگی دھوپ تم گھنا سایا
زندگی دھوپ تم . . . . .
زندگی دھوپ

"پاپا۔ آپ ایک ہی گیت گھنٹوں سن سن کر بور نہیں ہوتے۔ کتنے عرصے سے یہی ایک گیت سنتے آ رہے ہیں۔" اس دیوانے مجنوں کی بیٹی ہر روز بڑی حیرت سے استفسار کرتی ہے، اور وہ حسب عادت مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیتا ہے۔

"بیٹے یہ بول میں ساری عمر سن کر بھی نہ تھکوں گا۔ کہ یہی تو حقیقت ہے۔ یہ ایک مصرعہ ہی تو پورے دیوان کی جان ہے۔"

بیٹی باپ کے پرسوز لہجے کے اسرار و رموز نہیں جان پاتی۔ بس پریشانی کے عالم میں اس کے پاس بیٹھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے کہتی ہے۔

"پاپا۔ آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے دن بہ دن۔ آپ نے تو جیسے دنیا ہی تیاگ دی ہے کتنے عرصے سے گھر سے نہیں نکلے۔ نہ آفس نہ کلب نہ سوشل گیدرنگ ہی اٹینڈ کی۔"

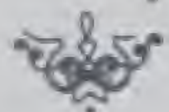
"میں بڑے مست حال میں ہوں۔" وہ جانے کس خمار میں کھویا کھویا جواب دیتا ہے۔ "یہ جو کینسر ہے ناں، جو کسی کے خلوص کی سرنج کے ذریعے میرے اندر سرایت کیا گیا تھا اس کی کسک اس کی چبھن مجھے بہت لذت دیتی ہے بیٹا۔"

"پاپا پلیز۔ اللہ نہ کرے۔" وہ خوفزدہ ہو کر باپ کو بازو تھام لیتی ہے۔ "آپ کو کینسر کب ہوا ہے فزیکلی، میڈیکلی بالکل فٹ ہیں۔"

"نہ میں رانجھا، نہ میں مجنوں
بکھرے بال اور چاک گریباں
آنکھ کا آنسو، غم کا پرتو!
جیتے جی یہ موت کی حالت
زخم جگر کا رستے رہنا
آنکھوں کا یوں ہر دم بہنا
جیون روگ مسلسل سہنا"

"پاپا۔ پاپا۔" بیٹی خود سے بیگانہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے باپ کی حالت پر از حد مجبور ہو کر اس کے بازو سے لگ جاتی ہے، وہ دھیرے دھیرے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے بالوں میں پھیرتا مخاطب ہوتا ہے۔

"کچھ بھی نہیں ہوا بیٹے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا ما سوائے اس کے کہ اک دھان پان سی لڑکی۔ میرے اعصاب پر کہسار بن کر سوار ہے، صدیوں سے، مگر میں اس تک رسائی نہیں پا سکتا۔ کہ میں دامن پر ہوں، وہ چوٹی پر ہے، بس اس کسک کے ساتھ جینا اک عذاب بن گیا ہے۔" اور پھر ہر شام ڈوبتا سورج اس دیوانے سے شخص کی آنکھوں سے امید اور طلب زندگی کے رہے سہے جگنو بھی سمیٹ کر لے جاتا ہے۔



بیوٹی بکس کا تیار کردہ
سوہنی ہیئر آئل
قیمت ۔/35 روپے
53 اورنگزیب مارکیٹ ایم اے جناح روڈ کراچی